NO ONE ILLEGAL

مہاجر

رضوان علی گھمن (جرمنی)

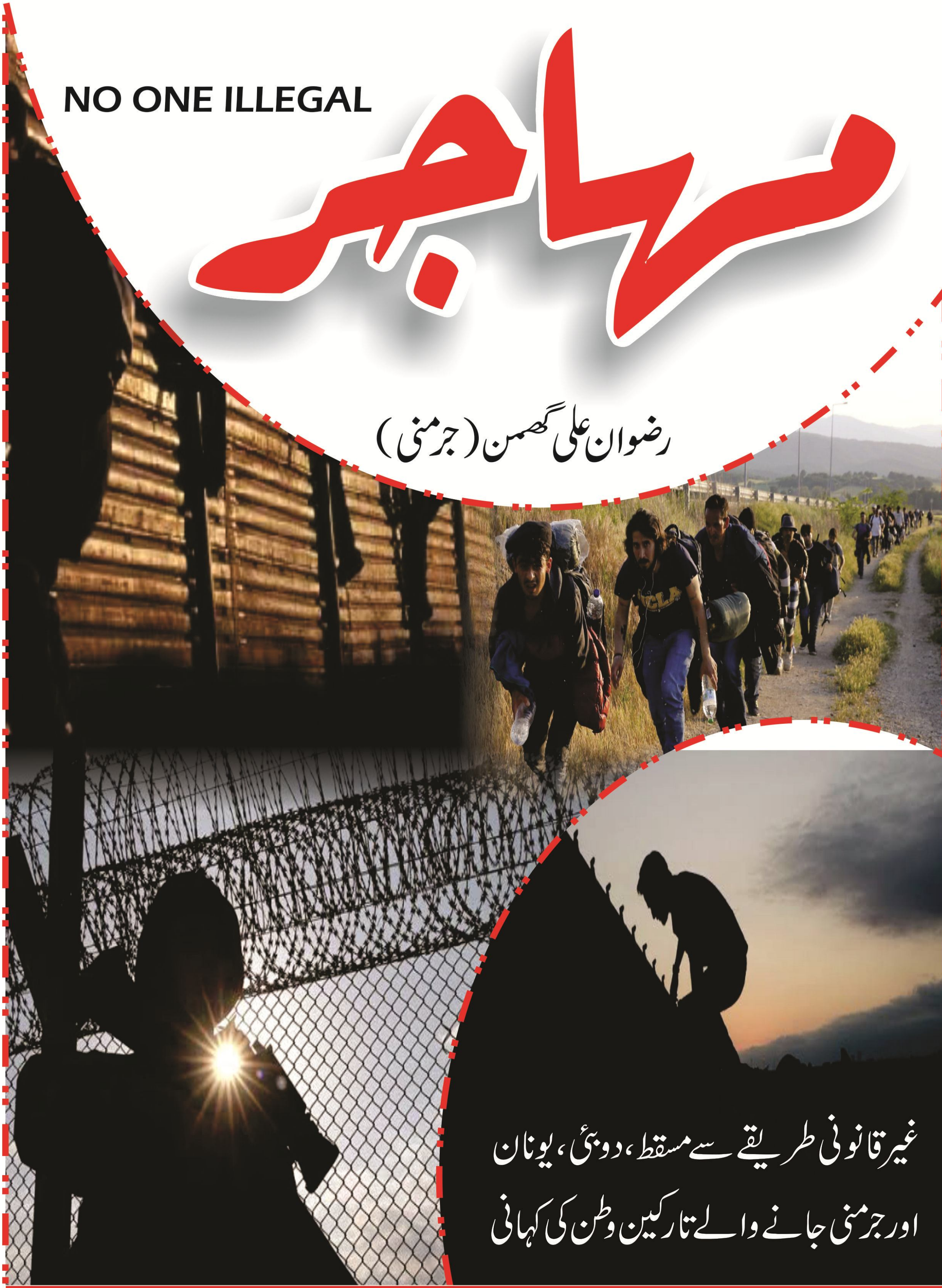

غیر قانونی طریقے سے مسقط، دوبئی، یونان
اور جرمنی جانے والے تارکین وطن کی کہانی

مہاجر

ایک پاکستانی نوجوان کی داستان

جو بغیر ویزے کے چوری چھپے امریکہ جانا چاہتا تھا

اردو ادب کی تاریخ میں پہلی بار

ایک منفرد انداز میں لکھا گیا سفرنامہ

قارئین کے لئے تحفۂ خاص

رضوان علی گھمن (جرمنی)

Whatsapp: *0049-152-11229099*
Facebook: *Rizwan Ali Ghuman*

میں اپنی اس کتاب کو ان سینکڑوں پاکستانی نوجوانوں کے

نام کرنا چاہتا ہوں جو غیر قانونی طور پر ایجنٹوں کے ذریعے

مسقط، دوبئ، یونان اور جرمنی جاتے ہوئے مارے گئے۔۔۔

ترکی اور یونان کے پہاڑوں اور سمندروں میں ڈوب کر مر

جانے والے نوجوانوں کے نام۔۔۔۔

ان ماؤں کے نام جن کی آنکھیں آج بھی اپنے نوجوان

بیٹوں کی راہیں دیکھ رہی ہیں۔۔۔

رضوان علی گھمن (جرمنی)

پیش لفظ

خدا نے اس پوری کائنات کو بنایا ہے۔ خدا کی بنائی ہوئی اس پوری کائنات میں صرف انسان ہی وہ چیز ہے جو منفرد ہے۔ جب آپ نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے ہیں تو آپ کو کائنات کی اس لامحدود وسعتوں میں خدا کی عظمت کی جھلک نظر آتی ہے۔ سورج چاند ستاروں اور بڑے بڑے ہیبت ناک سمندروں کے مقابلے میں انسان صرف پانچ یا چھ فٹ کا ہوتا ہے لیکن یہی انسان جب محبت کرنے پہ آتا ہے تو ہر حد سے گزر جاتا ہے۔

میری یہ کہانی بھی عشق کی راہوں میں فنا ہونے والے دو لوگوں کی کہانی ہے۔ محبت کی آگ میں جلنے والے دو معصوم جسم جب ملنے پر آتے ہیں تو اس آگ میں جلنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اور اسی آگ کی تپش آپ ناول پڑھتے ہوئے بھی محسوس کریں گے۔

جنوبی پنجاب کے ایک چھوٹے سے ریگستانی گاؤں کی کہانی جو ایک معصوم سے جسمانی تعلق کی خواہش سے شروع ہوئی اور ایک کامل عشق پر جا پہنچی۔ وہی عشق جس نے رانجھے کو بارہ سال بھینسیں چرانے پر مجبور کیا تھا۔

ایک منفرد انداز سے لکھا ہوا ناول جس کا ہر صفحہ آپ کو درد کے ایک نئے ذائقے سے روشناس کروائے گا۔ محبت کرنے والوں کے لئے اردو ادب میں ایک حسین اضافہ۔۔۔

میری اس کتاب کو مکمل کرنے میں میرے دوست ندیم نے میری جتنی مدد کی ہے اس کے لئے میں ان کا تہہ دل سے مشکور ہوں کیونکہ انہوں نے اس کتاب کو قارئین تک پہنچانے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اپنے کام سے محبت اور نئے لکھنے والوں کی رہنمائی کرنا، ان کی لکھی ہوئی تحریروں میں چھپی ہوئی غلطیوں کو نکال کر انہیں درست کرنا آپ ہی کا کمال ہے۔

یہ کتاب ناول ''دوسرا خدا'' کا دوسرا حصہ ہے۔ دوسرا خدا ایک مکمل ناول ہے جو ایک چھوٹی سی دس سالہ لڑکی ایمان کی کہانی ہے۔ جسے تیس ہزار کے عوض پچپاس سالہ بوڑھا خرید کر لایا تھا۔ ناول دوسرا خدا میری اور ایمان کی محبت کی کہانی ہے۔ دوسرا خدا ان وجوہات کو اجاگر کرتی ہے جن وجوہات کی بنا پر میں نے پاکستان چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ غربت سے اٹے پڑے اس معاشرے میں جب محبت ہار جاتی ہے تو پھر اس معاشرے سے بغاوت ہونے لگتی ہے۔

دوسرا خدارا جھستان کے صحراؤں میں پلنے والی محبت کی کہانی ہے اور یہ کتاب آپ کو پاکستان سے امریکہ تک کے سفر کی داستان سنائے گی۔ بغیر ویزے کے ایجنٹ آپ کو کیسے ایک ملک سے دوسرے ملک کا بارڈر کراس کرواتے ہیں اور کیسے پیدل اور آئل ٹینکروں میں بیٹھ کر چوری سفر کرواتے ہیں۔ ایران اور ترکی کے ایک ایک شہر اور گاؤں کی تفصیل جہاں سے میں گزرا ہوں۔

یہ ایک منفرد سفر نامہ بھی ہے۔ جسے پڑھنے میں یقینا آپ لذّت محسوس کریں گے اور سرد راتوں کی ٹھنڈک بھی محسوس ہوگی۔ وہی سردی جو میں نے ایران اور ترکی کے پہاڑوں میں پولیس اور بارڈر سیکورٹی فورسز سے چھپ کر گزاری ہیں۔ ان لمحات کی کہانی جب روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے کئی کئی دن انتظار کرنا پڑتا تھا۔

کتاب پسند آئے تو ضرور بتائیں اور اگر کتاب کا کوئی بھی پیراگراف برا لگے تو برائے مہربانی مجھے معاف کر دیجئے۔ یہ صرف میری ذاتی رائے ہے اور میں بحیثیت انسان غلطی بھی کر سکتا ہوں۔ مجھے اپنی قیمتی آراء سے ضرور نوازیں تا کہ میری تحریروں میں مزید نکھار پیدا ہو سکے۔ کتاب پسند آئے تو اپنے دوستوں اور جاننے والوں سے ضرور شیئر کریں۔ آپ کی محبت ہی میرا انعام ہے۔

آپ دوستوں کی محبتوں اور مفید مشوروں کا منتظر

رضوان علی گھمن (جرمنی)

کہتے ہیں محبت انسان کو بہت بہادر بنا دیتی ہے۔محبت انسان کو کتنا بہادر بناتی ہے اس کا اندازہ مجھے ایمان سے محبت کرنے کے بعد ہوا تھا۔ یہ محبت ہی تو تھی جو مجھے ایک دوسرے خدا کی تلاش میں گھر سے بے گھر کر رہی تھی۔ ایمان کے پیچھے پیچھے میں نے بھی بہاولپور شہر چھوڑ دیا تھا۔ میں کراچی آ گیا تھا اور ایمان بھی اسی شہر کے کسی کونے میں بیٹھی محبت کی آگ میں جل رہی تھی۔

ایمان مجھے اور میری محبت کو بہاولپور کے اس چھوٹے سے ریگستانی گاؤں میں اکیلا چھوڑ کر آ گئی۔ میری اور ایمان کی اس چھوٹی سے محبت کی مخالفت پورے گاؤں نے کی تھی لیکن یہ ہماری محبت کی ہی طاقت تھی کہ پورے گاؤں کو ہماری اس محبت کا یقین ہو گیا تھا اور میرا پورا گاؤں ایمان کو مجھ سے ملانے کی کوشش کرنے لگا۔

ہماری اس محبت کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ دور ہو گئی تھی لیکن جب محبوب ہی ساتھ چلنے سے انکار کر دے تو۔۔۔ میری اس محبت میں شہزادہ گلی کے اس لا متناہی سمندر کو کراس کر کے شہزادی کو لے جانے کے لئے آ گیا تھا۔سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہوتے ہوتے صرف ایک ایمان کے انکار نے مجھے آسمان سے زمین پر دے مارا تھا۔

تیس ہزار میں گجرات سے بک کر ہمارے گاؤں آنے والی اس معصوم سی ایمان کے پاؤں میں میرے باپ نے سر رکھ دیا تھا۔ پورے گاؤں کی پنچائیت کے سامنے میرے باپ نے ایمان کے پاؤں پکڑ لیے تھے لیکن اس معصوم دل والی معصوم ایمان کا دل زمانے کی ٹھوکروں نے پتھر سے زیادہ سخت کر دیا تھا۔ وہ ہمارے گاؤں کو چھوڑ کر کراچی چلی گئی تھی۔ایمان کو امریکہ بہت اچھا لگتا تھا۔

''راضی! تم امریکہ چلے جانا،غربت اور ذلت کی اس زندگی سے باہر نکلنے کی کوشش کرو۔ میں اپنی اس محبت کی قربانی تمہارے بہتر مستقبل کی خاطر دے رہی ہوں۔ راضی! جنت صرف امریکہ میں ہے۔ میں تو اس جنت کو نہیں دیکھ سکتی لیکن تم ضرور دیکھو گے، یہ میرا یقین ہے۔ایمان مجھے چھوڑ گئی لیکن میں ایمان کے اس خواب کو پورا کرنے کے لئے گھر سے نکل آیا تھا۔ دل میں ایک امید تھی کہ اگر امریکہ پہنچ گیا تو ایمان بھی مل جائے گی۔ ایمان مجھے اور میرے باپ دونوں کو معاف کر دے گی۔

''راضی! جتنی محبت میں تم سے کرتی ہوں اس کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ وہ مجھ سے اتنی ہی شدید محبت کرتی تھی اور اگر میں امریکہ پہنچ جاتا تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے ایک بار پھر میری محبت کو قبول کر لیتی۔ میں ایمان کو پانے کے لئے ایک بار امریکہ جانا چاہتا تھا۔

میری جیب میں اس وقت صرف دوسوروپے تھے اور کراچی جیسے بڑے شہر میں کوئی ایک بھی جاننے والا نہیں تھا۔ میں دو تین گھنٹے تک یونہی بے مقصد گھومتا رہا۔ عصر کی اذان کی آواز میرے کانوں میں پڑی تو میں خاموشی سے مسجد کی طرف چل پڑا۔ اذان ختم کر کے مئوذن مسجد کے ایک کونے میں جا کر سنتیں ادا کرنے لگ گیا اور میں مسجد میں ایک طرف لگی ہوئی ٹونٹیوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

انجان شہر کی اس انجان سی مسجد میں نجانے کیوں کچھ سکون سا مل رہا تھا۔ شاید خدا کو بھی میری اس حالتِ زار پر رحم آ رہا تھا۔ میں تھوڑی دیر تک ایسے ہی بیٹھا رہا اس کے بعد وضو کیا اور پانی سے ہی پیٹ بھرنے لگا۔ میرے پاس صرف دوسوروپے تھے اور ابھی تک کوئی کام چلنے کے آثار بھی نہیں تھے۔ اس لیے میں پیسے کسی مشکل وقت کے لئے بچا کر رکھنا چاہتا تھا۔

میں وضو کر کے مسجد کے اندر جا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد نمازی ایک ایک کر کے آنے لگے۔ اگلے پندرہ منٹ تک مسجد کے اندر بیس پچیس نمازی ہو گئے تھے۔ جماعت کا ٹائم ہوا تو امام صاحب نے جماعت کروائی اور دعا کے بعد سب لوگ واپس اپنے گھروں کو چلے گئے۔ میرے علاوہ ایک دو آدمی ہی مسجد میں رہ گئے تھے۔ چونکہ میں باہر گھومتے گھومتے تھک گیا تھا اس لیے اس مسجد کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میرا ذہن ایمان کے معصوم قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ ایمان کی میٹھی میٹھی ہنسی مجھے لوری کی طرح محسوس ہونے لگی اور میں ایسے ہی بیٹھے بیٹھے سو گیا۔

مغرب کی اذان کی آواز نے مجھے نیند سے بیدا کیا۔ امام مسجد بہت اچھا آدمی تھا۔ میرے چہرے پر پھیلی ہوئی بے شمار لکیروں نے اسے میرا مسافر ہونے کا بتا دیا تھا اور اس نے مجھے اٹھانا مناسب نہ سمجھا۔ اذان کی آواز سن کر میں خود ہی جاگ گیا اور جلدی جلدی وضو کر کے نماز میں شامل ہو گیا۔ نماز ختم کر کے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بہت آرام کر لیا تھا اور اب باہر نکل کر رات گزارنے کے لئے انتظام کرنے لگا۔

آج دن کو گھومتے گھومتے میں نے پرائمری سکول کی دیوار کے ساتھ برگد کا ایک بڑا سا پیڑ دیکھ لیا تھا۔ میں رات کو اسی درخت کے نیچے سو سکتا تھا۔ وہ بالکل ایک الگ تھلگ کونا تھا اور رات کو ادھر لوگوں کی بالکل بھی آمد نہیں ہوتی تھی۔ رات نکل جاتی تو صبح کو پھر سے کام کی تلاش میں نکل جاتا۔ مسجد سے باہر نکل کر میں نے جوتے پہنے اور ایک بار پھر کراچی کی گلیوں میں گھومنے لگا۔ رات کو اس وقت دکانیں اور ریستوران ہی کھلے ہوئے تھے۔ میں راستے

میں آنے والی ہر دکان اور ریستوران سے کام پوچھ رہا تھا۔

یہ 2006ء کا زمانہ تھا۔ اس وقت کراچی میں کام آسانی سے مل جاتا تھا۔ چونکہ میں کراچی میں نیا تھا اس لئے مجھے یہاں پر کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ ملک میں نئی نئی دہشت گردی کی لہر آئی تھی اور کوئی بھی نئے لڑکے پر اعتبار نہیں کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے ہر جگہ سے انکار ہی سننے کو مل رہا تھا۔ میں مسکرا کر ان کے چہرے کی طرف دیکھتا اور اگلی دکان کی طرف چل پڑتا۔

ابھی تو عشق کی راہوں میں فنا ہونے کا آغاز ہو رہا تھا۔ جتنا گہرا ہوتا ہے اتنے بڑے ہی خواب ہوتے ہیں۔ ایمان جیسے محبوب کے لئے تو میں دنیا کی ہر آسائش بھی ٹھکرا دیتا۔ یہ تو پھر دنیا کا ایک چھوٹا سا امتحان تھا۔ عشاء کی نماز میں نے اسی مسجد میں جا کر ادا کی اور اگلے دو گھنٹے مزید کام کی تلاش کر کے واپس اسی برگد کے پیڑ کے پاس چلا گیا۔ میں نے درخت کے نیچے ایک طرف ٹہنیوں کی مدد سے جگہ صاف کی اور ننگے فرش پر سر کے نیچے بازو رکھ کر لیٹ گیا۔

میں نے کل شام کو گاؤں سے چلتے وقت کھانا کھایا تھا۔ پوری رات سفر کر کے میں آج دن کو کراچی پہنچا تھا۔ بہاولپور سے لے کر ابھی تک پچھلے ستائیس اٹھائیس گھنٹوں میں خالی پیٹ بھاگ رہا تھا۔ محبت اتنی آسانی سے کہاں ملتی ہے اور جو آسانی سے مل جائے وہ محبت نہیں ہوتی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کیں تو ایمان چپکے سے میرے خیالوں میں چلی آئی۔

''ایمان!'' میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے نرم گالوں پہ رکھ دیا۔

''ایمان! تم تو نصیب والی تھی کہ تجھے 30 ہزار میں خریدا گیا تھا لیکن تیرا یہ راضی تو مفت میں بک رہا ہے لیکن پھر بھی اس راضی کی قسمت میں بکنا ہی نہیں لکھا۔ تیری اس محبت نے راضی کو اتنا بے مول کر دیا ہے کہ آج کوئی مفت میں بھی نہیں خرید رہا۔'' ایمان نے میرے بالوں کو آہستگی سے سہلایا اور میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

اگلے تین دن تک میں نے اسٹیشن کے آس پاس کی ساری کالونیوں میں کام کا پتہ کیا لیکن پھر بھی کام نہیں مل سکا۔ برگد کے درخت کے نیچے سوتے سوتے مٹی سے میرے کپڑے زیادہ گندے ہو گئے تو میں نے مسجد میں جانا بند کر دیا۔ کیونکہ کپڑوں سے بدبو آنے لگی تھی اور میں باقی نمازیوں کی نماز خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک بار پولیس والے شک کی بنیاد پر پکڑ کر لے گئے۔ کچھ گھنٹوں کے لئے تھانے میں بند رکھا، تھوڑا تشدد کیا اور پھر میری جیب میں

موجود دوسو روپیہ نکال کر مجھے تھانے سے باہر پھینک دیا۔

میں تھانے اور پولیس کی مار کی ذلت برداشت کر سکتا تھا لیکن دوسو روپے کا نقصان بہت بڑا تھا۔ میں تھانے سے باہر نکل کر اسی تھانے کی بیرونی دیوار کے ساتھ بیٹھ گیا۔ تھانیدار شام کو ڈیوٹی سے فارغ ہو کر گھر جانے کے لئے باہر نکلا تو اس کی نظر مجھ پر پڑھ گئی اور اس نے مجھے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ میں خاموشی سے اٹھ کر اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ مٹی سے اٹے ہوئے کپڑے، پولیس والوں کے تھپڑوں اور گھونسوں کی وجہ سے میرے چہرے اور جسم سے خون نکل کر میرے کپڑوں پر جم گیا تھا۔

''نام کیا ہے تمہارا لڑکے! اور کہاں سے آئے ہو؟'' تھانیدار نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''راضی نام ہے صاحب! بہاولپور سے آیا ہوں کام کی تلاش میں۔'' میں نے زمین پر لکیریں بناتے ہوئے جواب دیا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ یہ پولیس تھانہ ہے جس کی دیوار کے پاس بیٹھے ہوئے ہو؟'' انسپکٹر ابھی تک مجھے گھور رہا تھا۔ شاید وہ تھپڑ مارنا چاہتا تھا لیکن میرے گندے کپڑوں اور حلیے کی وجہ سے اپنے ہاتھ گندے نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''صاحب! میرے دوسو روپے آپ کے پولیس والوں نے چھین لیے ہیں۔ غریب آدمی ہوں، کام بھی نہیں ہے۔ ان دوسو روپے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ کی مہربانی ہے میرے پیسے واپس دلا دو۔'' میں نے مدد طلب لہجے میں کہا۔

''چٹاخ۔۔۔'' انسپکٹر نے ایک زوردار تھپڑ میرے چہرے پر رسید کیا تو میں دھڑام سے زمین پر گر گیا۔ میرا ایک ہونٹ پھٹ گیا اور اس سے خون رس رس کر زمین پر گرنے لگا۔

''ابھی دو منٹ کے اندر اندر اپنی شکل گم کرو! اگر اس تھانے کے آس پاس بھی نظر آئے تو بیٹا ایسا ایسا کیس لگاؤں گا کہ ساری زندگی سورج کی شکل دیکھنے کو بھی ترس جاؤ گے۔ دوسو روپے کو رو رہے ہو، دو لاکھ بھی لگا دو گے پھر بھی جان نہیں چھوٹے گی۔ ابھی ادھر سے کلٹی مارو اور دوبارہ ادھر نظر مت آنا۔'' انسپکٹر نے ایک اور تھپڑ مار دیا لیکن چونکہ اب میں سنبھل گیا تھا اس لیے زمین پر گرنے سے بچ گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔

''صاحب! اس پستول میں گولیاں ہیں؟'' میں نے انسپکٹر کے پستول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو اس

نے پستول کو ہولڈر سے نکال کر ہاتھ میں پکڑا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

''سر! اس پستول کو ادھر میرے ماتھے پر رکھ کر چلا دو! مر جاؤں گا لیکن اپنے پیسوں کے بغیر نہیں جاؤں گا۔ غریب آدمی ہوں مہربانی کرو یا مار دو، موت سے نہیں ڈرتا۔'' میں نے اپنے ماتھے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا تو وہ حیرانگی سے مجھے گھورنے لگا۔

''رحیم! یہ لڑکا کل صبح مجھے ادھر نظر نہیں آنا چاہیے۔'' انسپکٹر نے کانسٹیبل کو کہا اور گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔

''ہاں بیٹا! کیا پروگرام ہے؟ ادھر سے جاتے ہو یا ہماری مہمان نوازی کا مزا لینا ہے؟'' کانسٹیبل نے مجھے گریبان سے پکڑتے ہوئے کہا۔

''سر! غریب آدمی ہوں، ان دو سو روپے کے علاوہ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے صرف میرے پیسے واپس چاہیے۔'' میں نے اپنے ہاتھوں کو جوڑتے ہوئے کہا لیکن میری اس التجا کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

شاید پولیس کے محکمے میں رہ رہ کر وہ لوگ بے حس ہو گئے تھے۔ وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے اندر تھانے میں لے گیا اور لے جا کر لاک اپ میں بند کر دیا۔ آدھے گھنٹے بعد ہی لاک اپ کے اندر دو لمبے تڑنگے پولیس والے گھس آئے۔ انہوں نے میری قمیض اتروائی اور میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال کر مجھے الٹا لٹا دیا۔ ایک پولیس والے نے میری ٹانگیں پکڑیں اور دوسرے پولیس والے نے ایک بیلٹ سے مجھے مارنا شروع کر دیا۔ میں نے سختی سے اپنے منہ کو بند کر لیا۔

وہ پولیس والا دس پندرہ منٹ تک لگاتار میری پیٹھ پر مارتا رہا لیکن میں اپنی جگہ پر جما رہا۔ ٹانگیں پکڑنے والے پولیس والے نے مجھے حرکت سے روکنے کے لئے ٹانگیں پکڑی ہوئی تھیں مگر میں خود ہی اپنی جگہ پر جم کر لیٹا ہوا تھا تو اس کا کوئی کام نہیں رہا۔ وہ خاموشی سے ایک طرف ہو کر مجھے مار کھاتے ہوئے دیکھنے لگا۔

''بس کر و یار! اس پر تو کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا ہے۔ اگر یہ ادھر ہی مر گیا تو اپنے انسپکٹر صاحب بھی ہم کو انکوائری سے نہیں بچائیں گے۔'' ٹانگیں پکڑنے والے پولیس والے نے دوسرے کے ہاتھ سے بیلٹ لے لیا۔ دوسرا پولیس والا مارتے مارتے تھک گیا تھا اور اب زور زور سے ہانپ رہا تھا۔

''ہاں گلو دادا! کوئی بہت ہی خرانٹ بندہ معلوم ہوتا ہے۔'' اس نے میرے ہاتھ سے ہتھکڑی کھولتے ہوئے

کہا۔

''راضی نام ہے جی! غریب آدمی ہوں کام کی تلاش میں کراچی آیا تھا۔ آپ لوگوں نے مجھ سے میرے پیسے بھی چھین لیے ہیں۔'' میں نے قمیض پہنتے ہوئے کہا۔

''اوئے قمیض مت پہنو! تمہاری پوری کمر خون سے تر ہے۔ قمیض خون سے خراب ہو جائے گی۔'' گلو دادا نے مجھے قمیض پہننے سے منع کیا۔

''جناب! یہ پہلے کونسی صاف ہے، کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔ اب گندہ رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔ اگر اور مارنا چاہتے ہو تو مار لو۔'' میں نے گلو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں! ایک منٹ ٹھہرو میں زخم صاف کرنے کے لئے کوئی کپڑا لا دیتا ہوں۔ کمر صاف کر کے پہن لینا۔'' وہ لاک اپ سے باہر گیا۔

پانچ منٹ بعد ہی وہ ایک کپڑا، اسپرٹ کی بوتل اور پانی لے کر آ گیا۔ اس نے سب سے پہلے اسپرٹ سے میرے زخموں کو دھویا۔ کھلے زخم پر سپرٹ تیزاب کی طرح کام کرتا ہے۔ میں نے ہلکی سی بھی حرکت نہ کی تو وہ حیران رہ گیا۔

''راضی بیٹا! کہیں محبت کی چوٹ تو نہیں کھائے بیٹھے ہو؟'' اس نے مجھے قمیض پکڑاتے ہوئے کہا تو میں نے خاموشی سے قمیض لے کر پہن لی۔

''یار! ہمارے انسپکٹر صاحب نے تمہیں یہاں سے بھگانے کا کہا ہے۔ ہماری مجبوری کو سمجھو ہم تم پر مزید تشدد نہیں کر سکتے۔ مہربانی کرو اور خاموشی سے چلے جاؤ۔ لگتا ہے محبت کی کوئی بہت گہری چوٹ کھائے بیٹھے ہو۔ چلے جاؤ یار!'' اس قدرے بوڑھے ہوتے ہوئے گلو نامی پولیس والے نے میرے ہاتھ کو پکڑتے ہوئے کہا۔ اس کا پورا نام غلام محمد تھا لیکن سارے تھانے والے اسے گلو کہہ کر ہی پکارتے تھے۔

''چاچا! زندگی ہو گئی ہے دھکے کھاتے ہوئے، دو کروڑ کے اس آبادی والے شہر میں کوئی بھی جاننے والا نہیں ہے۔ پچھلے چار دن سے کھانے کا ایک لقمہ بھی پیٹ کے اندر نہیں گیا ہے۔ غریب آدمی ضرور ہوں لیکن مانگنے والا نہیں ہوں۔ دو سو روپیہ جیب میں تھا لیکن اس سے کھانا نہیں خرید کر کھا رہا تھا۔ آپ اگر وہ بھی چھین لو گے تو کدھر جاؤں گا؟

مرنے سے ڈر نہیں لگتا، موت میرے مقدر میں خدا نے لکھی ہی نہیں ہے۔ میرا دوسو روپیہ دے دو تو میں چلا جاؤں گا۔'' میری نظریں ابھی بھی زمین کو گھور رہی تھیں۔

چاچا گلو کچھ دیر تک میرے چہرے کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اپنی جیب سے دوسو روپے نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔

''سوری بیٹا! جو میں نے تم پر ہاتھ اٹھایا۔ انجانے میں غلطی ہوگئی، مجھے معاف کر دینا اور میرے لیے دعا کرنا۔ وہ تمہاری دعائیں ضرور قبول کرتا ہوگا۔''

''چاچا! میں کوئی ولی نہیں ہوں اور نہ ہی خدا میری دعائیں قبول کرتا ہے۔ میں نے تو اس سے کچھ بھی نہیں مانگا تھا۔ صرف ایک خواہش، ایک چھوٹی سی اپنی جنت، اس نے تو وہ بھی نہیں دی۔ نہیں چاچا! وہ میری دعائیں قبول نہیں کرتا۔ وہ تو اس کی دعائیں بھی قبول نہیں کرتا۔ سوری چاچا!'' میں نے اس کے ہاتھ سے دوسو روپیہ لیا اور خاموشی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''راضی بیٹا! کام کرو گے؟ تھوڑا گندہ کام ہے لیکن بہرحال کام ہے۔ مہینے کے پانچ ہزار مل جائیں گے اور گھر اور کھانا بھی وہ لوگ دے دیں گے۔'' گلو چاچا نے مجھے پیچھے سے آواز دی تو میں وہیں رک گیا اور پیچھے پلٹ کر آ گیا۔

''جی چاچا! کام ہی تو کرنے کے لئے آیا ہوں۔ کیسا بھی ہو کام کروں گا۔ صرف ایک مہینہ کام کروں گا۔ اس کے بعد میں نے آگے چلے جانا ہے۔'' میں ان دونوں پولیس والوں کے پاس آ گیا تھا۔

''آگے کدھر جا رہے ہو؟ کراچی سے آگے بھی کوئی شہر ہے؟'' پہلے والے پولیس والے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جی! میں امریکہ جا رہا ہوں۔ 5 ہزار مل جائیں گے تو ایران تک جانے کا کرایہ بن جائے گا۔ آگے ایران جا کر کام کروں تو آگے کا بھی زادِراہ بن جائے گا۔'' میں نے نارمل لہجے میں کہا تو اب کی بار پورا تھانہ ہی مسکرانے لگا۔

''بیٹا 5 ہزار میں کوئی آپ کو تربت سے آگے بھی نہیں جانے دے گا اور آپ ایران جانے کی بات کر رہے ہو۔ رہنے دو امریکہ کے خواب مت دیکھو! بلوچستان کے حالات اکبر بگٹی کے مرنے کی وجہ سے بہت خراب ہو گئے

ہیں۔''

چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف نے ایک سال پہلے بلوچستان میں آپریشن کر کے اکبر بگٹی کو مار دیا تھا۔اس وجہ سے بلوچستان کے حالات بہت خراب ہو گئے تھے۔مشرف کے اس آپریشن کی وجہ سے بلوچستان کی علیحدگی پسند تحریکیں بالکل ختم ہو گئیں لیکن بلوچ عوام غصے سے بھرے ہوئے تھے۔انسانی جان کی قیمت بالکل ختم ہو گئی تھی اور خاص طور پر پنجابیوں کو تو وہ دیکھتے ہی گولی مار دیتے تھے۔

''کوئی بات نہیں چاچا! اگر میری قسمت میں موت بلوچستان کے صحراؤں میں لکھی ہے تو پھر وہیں مر جاؤں گا۔میری اس بے چین ہوتی ہوئی روح کو کچھ تو سکون مل جائے گا۔'' میں ان پولیس والوں کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! تمہاری یہ باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں، اب کام کی بات کرتے ہیں۔۔۔اسٹیشن کے سامنے جو ٹائلٹ بنے ہوئے ہیں ادھر پیشاب کرنے کے دو روپے لیتے ہیں۔ ہر روز صبح پانچ بجے پانی کی گاڑی آتی ہے تم نے ان سے پانی لے کر ڈرموں میں بھرنا ہے اور پھر صبح 5 بجے سے رات 10 بجے تک ادھر ڈیوٹی دینی ہے۔ ہر جانے والے سے 2 روپے لینے ہیں اور لوٹا بھر کر پانی کا دینا ہے۔ٹائلٹ کو صاف کرنے کی ذمہ داری بھی تمہاری ہے۔ٹوٹل 4 ٹائلٹ ہیں۔کام مشکل ہے، ڈیوٹی بھی لمبی ہے اور کوئی چھٹی نہیں ہے۔دیکھ لو! اگر کر سکتے ہو۔'' چاچا گلو نے مجھے کام سمجھاتے ہوئے کہا۔

''مجھے منظور ہے چاچا! چھٹی کی مجھے ضرورت نہیں ہے اور کام اگر آپ دس بجے کے بعد بھی کہو گے تو بھی کروں گا۔'' سب پولیس والوں کو یقین تھا کہ میں انکار کر دوں گا لیکن میں نے ان سب کو حیران کر دیا۔

''دیکھ لو بیٹا! میری روزانہ اسٹیشن پر ڈیوٹی ہوتی ہے۔ٹائلٹ پر بیٹھا ہوا بوڑھا آدمی بہت اچھا ہے۔غریب آدمی ہے۔اس کا تمہاری عمر کا ایک ہی بیٹا ہے۔وہ بھی تمہاری طرح باہر جانا چاہتا ہے۔مسقط جانے کے لئے ایجنٹ ڈھونڈ رہا ہے۔تمہارا ایران تک کا ساتھ ہو جائے گا۔وہاں سے وہ اومان اور تم ترکی جا سکتے ہو۔'' اس بوڑھے پولیس والے نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''جی چاچا!'' میں نے سعادت مندی سے سر ہلایا تو اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔

''بیٹا مجھے تم ایک اچھے گھرانے کے لڑکے لگ رہے ہو۔ پتہ نہیں کون سی مجبوری نے تم کو ان انجان راستوں کا

مسافر بنا دیا ہے۔ بلوچستان کو کبھی بھی اکیلے کراس کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ بلوچستان کے حالات بہت خراب ہو چکے ہیں۔ کچھ بھی ہو، جیسی بھی مشکلیں آئیں بس زندہ رہنا۔ ایجنٹ زیادہ پیسے نہیں لیتا ہے۔ میرے خیال میں دس ہزار سے وہ تم کو ایران کا بارڈر کراس کروا دے گا۔ آگے ایران میں ویزے کے بغیر پرابلم تو ہو گی لیکن ادھر زندگی کی قیمت ہے۔''

رات میں نے ادھر تھانے میں ہی گزاری اور صبح صبح پانچ بجے وہ تھانیدار مجھے لے کر اسٹیشن پر بنے ہوئے ان ٹائلٹ روم کی جگہ پر لے گیا۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا ہوا تھا۔

''السلام وعلیکم بابا! یہ لڑکا لے کر آیا ہوں کام کے لئے۔۔۔ اچھے گھر کا لڑکا ہے محبت سے کام کرے گا۔ میں اس کی گارنٹی دیتا ہوں۔'' چاچا گلو نے اس ادھیڑ عمر آدمی کو سلام کیا تو وہ اٹھ کر اس سے ملنے لگا۔

''جی بیٹا! اگر آپ گانٹی دیتے ہو تو پھر یہ لڑکا ٹھیک ہی ہو گا۔ مجھے آپ پر اعتبار ہے۔''

''نام کیا ہے بیٹا آپ کا؟'' وہ آدمی اب مجھ سے مخاطب ہوا۔

''راضی، بہاولپور سے آیا ہوں۔'' میں نے مختصراً اپنا تعارف کروایا۔

''ٹھیک ہے راضی بیٹا! آج دن کو میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔ تم کام وغیرہ دیکھ لینا اور پھر کل سے تم نے اکیلے ہی کام کرنا ہے۔''

''جی اچھا!'' میں واش رومز کو بغور دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف قطار سے بنے ہوئے چار ٹائلٹ تھے۔ لوہے کی بہت باریک چادر سے ان کے عارضی دروازے بنے ہوئے تھے۔

اس زمانے میں ڈالڈا گھی 16 کلوگرام ٹین پیکنگ میں آتا تھا۔ گھروں میں زیادہ تر وہی ٹین استعمال ہوتے تھے۔ انتہائی باریک لوہے کی چادر سے بنا ہوا لیکن جب خالی ہو جاتا ہے تو وہ پانچ روپے کے حساب سے واپس ہو جاتا تھا۔ آج کل تو پلاسٹک کی کلو اور آدھ کلو کی پیکنگ آ گئی ہے لیکن اس زمانے میں یہ اتنی عام نہیں ہوئی تھی۔ کچھ لوگ سولہ کلوگرام والا ٹین ہی خریدتے تھے لیکن گاؤں کی دکانوں والے کھلا گھی بھی فروخت کرتے تھے۔

کچھ لوگ گھر سے کوئی برتن وغیرہ لے کر جاتے اور دکان دار اس برتن کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھتا اور

دوسرے پلڑے میں گندم ڈال کر برتن کا وزن برابر کرتا اور پھر مطلوبہ مقدار کا باٹ رکھ کر گھی تول کر دے دیتا۔ خالی ہونے والے ٹین کو لوہے کا کام کرنے والے سستے داموں لے جاتے اور پھر اس سے مختلف گھر میں استعمال ہونے والی چیزیں بنا کر بیچتے تھے۔ گھروں میں استعمال ہونے والی زیادہ تر چیزیں اسی سے بنتی تھیں۔ گندم صاف کرنے والے چھج، چھوٹے کپڑے رکھنے والے باکس، آٹا رکھنے والی پیٹی، گھر میں سادہ استعمال ہونے والے ایئر کولر کی باڈی بھی اسی ٹین کی چادر سے بنتی تھی۔

ٹائلٹ کے دروازے بھی اسی ٹین سے بنے ہوئے تھے۔ دروازوں کی چٹخنیاں لگانے کی زحمت ضرور کی گئی تھی لیکن زنگ نے ان چٹخنیوں کو اکھاڑ دیا تھا اور اب صرف ان کے نشان باقی رہ گئے تھے۔ باقی سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ ایک طرف پلاسٹک کے بڑے بڑے تین ڈرم رکھے ہوئے تھے۔ صبح کو پانی والی ٹینکی سے پانی لے کر انہیں ڈرموں میں سٹور ہوتا تھا اور پھر یہی پانی سارا دن استعمال ہوتا تھا۔

پانی کی کمی کراچی میں 2006ء میں بھی تھی اور ابھی گیارہ سال ہو گئے ہیں ابھی تک کراچی کے حالات ویسے کے ویسے ہی ہیں۔ ہمارے حکمران تو صرف سڑکیں اور پل بنانے پر لگے ہوئے ہیں۔ سسٹم کو ٹھیک کرنے کی ہمت کوئی نہیں کرتا۔ روڈ اور پل بنانے آسان ہیں۔ اپنی مرضی کی کمپنی کو ٹھیکہ دو اور ہر دو مہینے بعد ادھر کا ایک چکر لگاؤ اور آخر میں ایک بڑی سی تختی اپنے نام کی لگا دو اور ساری زندگی شور مچاتے رہو کہ یہ سڑک اور پل میں نے بنایا ہے۔

جیسے عورتوں کو شاپنگ کرنے کا شوق ہوتا ہے ایسے ہی ہمارے حکمرانوں کے پاس جب پیسے آتے ہیں تو ان کو سڑکوں اور پلو کی شاپنگ یاد آ جاتی ہے۔ سسٹم کو ٹھیک کوئی اور آ کر کرے گا۔ کون کراچی جیسے بڑے شہر کی چھوٹی چھوٹی گلیوں میں گھسے جو مچھیرے کے اس جال کی طرح لگتی ہیں جو کئی سالوں سے پڑا پڑا ابری طرح الجھ جاتا ہے اور پھر ان دھاگوں کو علیحدہ کرنا تقریباً ناممکن سا ہو جاتا ہے۔

اب کسی سر پھرے کا ہی انتظار ہے۔ ہمارے ملک کے سسٹم کو ٹھیک کرنے کے لئے واقعی کسی سر پھرے کی ہی ضرورت ہے۔ جو سڑکوں پلوں اور سرکاری ملازموں کی تنخواہوں بڑھانے کے علاوہ بھی کوئی کام کر لے۔ میں کدھر سیاست میں آ گیا۔ یہ تو میرا کام نہیں ہے۔ میں تو ایک غریب سا رائٹر ہوں۔ لکھنا میرا کام ہے اور مجھے اسی کام میں مزا آتا ہے۔ لوگوں کو محبت کرنا ہی سکھاتا ہوں۔ ہمیں وہاں کھڑے ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی جب پانی والی گاڑی آ گئی۔

''چلو بیٹا! یہ بالٹیاں پکڑلو ہم پانی بھر لیتے ہیں۔'' میرے مالک نے مجھے بالٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو میں نے بالٹیاں اٹھالیں۔گلو چاچا نے میرے مالک سے اجازت لی اور مجھے وہیں چھوڑ کر خود تھانے واپس چلا گیا۔

''ٹھیک ہے بابا! میں پانی بھرلوں گا،آپ بیٹھ جائیں۔ مجھے کام کا پتہ چل گیا ہے۔'' میں نے اپنے مالک سے کہاتو اس نے متشکر نظروں سے میری طرف دیکھااور واپس جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہاں لکڑی کا یک چھوٹا سا ٹیبل رکھا ہوا تھا۔جس کے ایک طرف ٹشو پیپر کا ایک ڈبہ اور دوسری طرف ایک کٹورے میں سکے رکھے ہوئے تھے۔گاہک زیادہ تر کاغذ کے نوٹ ہی دیتے تھے۔وہ نوٹ ہم جیب میں ڈال لیتے تھے اور سکے وغیرہ اسی کٹورے میں اکٹھے رکھتے تھے۔میز کی دوسری طرف دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔یہ میرا کراچی میں پہلا اور آخری کام تھا۔

پانی والی گاڑی بالکل ڈرموں کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی تھی لیکن ان کے پاس پلاسٹک کا پورٹ ایبل پائپ نہیں تھا۔جس سے وہ پانی ڈائریکٹ ڈرموں میں بھر دیتے۔اس زمانے میں یہ پائپ استعمال ہی نہیں ہوتا تھا۔ مجھے پاکستان گئے ہوئے گیارہ سال ہو گئے ہیں۔شاید اب یہ سہولت وہ استعمال کر رہے ہوں۔اس وقت تو میں پانی کی بالٹیاں ٹینکی کے نیچے رکھتا۔وہ ٹونٹی سے پانی بھرتے اور میں اس کو ڈرم میں خالی کر دیتا۔ میں نے پندرہ بیس منٹ میں تینوں ڈرم بھر دیئے تو ٹینکی والا پانی کے پیسے لے کر واپس چلا گیا۔

''آجاؤ بیٹا! ادھر آ کر بیٹھے جاؤ۔ادھر کوئی کام وغیرہ نہیں ہوتا ہے۔یہیں سارا دن بیٹھنے کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ گاہک زیادہ تر چھوٹا پیشاب ہی کرتے ہیں۔اس لیے زیادہ پانی بھی استعمال نہیں ہوتا اور ٹائلٹ بھی زیادہ گندے نہیں ہوتے۔کبھی کبھی پرابلم ہوجاتی ہے،تو بیٹا نفرت مت محسوس کرنا! کام کوئی بھی چھوٹا نہیں بلکہ کبھی کبھی انسان چھوٹا ہوجاتا ہے۔

''سنی مسلمان ہو یا شیعہ ہو؟'' بابا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''بابا! پتہ نہیں کونسا مسلمان ہوں لیکن شاید مسلمان ضرور ہوں۔اس خدا کو مانتا ضرور ہوں۔عبادت بھی کرتا ہوں لیکن اس سے مانگنا چھوڑ دیا ہے۔وہ دیتا نہیں ہے نا۔'' میری آنکھوں میں ہلکا سا پانی آ گیا۔

''بیٹا! اس خدا کوتو میں بھی جانتا ہوں اس کی عبادت بھی کرتا ہوں اور مانگتا بھی اسی سے ہوں لیکن میں عیسیٰ کا ماننے والا ہوں۔ میں عیسائی ہوں۔ ہمارے گھر کا کھانا کھالیا کروگے؟ میرے پاس پہلے عیسائی لڑکے ہی کام کرکے گئے ہیں۔تم اکیلے مسلمان لڑکے ہو۔شاید ہمارے ہاتھ کا کھانا نہ کھاؤ۔'' اس بوڑھے آدمی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں زمین کی طرف دیکھنے لگا۔

''بابا! جب بھوک لگتی ہےتو حلال اورحرام کی تمیز بھی ختم ہوجاتی ہے۔آپ تو پھر بھی حلال ہی کھلاؤ گے۔''

ہمارے ٹائلٹ پر پہلا گاہک چھ بجے کےقریب آیا۔ وہ کراچی سے حیدرآباد جارہا تھا۔نوجوان آدمی تھا اور کافی ہنس مکھ تھا۔اس کے بعدتقریباً آٹھ بجے تک اِکادُکا ہی گاہک آتے رہے۔آٹھ بجے کے بعدکام کارش ہوگیا اور پھر بارہ بجے تک مسلسل ایک دوایک دوگاہک آتے رہے۔

میرا مالک ہمیشہ آنے والے آدمیوں کوگاہک ہی کہتا تھااوران کی عزت کرتا تھا۔ ہمارا کام کوئی مستقل گاہکوں والاتونہیں تھااس لیےہمیں روایتی مسکراہٹ اورعزت دارانداز اپنانے کی ضرورنہیں تھی۔لیکن پھر بھی میرا مالک ہمیشہ عزت ہی دکھاتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ؛

''راضی بیٹا! بات بزنس کی ہی نہیں ہوتی، بے شک میں گھٹیا کام کرتا ہوں۔ ہمارے ٹائلٹ میں آنے والے گاہک ہماری طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے۔ یہ ہم سے بڑے لوگ ہوتے ہیں لیکن ہماری مسکراہٹ اورخوش اخلاقی ان پراثرضرورچھوڑتی ہے۔ان کوعزت ملنے کااحساس ضرور ہوتا ہے۔اس دنیا کوخوشیاں دینا بہت بڑی بات ہے۔''

ٹائلٹ پردودوروپے اکٹھے کرنے والا یہ بوڑھا آدمی کسی فلاسفر سے کم نہیں تھا۔ میں نے اس بوڑھے کے ساتھ ایک مہینے سے کچھ زیادہ کام کیا تھا لیکن یہ اس مالک کی خوش اخلاقی ہی تھی جو مجھے آج گیارہ سال بعد بھی محسوس ہورہی ہے۔

بارہ بجے کے قریب میرے مالک کی بیوی کھانا لےکرآ گئی۔ان کا گھرایک گلی چھوڑ کر ہی تھا۔تقریباً دس منٹ کا پیدل سفر تھا۔ ہماری باتوں کے سلسلے میں میرا مالک گھر جا کر میرے بارے میں بتانا بھول گیا تھا۔اس لیےاس کی بیوی صرف اسی کا کھانا لےکرآئی تھی۔ وہ عورت مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئی۔

''بیٹا! تم بالکل میرے بیٹے نوید جیسے ہو۔ خدا تمہاری لمبی عمر کرے۔''

''جی بی بی جی شکریہ آپ کا۔'' میں نے اٹھ کر ان کے آگے سر جھکایا تو وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دعا دینے لگی۔

''بیٹا! مجھے بی بی مت کہو۔ عجیب سا احساس ہوتا ہے۔ قسمت تمہارے جیسے لڑکے کو ہمارے پاس کام کرنے کے لئے لے آئی ہے تو پھر شرمندہ مت کرو۔ خالہ یا چاچی جو مرضی کہہ لو لیکن بی بی جی مت کہو۔''

''جی خالہ جی!'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بوڑھی عورت بھی مسکرانے لگی۔

''تم دونوں مل کر کھانا کھا لو، میں گھر جاتی ہوں اور تین چار روٹیاں اور لگا دیتی ہوں۔'' خالہ جانے لگی تو شیرو چاچا نے اسے روک لیا۔

میں آپ کو اپنے مالک کا تعارف کروانا بھول گیا تھا۔ ان کا نام شیرا مسیح تھا۔ لوگ اسے شیرو کے نام سے پکارتے تھے۔ ان کا ایک بیٹا اور چار بیٹیاں تھیں۔ بیٹے کا نام نوید مسیح اور لڑکیوں کے نام میرے خیال میں یہاں لکھنا ضروری نہیں ہیں۔ ان کی ایک بیٹی کی شادی ہو گئی تھی جبکہ ایک لڑکا اور تین لڑکیاں بھی کنواری تھیں۔ نوید ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ وہ صبح 5 بجے گھر سے چلا جاتا تھا اور رات کو 9 بجے کے قریب گھر آتا تھا۔ گھر میں بوڑھا ہوتا ہوا باپ اور تین جوان ہوتی ہوئی بہنیں ہوں تو بیٹے بہت جلدی بڑے ہو جاتے ہیں۔ نوید فیکٹری میں ڈبل شفٹ میں کام کرتا تھا۔

اس وقت مسقط اور دوبئی چوری چھپے جانے کے پینتیس ہزار لگتے تھے۔ پاکستان کے انڈیا کے ساتھ پرانے کشیدہ حالات کی وجہ سے پاکستان کی نیوی بہت جدید اور طاقت ور تھی۔ بلوچستان اور کراچی کو لگنے والی پوری سمندری پٹی پر نیوی والوں کی بہت گہری نظر تھی۔ یہاں سے لانچ کے ذریعے دوبئی یا مسقط جانا تقریباً ناممکن تھا لیکن پاکستان کے مقابلے میں ایران کی نیوی کم طاقت ور تھی۔ دوبئی اور مسقط کی نیوی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایجنٹ یہاں سے لوگوں کو تربت لے کر جاتے تھے اور پھر چھوٹے چھوٹے ڈالوں میں ڈال کر مندکی چوکی کراس کرواتے تھے۔ مند چوکی پر موجود بلوچ یا پولیس والے تھوڑے سے پیسے لے کر گاڑی کو نہیں روکتے تھے۔ مندکی چوکی کراس کرنے کے بعد آگے سے رات کو پیدل ہی بارڈر کراس کروایا جاتا تھا۔

مند بلوچستان میں ایران کے بارڈ سے تقریباً بیس کلومیٹر اندر پاکستان کا ایک نیم سرحدی گاؤں تھا۔ 2000ء سے 2008ء کے درمیانی عرصے میں یہ گاؤں انسانی سمگلروں کا گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں مسقط، دوبئی، ترکی اور یونان کی روزانہ کے حساب سے ٹیمیں نکلتی تھیں۔ ہر روز سینکڑوں کی تعداد میں پاکستانی لڑکے ایران کا بارڈر کراس کرتے تھے۔ مسقط اور دوبئی کے تیس سے چالیس ہزار کے قریب روپے لیے جاتے تھے۔ ترکی کا ایک لاکھ اور یونان کی سب سے بڑی ٹیم ہوتی تھی۔ یونان جانے کا ایجنٹ چھ لاکھ سے زیادہ پیسے لیتے تھے۔

اس زمانے میں یونان، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، گجرات اور منڈی کے نوجوان لڑکوں کے لئے ایک حسین خواب تھا۔ یونان یورپ کا پہلا ترقی یافتہ ملک تھا۔ ترکی سے جو بھی لڑکا ایک بار یونان کے شہر سلونیکی تک پہنچ جاتا تھا۔ یونان والے اسے ڈی پورٹ نہیں کرتے تھے۔ وہ لڑکوں کو یونان میں رہنے اور کام کرنے کا پرمٹ جاری کر دیتے تھے۔

''میں روٹی لا کر دے دیتی ہوں۔'' خالہ اٹھ کر جانے لگی تو شیرو چاچا نے اسے روک لیا۔

''نہیں تم ایسا کرو راضی کو اپنے ساتھ ہی گھر لے جاؤ۔ وہ گھر بھی دیکھ لے گا اور ادھر بیٹھ کر کھانا بھی کھا لے گا۔ اور ہاں۔۔۔اس کو نوید کا کوئی سوٹ دے دینا اور اس کے کپڑے لے کر دھو دینا۔''

''راضی بیٹا! تم ان کے ساتھ چلے جاؤ، گھنٹہ دو گھنٹے آرام کر کے آ جانا۔'' میں خالہ کے ساتھ جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

خالہ لے کر مجھے گھر آ گئی۔ تین کمرے کا چھوٹا سا گھر تھا۔ دو چھوٹے چھوٹے کمرے ایک باتھ روم اور باہر لکڑی کا ایک پرانا سا دروازہ تھا۔ کمروں کے دروازے بھی لکڑی کے ہی تھے لیکن باتھ روم بغیر دروازے کے تھا۔ پٹ سن کی دو بوریوں کو سی کر اس سے پردہ بنا لیا گیا تھا۔ پورا گھر غربت کی تصویر نظر آ رہا تھا۔ میں اس گھر کا نوکر بنا تھا۔ میں گھر میں داخل ہوا تو تینوں لڑکیاں چولہے کے پاس بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں۔ بڑی لڑکی کی عمر اٹھارہ سال سے زیادہ لگ رہی تھی اور باقی دونوں لڑکیاں دس سال سے چھوٹی تھیں۔ نوید کی عمر بیس سال تھی۔

''امی یہ کون ہیں؟'' سب سے پہلے سوال سب سے چھوٹی لڑکی نے کیا۔ تقریباً آٹھ سال کی وہ چھوٹی سی لڑکی بہت پیاری سی تھی۔ اس کی آنکھیں ہر وقت شرارت سے بھری رہتی تھیں۔

''بیٹا یہ راضی ہے۔ ٹائلٹ پر کام کرنے کے لئے آیا ہے۔ تمہارے باپ نے اسے کام پر رکھا ہے۔ آج سے

یہ ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔'' خالہ نے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

مجھے دیکھ کر لڑکیاں چولہے کے پاس سے اٹھ گئیں۔ خالہ نے مجھے چولہے کے پاس ہی بٹھا لیا اور خود توے پر روٹیاں ڈالنے لگی۔ پہلی روٹی پک کر تیار ہوئی تو انہوں نے ایک چھوٹی کٹوری میں سالن نکال کر دیا اور ساتھ میں گرم گرم روٹی دے دی۔ ماش کی دال بنی ہوئی تھی۔ میں نے روٹی کا نوالہ توڑا اور تھوڑی سی دال لگا کر منہ میں ڈال لیا۔ آج پانچ دن بعد پہلی بار کھانے کا ایک ٹکڑا منہ میں گیا تھا۔ میں ان پانچ دنوں میں کھانے کا ذائقہ جیسے بھول ہی گیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اتنا بڑا فاقہ کاٹا تھا۔

ایمان کی محبت نے مجھے زندگی میں سروائیو کرنے اور آگے بڑھنے کا ہنر سکھا دیا تھا۔ میں جب ایک بار گھر سے نکل آیا تو اب ایمان کے خواب کو پورا کر کے ہی جانا تھا۔ زندگی میں اب صرف ایمان ہی تھی۔ میں نے روٹی کا نوالہ منہ میں رکھا تو وہ میرے حلق میں پھنس گیا۔ مجھے کھانسی کا ایک زوردار جھٹکا لگا اور روٹی کا نوالہ میرے منہ سے باہر نکل گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو آ گئے۔

''واہ رے میرے خدا! تیرے بھی انداز نرالے ہیں۔ جس روٹی کے نوالے لئے پچھلے پانچ دن سے کراچی کی ایک ایک گلی کے دھکے کھا رہا تھا۔ آج وہی نوالہ ایک عیسائی اور غریب گھر کا دیا تو وہ بھی نیچے نہیں اترنے دیا۔''

''بیٹا کیا ہوا؟ کھانسی لگ گئی؟ نرما! پانی دے بھائی کو۔۔۔ بے چارہ صبح سے بھوکا ہوگا اس لیے نوالہ حلق سے نیچے نہیں گیا۔'' خالہ نے اپنی بڑی بیٹی کو کہا تو وہ جلدی سے پاس ہی پڑے ہوئے گھڑے سے پانی نکالنے لگی۔

نرما نے گلاس میں پانی لیا اور میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔ آدھا گلاس پانی پینے کے بعد میں نے گلاس زمین پر رکھا اور روٹی کھانے لگا۔ خالہ میری امی کی طرح روٹیاں موٹی پکاتی تھیں۔ اچھی خاصی بھاری روٹیاں لیکن میں کوئی چار کے قریب روٹیاں کھا گیا۔

''بیٹا! کہے تو اور آٹا گوندھ لیتی ہوں۔ دو منٹ ہیں لگیں گے۔ نرما جلدی سے مٹی (دس بارہ کلو آٹا سٹور کرنے والے ایک صندوق کا نام) سے آٹا لے کر آؤ اور ادھر بیٹھ کر گوندھ دے۔ میں اور روٹیاں لگا دیتی ہوں۔''

''نہیں نرما! آپ رہنے دو، میں نے کھانا کھا لیا ہے۔ مجھے اور بھوک نہیں ہے۔'' میں نے بھی اسے نرما ہی کہہ کر بلایا تھا۔

''بیٹا! تھوڑی اور روٹی کھا لو صرف دو منٹ ہی لگیں گے۔'' خالہ اصرار کرنے لگیں۔

''نہیں خالہ شکریہ! رات کو کھا لوں گا۔'' اب میں نے منع کر دیا لیکن وہ عورت ابھی بھی مطمئن نہیں لگ رہی تھی۔

''بیٹا! کھا لیتے صبح سے بھوکے ہونا؟ صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔''

''خالہ! میں نے پچھلے پانچ دن سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ پچھلے پانچ دن سے بھوکا ہوں۔ غریب ضرور ہوں لیکن مانگنے والا نہیں ہوں۔'' میں نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو خالہ کے ساتھ ساتھ نرما بھی حیران رہ گئی۔

''بیٹا! پچھلے پانچ دن سے بھوکے ہو اور آج سارا دن تم نے اپنے چاچے سے کچھ بھی نہیں کہا؟ میں تمہیں گھر سے کچھ لا کر دے دیتی۔'' میں نے ان کو کوئی جواب نہ دیا تو انہوں نے ایک چھوٹے کمرے میں چارپائی ڈال کر دے دی تاکہ میں کچھ دیر آرام کر سکوں۔

میں چارپائی پر جا کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ پچھلے پانچ دن کی بھوک تھی۔ آج جب پیٹ میں کھانا گیا تو نیند بھی آ گئی اور ذرا سی دیر میں سو گیا۔ میری آنکھ اس کے بعد مغرب کے وقت ہی کھلی۔ شام کے چھ بج رہے تھے اور میں پچھلے چھ گھنٹوں سے مسلسل سو رہا تھا۔ خالہ نے مجھے جگانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ انہوں نے جا کر شیرو چچا کو بتا دیا تھا اور انہوں نے بھی مجھے جگانے سے منع کر دیا۔ میں نے کمرے کی دیوار پر لگے کلاک میں ٹائم دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ میں نے جلدی سے چارپائی سے نیچے چھلانگ لگائی اور جوتے پہن کر باہر آ گیا۔ باہر صحن میں تینوں لڑکیاں ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ خالہ کہیں باہر گئی ہوئی تھیں۔

''نرما! خالہ کدھر ہیں؟ آپ لوگ مجھے اٹھا دیتے۔'' مجھے چونکہ ان تینوں میں سے صرف نرما کا ہی نام پتہ تھا اس لیے میں نے نرما کو ہی مخاطب کیا۔

''جی! امی تو ہمسائیوں کے گھر گئی ہوئی ہیں اور انہوں نے آپ کو اٹھانے سے منع کیا تھا۔'' میں ان لوگوں کے گھر کا ملازم تھا لیکن وہ اتنی تمیز سے بات کر رہے تھے جیسے میں ان کے گھر کا مہمان ہوں۔ یہ سب کچھ چاچے شیرو کی محبت اور خلوص کا نتیجہ تھا۔ وہ ایک نفیس انسان تھے اور یہی نفاست ان کے گھر کے ہر فرد میں نظر آتی تھی۔

''جی ٹھیک ہے! میں پھر کام پر چل جاتا ہوں۔ خالہ آئیں تو ان کو بتا دینا۔'' میں گھر کا بیرونی دروازہ کھول کر

باہر نکل گیا۔دس منٹ کا تو صرف سفر تھا۔میں نے گلی کراس کی اور دوسری طرف اسٹیشن پر آ گیا۔ٹائلٹ پر چاچا شیرو بیٹھا ہوا تھا۔

''سوری چاچا! میری آنکھ لگ گئی تھی۔میں ہمیشہ ٹائم پر اٹھ جاتا ہوں، پتہ نہیں کیوں آج اٹھ نہیں سکا۔سوری! دوبارہ ایسا نہیں ہوگا۔'' میں نے شرمندگی سے کہا تو وہ مسکرانے لگے۔

''نہیں بیٹا! کوئی بات نہیں ہے۔میں نے خود ہی منع کر دیا تھا۔اب تم آ گئے ہو تو ادھر بیٹھ جاؤ، میں اب گھر چلا جاتا ہوں۔رات کو نو بجے آؤں گا تو اکٹھے ہی صفائی وغیرہ کریں گے اور گھر چلے جائیں گے۔'' شیرو چاچا نے میرے کندھے پر تھپکی دی اور گھر کی طرف چل دیئے۔

میں نے کام وغیرہ سیکھ لیا تھا۔ویسے بھی یہ کوئی سیکھنے والا کام تو تھا نہیں، سادہ سا کام تھا۔میں لکڑی کی بنی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور آنے والے گاہکوں سے دو دو روپے لے کر ان کو لوٹا پانی کا بھر بھر کر دینے لگا۔رات کو 9 بجے کے قریب چاچا آیا تو تب تک میں نے سارے باتھ رومز کی صفائی کر دی تھی۔اس کے علاوہ باہر فرش بھی جھاڑو مار کر صاف کر دیا تھا۔انہوں نے آ کر دیکھا تو خوش ہو گئے۔

''جیتے رہو بیٹا! تم واقعی بہت محنتی ہو۔'' ہم دونوں ایک گھنٹے تک ادھر ہی بیٹھے رہے۔رات کو ان کا بیٹا نوید بھی آ گیا۔وہ میرا ہم عمر ہی تھا۔میں اس سے مل کر کافی خوش ہوا۔شیرو چاچا کی فیملی بہت اچھی تھی۔

''راضی بھائی! آپ بہاولپور سے آئے ہو؟ ادھر میرا ایک دوست بھی ہے۔میرے ساتھ ہی فیکٹری میں کام کرتا ہے۔بہت اچھا لڑکا ہے۔آپ کی اس سے ملاقات کرواؤں گا۔'' وہ مجھے دیکھ کر کافی ایکسائیٹڈ ہو رہا تھا۔

شیرو چاچا سے اب کام نہیں ہوتا تھا، وہ اب بیٹھے بیٹھے تھک جاتے تھے۔ٹائلٹ کا کام ٹھیک چل رہا تھا۔ان کی روزانہ کی آمدن پانچ سو روپے سے زیادہ ہو جاتی تھی۔میری تنخواہ، ٹائلٹ کا کرایہ اور پانی وغیرہ کا خرچہ نکال کر ان کو پانچ ہزار کے قریب روپے ماہانہ بچ جاتے تھے۔ٹائلٹ انہوں نے تین ہزار روپے ماہانہ کرایہ پر لیے ہوئے تھے۔دو ہزار کے قریب پانی کا بھی خرچہ آ جاتا تھا۔

اس دور میں بجلی کا بل تو پچاس روپے سے زیادہ نہیں آتا تھا۔صرف ایک بلب ہی لگا ہوا تھا، بس اسی کا بل آتا تھا۔رات کو دس بجے ہم اکٹھے ہی گھر آ گئے۔میں نوید اور چاچا ایک کمرے میں سو گئے جبکہ گھر کی باقی عورتیں

دوسرے کمرے میں سوگئیں تھیں دوسرے دن نوید کو اتوار کی چھٹی تھی۔تو وہ میرے ساتھ ہی کام پر آ گیا۔

''راضی بھائی! میں تو اسی مہینے مسقط جا رہا ہوں، میری ایجنٹ سے بات ہوگئی ہے۔ وہ تیس ہزار میں لے کر جائے گا۔'' پانی والی ٹینکی سے پانی لے کر ہم نے ڈرموں میں ڈال لیا تھا اور اب فارغ ہو کر بیٹھے ہوئے تھے۔

''راضی بھائی! ادھر پاکستان میں اب کچھ نہیں رکھا ہے۔ دو دو شفٹوں میں کام کرتا ہوں لیکن پھر بھی قسم سے گھر کے حالات ہی ٹھیک نہیں ہو رہے ہیں۔ نرما بھی بڑی ہوگئی ہے۔ اس کی شادی کرتے کرتے دوسری بھی بڑی ہو جائیں گی۔ اکیلا مرد ہوں، پوری گھر کی ذمہ داری ہے۔'' نوید نے دور خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک کہتے ہو یار! تین جوان ہوتی ہوئی بہنیں اور بوڑھے ماں باپ کا بوجھ انسان کے کندھوں پر ہو تو بندے کو خود ہی سمجھ دار ہو جانا چاہیے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''راضی بھائی! آپ کتنے بہن بھائی ہو؟'' نوید کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''یار ہم چار بھائی اور ایک بہن ہے۔'' میں نے اس کو بتایا تو اس نے سر ہلا دیا۔

''راضی بھائی! کیا آپ ہم سے بھی غریب ہیں جو آپ ہماری ملازمت کر رہے ہو؟'' اس نے عجیب سا سوال کیا تو میں اس کے اس سوال پر مسکرا دیا۔

''نوید یار! بات غریب اور امیر کی نہیں ہوتی ہے، زمانے کے دھکے خدا جس کے نصیب میں لکھ دیتا ہے تو وہی انسان دنیا کا غریب ترین انسان بن جاتا ہے۔''

ٹائلٹ پر پہلا گاہک آ گیا تو میں کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے پاس پانچ روپے کا نوٹ تھا۔ میں نے اس کو بقایا تین روپے دیئے اور ساتھ ڈرم میں سے پانی کا ایک لوٹا بھر کر دے دیا۔

''راضی بھائی! کبھی کبھی آپ کی باتیں مجھے بڑی عجیب سی لگتی ہیں۔ آپ شاید اس دنیا کے ہی نہیں لگتے ہو۔'' وہ ابھی تک میری باتوں میں الجھا ہوا تھا۔ اتنی دیر میں ٹائلٹ والا آدمی واپس آ گیا اور بقایا لے کر چلا گیا۔

''راضی بھائی! ابھی تک آپ نے میری بات کا صحیح جواب نہیں دیا ہے۔'' نوید نے ایک پھر سوال کر دیا۔

''نوید یار! کچھ سوالوں کے جواب نہیں ہوتے ہیں۔ میں آپ کا ملازم ہوں۔ آپ کے گھر کا کھانا کھا رہا

ہوں۔بس یہی سب کچھ ہے۔''

اب کام کارش ہو گیا تھا۔ایک ساتھ تین آدمی آ گئے۔میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ان سے پیسے لے کر انہیں پانی سے بھر بھر کر لوٹا دینے لگا۔جب وہ لوگ باتھ روم سے فارغ ہوئے تو میں جلدی جلدی صفائی کرنے لگا۔یہ میری عادت تھی۔میں ہر بار گاہک کے جانے کے بعد ٹائلٹ کی صفائی ضرور کرتا تھا۔جب کام بہت زیادہ ہو جاتا تھا تو پھر اور بات تھی لیکن نارمل کام میں یہ میری روٹین تھی۔

بارہ بجے نرما کھانا لے کر آئی۔خالہ کی طبیعت تھوڑی خراب ہو گئی تھی اس لیے ان کی جگہ پر نرما ہی کھانا دینے آ گئی۔چاچا شیرو تو صبح صبح ہی گھر سے نکل گئے تھے اور ابھی تک ان کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔سادہ آلو پالک کی سبزی بنی ہوئی تھی۔لیکن نرما کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا۔وہ کھانا بہت اچھا بناتی تھی۔میں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔

''شکریہ نرما! آپ نے کھانا بہت اچھا بنایا ہے۔'' میں نے اس کے کھانے کی تعریف کی تو وہ خوش ہو گئی۔

اگلے ایک ہفتے تک میں لگاتار کام پر جاتا رہا۔میرا اور نوید کا قد ایک جیسا ہی تھا اس لیے شیرو چاچا نے مجھے نوید کے دو کپڑوں کے جوڑے دے دیئے۔نوید تو مجھے نئے کپڑے لا کر دینا چاہتا تھا لیکن میں نے ہی انکار کر دیا۔مجھے یہاں پر رہنا تو تھا نہیں اور نئے کپڑے پہننے کا شوق تو مجھے اپنے گھر میں بھی نہیں تھا۔ادھر بھی میں اپنے باقی بھائیوں کے کپڑے پہن لیتا تھا اور ویسے بھی مجھے ادھر رہنا ہی نہیں تھا تو پھر ایسے ہی ان غریب لوگوں کے پیسے کیوں بھرواتا۔

نرما اس ایک ہفتے میں میرے بہت قریب آ گئی تھی۔میں نے جب نرما کو نزدیک آتے ہوئے دیکھا تو اس سے کنارہ کرنا شروع کر دیا تھا۔وہ بہت معصوم سی لڑکی تھی اور میں کسی اور ہی راستے کا مسافر تھا۔اس لیے میں اس کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا۔میرے بچپن میں ایک بار ایسا بھی وقت آیا تھا جب میں لڑکیوں کے پیچھے بھاگتا تھا اور کسی بھی لڑکی نے مجھ سے دوستی کرنا گوارہ نہیں کیا تھا۔اب نرما مجھ سے دوستی بڑھانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن میرا اس دنیا سے ہی دل اٹھ گیا تھا۔

''راضی بھائی! آپ کیوں جا رہے ہو باہر؟ میری تو مجبوری ہے۔پورے گھر کا انحصار مجھ پر ہے لیکن آپ تو چار بھائی ہو اور بہاولپور میں آپ کی تھوڑی بہت زمین بھی ہے۔'' رات کو کھانا کھاتے ہوئے نوید نے مجھ سے مخاطب

ہوتے ہوئے کہا۔

''نہیں نوید بھائی بات کام کی نہیں ہے۔بس کسی کا خواب پورا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' میں روٹی کا نوالہ منہ میں رکھتے رکھتے رک گیا۔

ایک بار پھر ایمان کی یاد آ گئی تھی بلکہ ایمان تو کبھی دل سے بھولی ہی نہیں تھی۔ہاں کبھی کبھی وہ بہت شدت سے یاد آ جاتی تھی اور جب وہ شدت سے یاد آتی تھی تو پھر وہ مجسم ہو کر میرے سامنے آ کر بیٹھ جاتی تھی۔اس وقت ساری دنیا میری نظروں سے غائب ہو جاتی تھی۔صرف ایمان اور ایمان ہی رہ جاتی تھی۔

''راضی ہمت تو نہیں ہار گئے ہو؟'' ایمان میرے سر میں انگلیاں پھیرنے لگتی تھی۔

''نہیں ایمان نہیں! تیرا راضی عشق کی راہوں میں چلتے چلتے کتنا مضبوط ہو گیا ہے۔اس کا اندازہ تم کو نہیں ہوا ہے۔دیکھ لو! پیار کرنا بھی آ گیا ہے اور اس پیار کے لئے زندگی دینا بھی آ گیا ہے۔''

'' راضی کیا ہوا؟ راضی!'' مجھے نوید کی آواز خواب سے باہر لے آئی۔میں نے خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھا تو پورا گھر میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔میں نے کھانا چھوڑا اور خاموشی سے اندر کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔

''راضی بیٹا! کیسے ہو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟'' چاچا شیرو میرے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھنے لگے۔سارا گھر ایک بار پھر میری چارپائی کے گرد اکٹھا ہو گیا تھا۔

''نہیں نہیں! چاچا جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔بس ایسے ہی۔۔۔کوئی بات نہیں ہوئی۔آپ لوگ پریشان مت ہوں۔'' ان لوگوں کو اپنے لیے فکرمند ہوتے ہوئے دیکھ کر مجھے بہت شرمندگی ہو رہی تھی۔

''نہیں بیٹا! کسی بھی قسم کی پریشانی ہے تو ہمیں بتاؤ۔میں غریب ضرور ہوں لیکن آپ کی پریشانی حل کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔پیسے وغیرہ چاہئیں تو بتاؤ! یا پھر اپنے گاؤں کا ایک چکر لگا آؤ۔'' انہوں نے اپنی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے انہیں روک دیا۔

''نہیں چاچا! مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔آپ لوگوں کی محبت ہی میرے لیے بہت ہے۔'' ہم لوگ

ایسے ہی تھوڑی دیر تک مزید باتیں کرتے رہے اور اس کے بعد سو گئے۔

صبح اٹھ کر نوید تو فیکٹری چلا گیا اور میں بھی اپنے کام پر آ گیا۔ خالہ چچا شیرو کے ساتھ تین چار گلیاں چھوڑ کر ایک گھر میں فوتگی ہو گئی تھی وہاں چلی گئی۔ دوپہر کا کھانا نرما لے کر آئی۔

''راضی صاحب! کبھی ہمیں بھی ٹائم دے دیا کرو۔ پتہ ہے کب سے آپ کی راہوں میں نظریں بچھائے ہوئے بیٹھے ہیں؟'' وہ میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے خاموشی سے کھانا لیا اور ٹیبل پر رکھ کر کھانے لگا۔

''قسم سے گھر میں دیسی گھی نہیں تھا ورنہ آج آپ کے لئے چُوری بنا کر ہی لاتی، سنا ہے عاشق لوگوں کو چوری بہت پسند ہوتی ہے؟'' اس نے شوخی سے کہا۔

میں نے غصے سے اس کو گھورا اور دوبارہ کھانے میں مصروف ہو گیا۔ پورے ایک ہفتے سے میں نرما کو بلانے سے گریز کر رہا تھا۔

''رانجھے صاحب! ایک نظر اپنی ہیر پر بھی ڈال لو۔ اتنی محبت سے کھانا بنا کر لائی ہوں، ایک شکریہ ہی کہہ دو۔''

ٹائلٹ پر ایک گاہک آ گیا۔ میں اٹھنے لگا لیکن نرما نے مجھے منع کر دیا اور خود اٹھ کر ڈرم سے لوٹا بھرنے لگی۔ میں کبھی بھی پہلے سے لوٹا بھر کر نہیں رکھتا تھا بلکہ گاہک کے آنے پر تازہ لوٹا بھر کر دیتا تھا۔ اس سے گاہک کو تھوڑا اچھا محسوس ہوتا تھا۔ نرما نے گاہک سے دو روپے لئے اور اسے پانی کا لوٹا بھر کر دے دیا۔ گاہک نے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ نرما کی طرف دیکھا اور اس کے ہاتھ سے لوٹا لے لیا۔

''دیکھ لو راضی صاحب! لوگ نظروں سے ہی کھانے کی کوشش کرتے ہیں اور ایک آپ ہو کہ لڑکی خود چل کر آپ کے پاس آ رہی ہے اور آپ لفٹ ہی نہیں کرواتے ہو۔ میں اتنی بھی بدصورت نہیں ہوں۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر میرے گالوں کو پکڑ لیا۔

''نرما! دیکھو تم بہت معصوم اور خوبصورت ہو۔ یقین کرو تمہیں بہت اچھا اور پیار کرنے والا شوہر ملے گا لیکن پلیز میرے پیچھے اپنی زندگی برباد مت کرو۔ میں تم کو وہ سب کچھ نہیں دے سکتا جو تم مجھ سے چاہتی ہو۔ میں بہت شریف سا لڑکا ہوں۔'' میں نے نرما کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''نہ راضی صاحب! شریف ہوتبھی تو آپ پر دل آ گیا ہے۔ایک بار ساتھ تو چل کر دیکھو، اتنا پیار کروں گی کہ ساری دنیا کو بھول جاؤ گے۔'' وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ میں نے اس سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور کھانا کھانے لگا۔

''راضی! میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں۔ اتنا پیار کرتی ہوں کہ تمہارے لیے جان بھی دے سکتی ہوں۔'' وہ بہت جذباتی ہوگئی تھی۔

''راضی! تمہارے لیے میں اپنے ماں باپ، گھر بار سب کچھ چھوڑ دوں گی۔ ایک بار مجھے اپنالو میں اپنا مذہب بھی تمہارے لیے بدل لوں گی۔ راضی! میں تمہارے لیے مسلمان ہونے کو بھی تیار ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور تھوڑی دیر میں ہی وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

''راضی! کیوں معصوم سی لڑکی کو رلا رہے ہو؟'' ایمان میرے میرے تخیل میں میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ میں ایمان کی طرف کسی عبادت گزار کی طرح دیکھنے لگا۔

''راضی! اتنا بھی دل سخت مت کرو۔ دنیا بہت بڑی ہے کہیں تو دل لگانے کی کوشش کرو!'' ایمان زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔ وہی بچپن کا معصوم سا شرارتی پن اس کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ بڑھا کر ایمان کے گالوں پہ رکھ دیئے۔

''ایمان میں مسیحا نہیں ہوں اور نہ مجھے کسی کا درد محسوس ہوتا ہے۔ میری طرف سے پوری دنیا کو آگ لگ جائے۔ مجھے صرف تم سے پیار کرنا آتا ہے، اس کے علاوہ اس راضی کو دنیا کی کسی چیز سے غرض نہیں ہے۔'' اچانک ایمان میری نظروں سے اوجھل ہوگئی اور میں ہوش کی دنیا میں واپس آ گیا۔

نرما میرے سامنے کرسی پر بیٹھی رو رہی تھی۔ سڑک سے گزرنے والے لوگ اب مڑ مڑ کر نرما کو دیکھ رہے تھے۔ میں کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور نرما کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دینے لگا۔

''راضی! میں تمہارے لیے ابھی اپنا مذہب تبدیل کرنے پر تیار ہوں۔ راضی! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی، تم کہو تو ابھی کلمہ پڑھ لیتی ہوں! راضی میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں۔''

''نرما!'' میں نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ آنسوؤں سے بھرا ہوا معصوم چہرہ ۔۔۔وہ

ضرورت سے زیادہ ہی خوبصورت لگ رہی تھی۔

''نرما! محبت کی جن راہوں پر تم چلنے کی کوشش کر رہی ہو میں ان راہوں سے گزر چکا ہوں۔ میں اپنے حصے کی محبت کر چکا ہوں۔ انسان زندگی میں صرف ایک بار ہی محبت کرتا ہے اور میں وہ محبت میں بہت پہلے ہی کر چکا ہوں۔ ابھی میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے، میں تم کو کچھ بھی نہیں دے سکتا۔تم ابھی بہت چھوٹی ہو،محبت کی راہوں پر چلنے کی کوشش مت کرو۔ یہ زندگی چھین لیتی ہے۔محبت بہت بری چیز ہے۔ یہ زندگی کی ایک ایک خوشی نچوڑ نچوڑ کر نکال دیتی ہے۔'' میں نے نرما کو ٹشو پیپر دیا اور اسے کرسی پر بٹھا کر پانی کا گلاس بھرنے لگا۔

''نرما! محبت بہت درد دیتی ہے۔اس کی شدت سے بچ کر رہو گی تو خوش رہو گی ورنہ ساری زندگی میری طرح گلیوں کی خاک چھانتی رہو گی۔'' میں نے اس کے ہاتھ میں گلاس دیا تو وہ خاموشی سے پانی پینے لگی۔

''ایک مہربانی کرو گے مجھ پر؟'' اس نے حسرت سے میری طرف دیکھا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میں تمہاری کہانی سننا چاہتی ہوں۔اندازہ لگانا چاہتی ہوں کہ کتنا درد تمہارے دل میں بھرا ہوا ہے۔جس کی ایک جھلک تمہاری آنکھوں میں بھی نظر آتی ہے۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ کتنی محبت کی ہے تم نے جو آج محبت ہی ختم ہو گئی ہے؟'' میں اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔میرے ذہن میں ماضی کی پرچھائیاں شروع ہوئیں تو میں نرما کو سنانے لگا۔

میری کہانی شروع ہوئی تو پھر شام کے پانچ بج گئے۔ درمیان میں جب بھی کوئی گاہک آتا تو نرما ہی اٹھ کر اسے سروس دیتی رہی۔ جب ماضی یاد آ جاتا تھا تو پھر مجھ سے کوئی بھی کام نہیں ہوتا تھا۔شام کو خالہ ہی نرما کو لینے کے لئے آئی اور اسے ادھر میرے پاس بیٹھا دیکھ کر کافی غصہ ہوئیں۔

''نرما! تم دوپہر کی گھر سے نکلی ہوئی ہو اور ادھر راضی کے پاس بیٹھ کر کیا کر رہی ہو؟ شرم نہیں آتی یوں بیچ سڑک پر کرسی پر بیٹھی ہوئی ہو؟'' انہوں نے غصے سے نرما کے سر پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

''امی وہ۔۔۔میں۔۔۔ایسے ہی بیٹھ گئی تھی۔'' نرما کوئی بہانہ سوچ رہی تھی جب خالہ نے ایک اور تھپڑ مار دیا۔ مجھے بہت شرمندگی ہوئی کہ میری وجہ سے بے چاری کو ایسے ہی مار پڑ گئی۔

''وہ۔۔۔خالہ۔۔۔سوری! یہ ایسے ہی ادھر بیٹھ گئی۔ مجھے بھی خیال نہیں رہا۔'' میں نے معاملے کو سلجھانا چاہا

لیکن خالہ نے مجھے روک دیا۔

''نہیں بیٹا! تمہارا کوئی قصور نہیں ہے، تم تو لڑکے ہو۔ یہ لڑکی ہے اسے خیال رکھنا چاہیے تھا۔ اگر اس کا باپ تم دونوں کو یوں بیٹھا ہوا دیکھ لیتا تو اسے شاید جان سے ہی مار دیتا۔ غریب ضرور ہیں لیکن عزت دار ہیں۔'' وہ ماں تھی۔ ہم دونوں کو یوں بیٹھے دیکھ کر غلط سمجھ بیٹھی تھی لیکن برداشت کر گئی۔

''سوری خالہ! غلطی میری ہے۔ مجھے خیال رکھنا چاہیے تھا۔'' میری وجہ سے اس شریف عورت کا دل دکھا تھا۔

''نہیں بیٹا! تم کیوں شرمندہ ہوتے ہو؟ تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ ہمیشہ عورت کا ہی قصور ہوتا ہے۔ وہی مرد کو راستہ دیتی ہے۔ مرد تو عورت کو دیکھتے ہی پھسل جاتا ہے۔'' خالہ نے نرما کو بازو سے پکڑ لیا تھا۔ نرما نے خالہ سے بازو چھڑوایا اور اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

''امی! آپ میرے بارے میں صحیح سمجھ رہی ہیں لیکن آپ راضی کو غلط کہہ رہی ہیں۔ یہ آپ کی اور میری سوچ سے بھی زیادہ شریف ہے۔ نہیں امی! راضی کا کردار خراب نہیں ہے۔ آپ ہم دونوں کے بارے میں شک کر کے راضی کی توہین کر رہی ہیں۔'' خالہ نے کچھ لمحوں کے لئے ہم دونوں کے چہروں کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے نرما کو لے کر گھر کی طرف چل دی۔

میں نے رات کو کام ختم کیا اور گھر آ گیا۔ خاموشی سے کھانا کھایا اور چارپائی پر جا کر لیٹ گیا۔ زندگی میں ایک کے بعد ایک پرابلم آ رہی تھیں۔ ایک مہینہ ادھر نکل جاتا تو ایران جانے کا کرایہ بن جاتا لیکن نرما کی وجہ سے وہ بھی مشکل لگ رہا تھا۔ اگر نرما ایسے ہی میرے پیچھے پڑی رہتی تو مجھے مجبوراً یہ کام چھوڑنا پڑتا۔

''ایمان! تیری اس محبت نے پتہ نہیں کیا کیا کچھ اور کروانا ہے۔'' میں نے کروٹ بدلی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ دوسرے دن صبح صبح میں کام پر چل گیا۔ بارہ بجے خالہ کھانا لے کر آئی تو وہ میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''بیٹا! تم سے ایک بات کرنی ہے۔۔۔ اگر تم برا نہ مانو تو؟'' خالہ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''جی خالہ! آپ پوچھیں مالک ہیں۔ نوکروں کو برا نہیں منانا چاہیے۔'' میں نے زمین پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! میری نرما سے بات ہوئی ہے۔ وہ تم سے شادی کرنی پر تلی ہوئی ہے۔ جوان خون ہے۔ ڈر لگتا ہے اگر کچھ غلط ہو گیا تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ کیا تم اپنے خاندان وغیرہ کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟'' خالہ نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

''خالہ! میرا کوئی خاندان نہیں ہے بلکہ میرا کوئی بھی نہیں ہے، بس اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''بیٹا! سوچ لو اگر تم نرما کو پسند کرتے ہو۔ تم نوید کی جگہ پر فیکٹری میں کام پر لگ جانا۔ دس ہزار کے قریب اس کی تنخواہ ہے۔ کوشش کرو گے تو گھر بھی بن جائے گا۔ مجھے تمہارے مسلمان ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں باقی گھر والوں کو بھی منا لوں گی۔'' خالہ نے میری کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی تو انہوں نے ہاتھ اٹھا لیا۔

''خالہ! مجھے شادی نہیں کرنی ہے۔ نرما بہت اچھی لڑکی ہے اور میں اسے ایک بہن کی طرح سمجھتا ہوں۔ میں نے تو یہاں رہنا بھی نہیں ہے۔ گلو دادا نے شاید آپ کو بتایا نہیں ہے کہ میں نے صرف ایک مہینہ ہی کام کرنا ہے اس کے بعد میں ایران چلا جاؤں گا۔ میں تو امریکہ جانے کا راستہ تلاش کر رہا ہوں۔'' میں نے خالہ کو مختصر جواب دیا۔

''بیٹا! تم نرما سے شادی کر لو اور اس کے بعد ایران چلے جانا۔ نوید بھی مسقط جا رہا ہے، تم بھی اس کے ساتھ ہی چلے جانا۔'' خالہ سیدھی سادھی عورت تھی۔ انہیں امریکہ اور مسقط کا فرق نہیں معلوم تھا۔ ان کے خیال میں امریکہ بھی مسقط کے نزدیک ہی کہیں ہو گا۔ تیس چالیس ہزار میں پہنچ جانا ہو گا۔

''بیٹا! میرے پاس تھوڑے بہت پیسے ہیں۔ ہم تمہارے جانے کے پیسے بھی دے دیں گے۔'' وہ ابھی تک مجھے منانے میں لگی ہوئی تھیں۔

''خالہ! مجھے نرما سے شادی نہیں کرنی ہے۔'' میں نے خالہ کو صاف جواب دیتے ہوئے کہا تو وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

''راضی بیٹا! ایک بار سوچ لینا۔ نرما بہت اچھی لڑکی ہے۔ ہم یہ کام بھی چھوڑ دیں گے۔'' انہوں نے ٹائلٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ ایک آخری کوشش کر رہی تھیں۔

'' خالہ! سب کچھ ٹھیک ہے لیکن میں شادی ہی نہیں کرنا چاہتا۔ میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔'' میں نے خالہ سے کہا اور اٹھ کر ایک گاہک کو لوٹا پکڑانے لگا۔ لوٹا دینے کے بعد میں واپس بیٹھا نہیں بلکہ ٹائلٹ کی صفائی کرنے لگا۔ خالہ تھوڑی دیر تک ادھر ہی بیٹھی رہیں اس کے بعد اٹھ کر گھر چلی گئیں۔ ایک گھنٹے بعد نرما آ کر میرے پاس بیٹھ گئی۔ میں خاموشی سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔

''راضی! ناراض ہو؟'' جب میں اا یسے ہی خاموش بیٹھا رہا تو نرما پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

'' نرما! میں ناراض نہیں ہوں۔ میری کوئی حیثیت نہیں ہے ناراض ہونے کی۔ میں کون ہوتا ہوں ناراض ہونے والا؟''

'' راضی! مجھے معلوم ہے تم کسی اور سے محبت کرتے ہو۔ بہت محبت کرتے ہو لیکن میں ایک کوشش کرنا چاہتی تھی۔ محبت کرنا یا نا کرنا یہ تمہارا اختیار ہے۔ تم مجھ سے شادی کرو یا نا کرو یہ تمہاری اپنی مرضی ہے۔ لیکن تم مجھ کو تو محبت کرنے سے نہیں روک سکتے۔ جب تم میرے کچھ لگتے ہی نہیں ہو تو پھر مجھے کیوں روک رہے ہو؟ مجھے کوشش کرنے دو! کل کو مجھے اس چیز کا ملال تو نہیں رہے گا کہ اگر میں کوشش کرتی تو شاید کامیاب ہو جاتی، شاید زندگی کچھ اور ہی طرح سے گزرتی۔ راضی صاحب! یہ محبت ہے اس میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ انسان جب اس محبت کے لئے اپنا مذہب بھی تبدیل کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے تو پھر اس سے آگے کچھ بھی نہیں بچتا۔ مجھے کوشش کرنے دو راضی صاحب! یہی محبت ہے۔'' نرما نے آگے بڑھ کر میرے گالوں پر اپنے ہونٹ ثبت کر دیئے اور پھر گھر کی طرف چل پڑی۔ روڈ پر چلنے والے لوگ نرما کی اس حرکت سے رک گئے تھے اور حیرانگی سے میری طرف دیکھنے لگے۔

''راضی صاحب! یہ محبت ہی ہوتی ہے جو انسان کو اتنا بہادر بنا دیتی ہے۔'' نرما نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا اور دوبارہ چل پڑی۔ میں خاموشی سے کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ رات کو نوید آ گیا۔ اس نے میرے ساتھ مل کر کام کو بند کیا اور ہم دونوں اکٹھے ہی گھر کی طرف چل پڑے۔

''راضی بھائی! اس مہینے کی تنخواہ لے کر میں چلا جاؤں گا۔ بس دعا کرنا کہ میں خیریت سے مسقط چلا جاؤں۔ چار پیسے کما کر گھر بھیجوں گا تو بہنوں کی شادیاں خیریت سے ہو جائیں گی۔'' نوید نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''نوید یار! اگلے مہینے میں بھی تنخواہ لے کر چلا جاؤں گا۔ میں نے بھی ایران جانا ہے۔ میں گلی کے درمیان میں

رک گیا۔

''راضی بھائی! آپ بھی مسقط جا رہے ہو؟'' نوید نے حیرت سے کہا۔

''نہیں یار! میں ایران جا رہا ہوں۔ وہاں سے پھر آگے ترکی جاؤں گا۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن بھائی! ترکی کے لئے تو ایک لاکھ سے زیادہ پیسے لگتے ہیں۔ آپ اتنے پیسوں کا کیسے انتظام کرو گے۔'' نوید ابھی تک حیران ہو رہا تھا۔

''نہیں یار! میں صرف ایران ہی جاؤں گا۔ ایران میں کام کروں گا تو پھر آگے کا بھی انتظام ہو جائے گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کی ایران جانے کے لئے ایجنٹ سے بات کروں گا۔ دیکھتا ہوں وہ کتنے پیسے مانگتا ہے۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔۔۔ تم بات کر لینا! اگر کم پیسے ہوئے تو میں چلا جاؤں گا۔'' نوید نے ایجنٹ سے بات کرنے کا کہا تو میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملا دی۔

دو دن بعد نوید کی اتوار کی چھٹی تھی تو وہ صبح صبح ہی ایجنٹ کے پاس چلا گیا۔ اس کی واپسی بارہ بجے کے بعد ہوئی۔

''راضی بھائی! ایجنٹ سے بات ہو گئی ہے وہ دس ہزار روپیہ مانگ رہا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کم کرنے کی لیکن وہ مان ہی نہیں رہا تھا۔ آخر نو ہزار میں مانا ہے۔ آپ کو مہینے کے آخر پر پانچ ہزار ملیں گے تو میں بھی آپ کو پانچ ہزار دے دوں گا۔ نو ہزار ایجنٹ کے ہو جائیں گے اور ایک ہزار آپ کے ایران میں کام آ جائیں گے۔'' نوید نے میرے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار! آپ پیسے مت دو میں بغیر ایجنٹ کے ہی چلا جاؤں گا۔ میں نے پتہ کیا ہے، پاکستان ایران کا بارڈر اتنا سخت نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ادھر تار بھی نہیں لگی ہوئی، کوئی نشان وغیرہ بھی نہیں ہے۔''

پاکستان کی ساری آرمی اور بارڈر سیکورٹی فورسز کراچی اور انڈیا کے بارڈر پر لگی ہوئی تھیں۔ ایران اور

افغانستان کا بارڈر کھلا تھا اور ادھر کوئی سختی نہیں تھی۔ چین کی طرف سے بارڈر کراس کرنا تو گلیشئر اور دشوار گزار پہاڑی سلسلوں کی وجہ سے تقریباً ناممکن تھا اس لئے ادھر ایک فیصد بھی سیکورٹی نہیں تھی۔ افغانستان اور ایران کے بارڈر پر کچھ آرمی ہوتی ضرور تھی وہ بھی کچھ مخصوص راستوں پر جہاں سے سامان ادھر ادھر آتا جاتا تھا۔ باقی پورا بارڈر ایسے ہی کھلا پڑا ہوا تھا۔ یہ گیارہ سال پہلے کی بات ہے۔ اکبر بگٹی کے مرنے سے پہلے حالات ٹھیک تھے لیکن بلوچستان کے حالات بہت خراب ہوئے تو ایران نے سختی کر دی تھی۔

''نہیں راضی بھائی! آپ میرے ساتھ ہی جائیں گے۔ ایجنٹ کے بغیر بلوچستان جانا اور بارڈر کراس کرنا بہت خطرناک ہے۔ بلوچیوں سے اگر بچ بھی گئے تو ایران والے ادھر بارڈر پر ہی گولی مار دیتے ہیں۔ راضی بھائی! آپ میرے ساتھ ہی چلیں گے۔ پیسوں کی کوئی بات نہیں ہے، میں آپ کے بھی پیسے دے سکتا ہوں۔'' وہ ضد کرنے لگا تو میں مان گیا۔

نوید شام چار پانچ بجے تک میرے پاس ہی بیٹھا رہا اور اس کے بعد کرکٹ کھیلنے چلا گیا۔ نوید کے جانے کے ٹھیک آدھے گھنٹے بعد نرما آ گئی۔

''راضی صاحب! سنا ہے ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہو؟ دیکھ لو! کہیں تمہاری لیلیٰ پیچھے تمہارے فراق میں مر ہی نہ جائے۔'' وہ شوخی سے بولنے لگی۔

''نرما پلیز! میں نے کہا ہے نا تجھ سے کہ میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں، اور بس! میں مزید کچھ بھی سننا نہیں چاہتا۔'' میں نے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔ نرما نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور پھر دوبارہ مسکرانے لگی۔

''جی جی راضی صاحب! ہم آپ کی محبت کی عزت کرتے ہیں۔ قسم سے بہت عزت کرتے ہیں لیکن آپ بھی تو ہماری محبت کی عزت کریں۔'' نرما نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

میں اٹھ کر ٹائلٹ کے پاس چلا گیا اور صاف شدہ ٹائلٹ کو پھر صاف کرنے لگا۔ میں صرف اپنے آپ کو مصروف رکھ کر نرما سے بچنا چاہتا تھا۔ وہ بے چاری معصوم سی لڑکی ایسے ہی محبت کی آگ میں جلنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''راضی!'' میں ٹائلٹ کے اندر فرش صاف کر رہا تھا جب اچانک نرما اندر آ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

''راضی! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔'' وہ مجھ سے لپٹی مسلسل بولے جا رہی تھی۔

مجھے نرما سے اتنی ہمت کی توقع نہیں تھی۔ کراچی جیسے بڑے شہر کے اسٹیشن پر آنے جانے والے لوگوں کا رش رہتا تھا۔ کسی بھی وقت کوئی بھی آ سکتا تھا۔ سڑک کے اوپر ٹائلٹ بنے ہوئے تھے۔ سڑک سے گزرنے والے لوگ اگر ہم دونوں کو ایک ٹائلٹ میں دیکھ لیتے تو پھر وہیں سڑک پہ ہی مار دیتے۔

یورپی ممالک میں رہنے والے لوگوں کو شاید اس چیز کا احساس نہ ہو لیکن پاکستان میں رہنے والوں کو اس چیز کا پتہ ہے کہ پاکستان میں ہر چیز کی اجازت ہے لیکن ایک غیر محرم لڑکی اور لڑکے کے اکٹھا رہنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ لوگ محبت کرنے والوں کو جان سے مار دیتے ہیں۔ میں شاک میں آ گیا تھا۔ نرما ابھی تک مجھ سے لپٹی ہوئی تھی۔

''میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔ خدا کے لئے راضی! میں ساری زندگی تمہارا انتظار کر سکتی ہوں۔ بس ایک بار مجھ سے محبت کا اظہار کر لو۔''

''نرما! یہ کیا کر رہی ہو؟ تمہیں پتہ ہے کہ اگر لوگوں نے ہمیں اس حالت میں دیکھ لیا تو دونوں ادھر ہی مارے جائیں گے؟'' میں نے نرما کو دھکا دے کر خود سے علیحدہ کیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

''تو پاگل ہے، بالکل پاگل ہے۔ کسی کی عزت کا بھی خیال ہے تم کو؟'' نرما جب باہر نکلی تو میں غصے سے پھٹ پڑا۔

''نہیں! کسی کی عزت کا احساس نہیں ہے مجھے۔۔۔ تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ صرف تم کو ہی محبت کرنا آتا ہے؟ اس دنیا میں صرف تم ہی اس محبت کا جھنڈا اٹھانے والے آخری مرد ہو؟'' نرما بھی غصے سے چلانے لگی۔ سڑک پر چلنے والے لوگ اب کھڑے ہو کر نرما کو غصے سے چلاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

''نرما پلیز! تم ابھی ادھر سے گھر چلی جاؤ! ورنہ میں کام چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ دو کروڑ کی اس آبادی والے شہر میں کوئی تو کام دے ہی دے گا۔'' میں نے نرما کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تو وہ خاموش ہو گئی۔

''راضی! محبت کرتے ہو؟ دھمکی دیتے ہو کام چھوڑنے کی؟ میں جانتی ہوں کہ اگلے مہینے تم کام چھوڑ کر ایران جا رہے ہو۔ ایک مہینہ تم ادھر ہمارے پاس ہی ہو اور یہ مہینہ میرا ہے۔ اگر تم اس ایک مہینے سے ایک دن پہلے بھی کہیں گئے تو یقین کر وان ٹائلٹوں کے سامنے اسی روڈ پر جان دے دوں گی۔ مہینے سے پہلے جا کر دکھاؤ!'' اس نے ایک ہلکا سا تھپڑ میرے چہرے پر مارا اور گھر کی طرف چل پڑی۔

میں نے بے اختیار اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ لیا۔تھپڑ تو اس نے آہستگی سے مارا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے بہت زور سے لگا تھا۔نرما نے اس کے بعد مجھے بلانا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ میں نے بھی اس سے بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ کچی محبت ہے۔میرے جانے کے بعد وہ صرف دو چار دن غمگین رہتی اس کے بعد سب کچھ بھول جاتی۔

مہینہ ختم ہوا تو شیرو چاچا نے مجھے 5 ہزار روپے دے دیئے۔اگلے دن نوید کو بھی تنخواہ مل گئی۔ میں نے 5 ہزار اس کو دیا تو اس نے اس میں مزید 4 ہزار ملایا اور 9 ہزار کر کے ایجنٹ کو دے دیا۔ایجنٹ نے ہمیں دو تین دن انتظار کرنے کا کہا۔اب جب تک ایجنٹ نے انتظار کرنے کا کہا تب تک میں کام پر ہی جا تا رہا۔

میں روزانہ صبح کام پر چلا جاتا تھا۔شیرو چاچا منع کرتے تھے لیکن میں پھر بھی کام پر جاتا رہا۔ ویسے بھی ان لوگوں نے مجھے اضافی 5 ہزار دیے تھے تو پھر میرا بھی حق بنتا تھا کہ ان لوگوں کی خدمت کرتا۔میرے اوپر اس عیسائی فیملی کے بے شمار احسانات تھے اور میں ان کا بدلہ اتارنا چاہتا تھا۔شاید یہی بدلہ اتارنے کی کوشش خدا کو پسند آ گئی تھی اور مجھے ایک بار پھر محبوب کی زیارت بخش دی۔ ہاں! ادھر میں نے کراچی میں ایک بار پھر ایمان کو دیکھ لیا تھا۔میرا محبوب میری محبت ایمان مجھے اسٹیشن پر مل گئی تھی۔

وہ اکتوبر کی 3 تاریخ تھی۔سردیوں کی آمد آمد تھی اس لئے موسم کافی خوشگوار تھا۔درختوں سے پتے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے سڑک پر بکھرے ہوئے تھے۔ پیلے پیلے پتے نظروں کو بہت بھلے لگ رہے تھے۔اکتوبر کا یہ دن باقی دنوں سے زیادہ خوبصورت لگ رہا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ خالہ خالی برتن اٹھا کر لے گئی تھی۔ جب ایک بڑی سی گاڑی آ کر رکی اور اس میں سے ایک موٹا اور کالا سا آدمی اترا۔ وہ مکرانی تھا۔گھنگھریالے بال چپٹی ناک اور بڑے بڑے ہونٹ اس کا رنگ بہت زیادہ کالا تھا۔لیکن اس کے جسم پر انتہائی نفیس سوٹ تھا۔تھری پیس کالا سوٹ اور اس کے نیچے کالے رنگ کے دفتری شوز۔ وہ اندازے سے بھی زیادہ امیر لگ رہا تھا۔

''ہیلو سر! کیا ادھر لیڈیز ٹائلٹ کی سہولت موجود ہے؟'' اس آدمی نے انتہائی اخلاق سے کہا تو میں حیران رہ گیا۔وہ بڑی سی گاڑی کا سوٹڈ بوٹڈ آدمی مجھے سر کہہ کر بلا رہا تھا۔

''جی جی سر! آپ ایک منٹ ٹھہرو میں ایک ٹائلٹ صاف کر دیتا ہوں اور پانی وغیرہ بھی رکھ دیتا ہوں۔'' میں

اس آدمی کے اخلاق سے بہت متاثر ہو گیا تھا۔

ہم ٹائلٹ والوں کو لوگ انتہائی حقیر سمجھتے تھے۔عزت دینا تو بہت دور کی بات ہے لوگ سیدھے منہ سے بات بھی نہیں کرتے تھے اور یہ شخص تمیز سے بات بھی کر رہا تھا اور عزت بھی دے رہا تھا۔

''سر! صرف ایک منٹ میں انتظام کرتا ہوں۔'' میں نے ٹائلٹ صاف کرنے والا برش اور کپڑا پکڑا اور ٹائلٹ کی طرف بڑھنے لگا۔

''راضی!'' کار کا دروازہ کھلا اور ایمان کی آواز سنائی دی۔میرے ہاتھ سے دونوں چیزیں گر گئیں۔

وہ ایمان ہی تھی جو آہستگی سے کار میں سے نیچے اتر رہی تھی۔میں اپنی جگہ پر پتھر کی طرح جم کر رہ گیا تھا۔وہ واقعی ایمان تھی۔وہی ایمان جس کی ایک جھلک کے لئے میں پچھلے ایک سال سے تڑپ رہا تھا۔پچھلے ایک سال کا ایک ایک پل ایک ایک لمحہ میں نے ایمان کی محبت کے لئے تڑپ تڑپ کر گزارا تھا۔آج وہی ایمان میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''راضی کیسے ہو؟ ارم کیسی ہے؟ عامر کیسا ہے؟ خالہ کیسی ہیں راضی!'' اس نے ابو کا حال نہیں پوچھا تھا۔شاید ابھی تک ابو سے ناراض تھی۔

میرے حلق میں ایک گولہ سا بن گیا تھا۔مجھ سے بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔کوئی الفاظ ہی ذہن میں نہیں آ رہے تھے۔ایسا لگ رہا تھا جیسے مجھے بولنا ہی نہیں آتا ہے۔

''کدھر کھو گئے ہو؟'' ایمان نے آگے بڑھ کر میرے گالوں کو نرمی سے چھوتے ہوئے کہا تو مجھے جیسے ہوش آ گئی لیکن اب کی بار میں نے اپنی آنکھوں کو بند کر لیا۔ایمان کے ہاتھوں کا لمس میں اپنی روح کی اتھاہ گہرائیوں میں اتارنا چاہتا تھا۔

اس چیز کا احساس صرف محبت کرنے والے ہی کر سکتے ہیں۔پوری دنیا کے دکھ اور تکلیفیں محبوب کے ایک لمس سے ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ایمان کو میری حالت کا اندازہ تھا۔وہ بھی اسی آگ میں جل رہی تھی۔میرے سینے میں سانس اٹکنے لگی تو اس نے میرے گالوں سے ہاتھ اٹھا لیا۔

''راضی ادھر کیا کر رہے ہو؟'' ایمان نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایمان!'' ابھی میں کچھ کہنے ہی والا تھا جب وہ مکرانی آدمی درمیان میں آ گیا۔

''ایمان! آپ اس کو جانتی ہو؟'' میں نے پھر اس شخص کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا اور پھر شرمندگی سے نظریں جھکا لیں۔

میں جس جگہ پر کھڑا تھا اور جو کام کر رہا تھا۔ ایمان تو مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر سکتی تھی۔ مجھے نہیں پتہ تھا وہ آدمی کون ہے لیکن ایمان اس کے ساتھ آئی تھی اور میں ٹائلٹ پر کام کر رہا تھا۔ میں نے بے چارگی سے ایمان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

''واصف! یہ راضی ہے۔ میرا محبوب، میں اس سے محبت کرتی ہوں۔'' ایمان نے دھماکہ کر دیا تھا۔ وہ آدمی جلدی سے آگے بڑھا اور مجھے گلے سے لگا لیا۔

''راضی آپ ہو؟ ایمان کی محبت۔۔۔ایمان آپ سے محبت کرتی ہے؟'' تھری پیس والا شخص مجھ سے لپٹ گیا۔ مجھے ایمان کے جسم کی خوشبو اس کے جسم سے آنے لگی اور وہی شخص مجھے دنیا کا سب سے خوبصورت آدمی لگنے لگا۔

''راضی! آپ بہت قسمت والے ہو کہ ایمان جیسی لڑکی کی محبت آپ کو ملی ہے۔'' وہ شخص بار بار میرے گالوں پہ ہاتھ لگا رہا تھا۔

''ایمان! چلو گھر چلتے ہیں۔ سب گھر والے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ یا پھر میں ادھر کراچی میں ہی کوئی گھر دیکھ لیتا ہوں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''نہیں راضی! میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ محبت تو ساری زندگی تم سے ہی کرتی رہوں گی لیکن تمہارے ساتھ رہ کر میں تمہاری زندگی خراب نہیں کر سکتی۔'' ایمان نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایمان! تمہارے بغیر میری زندگی کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر تم ساتھ رہو گی تو میں ساری دنیا تمہارے قدموں میں لا کر رکھ دوں گا۔'' میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''نہیں راضی! میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ اس دنیا میں ہمارا ملن لکھا ہی نہیں ہے۔'' ایمان نے مجھے آگے بڑھنے سے روک دیا۔

''ایمان! تمہیں معلوم ہے نا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں؟ آج تمہاری اس محبت کی وجہ سے ہی میں دردر کے دھکے کھا رہا ہوں۔ پلیز ایمان! میں تھک گیا ہوں۔۔۔ چلو اب گھر چلتے ہیں!'' میں نے ایمان کو بازو سے پکڑتے ہوئے کہا۔

''راضی! میں شادی شدہ ہوں، میں نے واصف سے شادی کر لی ہے۔'' ایمان نے اس آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ایمان! شادی تو تمہاری اسلم سے بھی ہوئی تھی اور جب تم اس شادی کو نہیں مانتی تھی تو آج اس شادی کو کیسے مان رہی ہو۔'' میں نے واصف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''راضی! وہ شادی میری مرضی کے بغیر ہوئی تھی جبکہ میں نے واصف سے شادی اپنی مرضی سے کی ہے۔ یہ بہت اچھے انسان ہیں اور مجھ سے محبت بھی کرتے ہیں۔'' ایمان کا بازو ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔

''ایمان! تم سے تو پوری دنیا ہی محبت کرتی ہے، بات تمہاری محبت کی ہے کہ تم کس سے محبت کرتی ہو؟'' میں نے اس کے بازو کو ہلاتے ہوئے کہا۔

''ایمان! مجھے صرف تمہاری خوشی ہی عزیز ہے۔ تم راضی سے شادی کرنا چاہتی ہو تو میں خود تمہاری شادی راضی سے کروا دوں گا اور تم دونوں کو کراچی میں ایک اچھا گھر بھی لے کر دے دوں گا۔'' ایمان کے شوہر واصف نے ایمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''واصف صاحب! میں آپ کی بیوی ہوں اور آپ کی دل سے عزت کرتی ہوں۔'' ایمان نے واصف کو درمیان میں ٹوکتے ہوئے کہا۔

''نہیں ایمان! مجھے صرف تمہاری خوشی ہی عزیز ہے۔ تم راضی سے محبت کرتی ہو اور اسی کے ساتھ ہی خوش رہو گی۔'' واصف نے ایمان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''پلیز! صرف ایک بار۔۔۔ میں سب کچھ چھوڑ دوں گا، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ صرف تمہارا ساتھ ہی میرے لیے کافی ہے۔'' میں نے بے اختیار ایمان کے پاؤں پکڑ لیے۔

''ایمان! میں مر رہا ہوں، قطرہ قطرہ کر کے مر رہا ہوں۔ یہ درد میری برداشت سے باہر ہے۔ تمہاری قسم مجھے خودکشی کرنے سے روک رہی ہے۔ اس سے موت ہزار درجے بہتر ہے۔'' میں ایمان کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا۔

''راضی! جب انسان کی روح پر زخم لگتا ہے تو اس کی تڑ اس ساری زندگی انسان کے اندر محسوس ہوتی ہے۔ وہ صرف تمہارا ہی باپ نہیں تھا بلکہ میرا بھی باپ تھا۔ اس شخص کی عزت اور نفاست کی میں قسمیں دے سکتی تھی لیکن معلوم ہے نا کہ میرے ساتھ کیا کچھ ہوا تھا؟'' ایمان مجھ سے تھوڑا دور ہو کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''راضی! تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں ہے، اس دن اس کمرے میں بہت کچھ ہوا تھا۔ تم نے تو اس کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی لیکن میں اس باپ کے وحشیانہ پن کو جھیل چکی ہوں۔ راضی! اس دن صرف کپڑے ہی نہیں پھٹے تھے اور بھی بہت کچھ ہوا تھا۔ وہ سب کچھ کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔'' ایمان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ رونے لگی۔

''میں تمہارے ساتھ اس دنیا میں نہیں رہ سکتی راضی! لیکن مرنے کے بعد دوسری دنیا میں صرف اور صرف تم ہی میرے محبوب رہو گے۔ ایمان تمہاری تھی اور ہمیشہ تمہاری ہی رہے گی۔'' وہ ابھی بھی رو رہی تھی۔

''ایمان! یہ زندگی بہت لمبی ہے اور میں جینا ہی نہیں چاہتا ہوں۔ میں اتنا انتظار نہیں کر سکتا۔ مجھے مرنے کی ہی اجازت دے دو! صرف ایک یہی احسان کر دو اپنے راضی پر۔۔۔'' میں نے ایمان کے ہاتھ باندھ دیے۔

''نہیں راضی! محبت اتنی آسانی سے نہیں ملتی۔ اگر محبت کرتے ہو تو اس کے لئے کچھ درد بھی اٹھا کر دیکھ لو۔'' ایمان نے میرے دونوں ہاتھوں کو پکڑا اور مجھے اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔

''راضی! تمہارے ساتھ میں تمہارے گھر میں نہیں رہ سکتی۔ میں تمہارے والد کی نظروں کا سامنا نہیں کر سکتی اور تمہیں اس گھر سے دور نہیں لے جا سکتی۔ تم پر میرے علاوہ اس گھر کا بھی حق ہے۔ تمہارے بہن بھائی اور تمہاری ماں۔۔۔ اس غربت کی دنیا سے باہر نکلو اور ان کو ایک اچھی زندگی دو کیونکہ ان کا بھی تم پہ حق ہے۔ امریکہ جاؤ گے نا؟'' ایمان نے میرے ہاتھ چھوڑے تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ایمان! آپ راضی کی ایمان ہونا؟ یہ بہت پیار کرتا ہے آپ سے؟'' نرما پتہ نہیں کب سے ادھر آ گئی تھی۔ اس نے مجھے ایمان کے سامنے گڑگڑاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ایمان نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور مسکرانے لگی۔

''راضی! کہیں دل تو نہیں لگا بیٹھے ہو؟ لڑکی تو بہت خوبصورت ہے۔'' ایمان کی روایتی شوخی واپس آ گئی تھی۔

''نہیں! میرے پاس دل ہی نہیں ہے۔ میں نے محبت کرنا چھوڑ دیا ہے۔'' میں آہستہ سے چلتا ہوا جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

''دو روپے واش روم جانے کے ہیں صاحب! میڈیم کو بولو واش روم چلی جائیں اور پلیز! آپ لوگ بھی اپنے اپنے کاموں پر جائیں، میری دکان داری خراب ہو رہی ہے۔'' میں نے اونچی آواز میں کہا تو لوگوں کا ہجوم آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا۔

ایمان ابھی تک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں ایسے ہی برتن سے سکے نکال کر گننے لگا۔ ایمان آہستگی سے چلتی ہوئی میری کرسی کے پیچھے آ گئی اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

''راضی امریکہ جا رہے ہو نا؟''

''ہاں! ایران تک جانے کے لئے ایجنٹ کو پیسے دے دیئے ہیں۔ باقی ایران جا کر کام کروں گا تو پھر آگے کا بھی راستہ مل جائے گا۔'' میں نے سکے واپس برتن میں رکھ دیئے۔

''واصف! کتنے پیسے ہیں آپ کے پاس؟'' ایمان نے واصف کو کہا تو وہ جلدی سے آگے آ گیا۔

''بارہ ہزار سے کچھ زیادہ ادھر گاڑی میں پڑے ہوئے ہیں۔'' وہ جلدی جلدی بول رہا تھا۔

''ایک گھنٹہ لگے گا گھر میں چھ سات لاکھ پڑے ہوئے ہیں۔ میں لا کر دے دیتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے! جو موجود ہیں وہ دے دو۔'' ایمان نے واصف سے کہا۔

''راضی! کتنے پیسے چاہئیں تمہیں؟ چھ سات لاکھ سے تھوڑا حوصلہ تو ہو جائے گا نہ آپ کو۔'' ایمان میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''ایمان! محبت بھی کرتی ہو اور اس کی توہین بھی کرتی ہو۔ پیسوں کی بات کر کے میری توہین مت کرو۔'' اتنے

میں واصف آ گیا۔

''یہ لو ایمان! پندرہ ہزار چھ سو بانوے روپے ہیں۔'' وہ گاڑی کے ڈیش بورڈ کے سامنے پڑے ہوئے سکے بھی اٹھا کر لے آیا تھا۔ اس نے سارے پیسے ایمان کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیئے اور خالی بٹوا جیب میں ڈال لیا۔

''مجھے یہ پیسے نہیں چاہئیں ایمان! میں جب گھر سے نکل آیا ہوں تو آگے کا راستہ بھی مل جائے گا۔ خواب تو تمہارا ہے لیکن اسے پورا میں کر کے دکھاؤں گا۔ تمہارا راضی ایک دن اس مجسمے کے پیروں کے نیچے کھڑا ہو کر تمہاری محبت مانگے گا۔ میری محبت میں بہت طاقت ہے ایمان! اور یہ محبت تجھے اسی دنیا میں میرے پاس لائے گی۔'' میں کھڑا ہو کر جانے لگا تو ایمان نے میرا بازو پکڑ کر روک لیا۔

''راضی! پیار کرنے والوں کی کسی چیز کا انکار نہیں کرتے۔ محبوب کا تحفہ ہے۔ محبت سے دے رہی ہوں تو رکھ لو۔'' پتہ نہیں اس پری پیکر کی آنکھوں میں کونسا جادو تھا۔ میں نے اپنی نظروں کو جھکا دیا۔

''ٹھیک ہے راضی! میں جا رہی ہوں۔ دیکھتے ہیں محبت اور کون کون سے رنگ دکھاتی ہے۔'' وہ جانے کے لے اٹھ کھڑی ہوئی اور آہستہ آہستہ گاڑی کی طرف چلنے لگی۔

''ایمان! اگر میں امریکہ پہنچ گیا تو ایک بار وہاں سے تمہیں کراچی ڈھونڈنے ضرور آؤں گا۔ تمہیں اپنے ساتھ امریکہ لے جانے کے لئے۔۔۔۔ وعدہ کرو کہ تم انکار نہیں کرو گی؟'' میں نے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ ایمان مسکرانے لگی۔

''راضی! گلے نہیں ملو گے مجھ سے؟'' اس نے اپنی بانہوں کو کھولا تو میں بے اختیار اس کی بانہوں میں سما گیا۔ ایمان میرے گلے سے لگی میری پیٹھ کو تھپتھپا رہی تھی۔ میری آنکھوں سے ایک بار پھر آنسوؤں کی قطار لگ گئی لیکن میں نے ان آنسوؤں کو بہنے دیا۔ یہ محبت کے آنسو تھے اور ان آنسوؤں کی بہت قیمت تھی۔

''راضی! جس دن امریکہ پہنچ جاؤ گے نا اس دن مجھے یاد ضرور کر لینا۔ میں نے زندگی میں صرف دو چیزوں سے محبت کی ہے ایک تم ہو اور دوسرا امریکہ۔ میں موت سے پہلے زندگی میں صرف ایک بار امریکہ دیکھنا چاہتی ہوں۔'' وہ مجھ سے الگ ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''ایمان! اگر میں امریکہ پہنچ گیا تو کیا تم میرے ساتھ امریکہ میں رہو گی؟'' میں نے کار کا شیشہ پکڑتے

ہوئے کہا تو وہ مسکرانے لگی۔

''راضی! جنت میں حوریں بہت ہوتی ہیں اور امریکہ بھی تو جنت ہی ہے نا؟ ہم جیسے غریب لوگوں کو کہاں یاد رکھو گے۔''

''نہیں ایمان! میں دنیا کے کسی بھی کونے میں چلا جاؤں، اسی نوے سال کا بوڑھا ہی کیوں نہ ہو جاؤں۔ محبت تو ہمیشہ تم سے ہی کروں گا۔'' کار آہستہ آہستہ چلنے لگی تھی اور میں کار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

''راضی! ایک بار امریکہ پہنچ جاؤ پھر دیکھتے ہیں۔ اپنا خیال رکھنا راضی! ایمان تم سے محبت کرتی ہے۔'' اس نے میرے گالوں کو چھوا اور کار کی رفتار آہستہ آہستہ تیز ہوتی ہوئی بہت تیز ہو گئی۔

میں صرف تھوڑی دیر ہی کار کے ساتھ بھاگ سکا اس کے بعد کار فل سپیڈ سے سڑک پر دوڑنے لگی اور تھوڑی ہی دیر بعد میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں سڑک کے کنارے بیٹھتا چلا گیا۔ پتہ نہیں کتنا ٹائم گزرا شاید ایک لمحہ یا شاید بہت سارا ٹائم مجھے ٹائم کا کوئی اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں سڑک کے کنارے بیٹھا روتا رہا۔ لوگ اب ایک ایک کر کے وہاں سے جا رہے تھے۔

''راضی اٹھ جاؤ یار! زندگی تو گزارنی ہی ہے۔۔۔ کب تک ایسے ہی سڑک کے کنارے بیٹھے رہو گے؟'' نرما نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو میں نے سر اٹھا کر نرما کی طرف دیکھا۔ وہ معصوم سی خوبصورت لڑکی بھی میری اور ایمان کی محبت دیکھ کر رو پڑی تھی۔

''اٹھ جاؤ راضی! واقعی تمہاری محبت اس دنیا سے بہت بڑی ہے۔ دیکھ لینا خدا ایک دن تم دونوں کو ضرور ملائے گا۔'' اس نے میرے آنسوؤں کو ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

''راضی! خدا ہمیشہ اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے۔ ایک دن تمہاری بھی باری آ جائے گی۔'' وہ چھوٹی سی لڑکی آج بڑی بڑی باتیں کر رہی تھی۔

''نرما! مجھے معاف کر دینا۔ جانے انجانے میں شاید میں نے تمہارا بھی دل دکھا دیا ہے۔'' میں نے نرما کے آگے ہاتھ باندھ لئے۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔

''راضی! معافی تو مجھے آپ سے مانگنی چاہیے۔ مجھے آپ کی محبت کی شدت کا اندازہ نہیں تھا۔'' نرما آہستگی سے میری کمر تھپتھپانے لگی۔

تھوڑی دیر تک میں نارمل ہو گیا تو میں نرما کے پاس سے اٹھا اور جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ آنے جانے والے گاہکوں کو اب نرما ہی ڈیل کر رہی تھی۔ شام تک میں بالکل ٹھیک ہو گیا تو میں نے نرما کو گھر بھیج دیا اور خود کام سنبھالنے لگا۔

رات کو میں نے کھانا کھا کر نوید کے پانچ ہزار واپس کر دیئے۔ میرے پاس ابھی بھی ایجنٹ کے نو ہزار نکال کر گیارہ ہزار سے اوپر روپے تھے۔ دوسرے دن صبح صبح میں منی چینجر کی دکان پر گیا اور وہاں سے ساڑھے دس ہزار کے ڈالر خرید لیے۔ اس زمانے میں ڈالر 60 روپے کا تھا لیکن منی چینجر والے نے مجھے 65 روپے کے بدلے میں ایک ڈالر فروخت کیا۔ 10500 روپے کے بدلے میں مجھے منی چینجر والے نے بیس بیس ڈالر والے آٹھ نوٹ دیئے۔

ایران کی مقامی کرنسی ایرانی تمن اس وقت بہت نیچے گری ہوئی تھی۔ پاکستانی ایک روپے کے مقابلے میں ایرانی 1400 سے اوپر آتے تھے اور دس ہزار کی ایرانی کرنسی لاکھوں میں بنتی تھی۔ اتنی بڑی رقم میں چھپا نہیں سکتا تھا جبکہ اس کے مقابلے میں ڈالر انٹرنیشنل کرنسی تھی اور یہ پوری دنیا میں کہیں بھی چلتی تھی۔ بیس بیس ڈالر کے صرف آٹھ نوٹ کپڑوں اور جوتوں میں چھپانا آسان تھا۔ ڈالر تو سو اور پچاس کے صرف دو ہی بہت تھے لیکن جتنا بڑا نوٹ ہوتا ہے اس کو چینج کروانے میں اتنی ہی پرابلم ہوتی ہے۔ اس لیے میں صرف بیس بیس ڈالر کے آٹھ نوٹ لے کر گھر آ گیا۔

اب ان نوٹوں کو چھپانے کی باری تھی۔ نوید بھی دس ہزار کے ڈالر لے کر آیا تھا اور وہ انہیں بوٹوں کے نیچے تلووں کے اندر چھپانے پر مصر تھا لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔ مجھے معلوم تھا پورے ایران میں گھروں میں قالین بچھے ہوتے ہیں اور وہاں آپ کمرے سے باہر جوتے اتار کر آتے ہیں۔ سولڑکے ایک ایک کمرے میں ہوتے ہیں تو کمرے کے باہر وہی جوتے ہوں گے۔ چھوٹی لانچ میں چالیس پچاس سے زیادہ لڑکے نہیں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ بارڈر اور شہروں سے باہر مختلف چوکیوں کو پیدل ہی کراس کیا جاتا ہے۔

''جوتوں کی بڑی قیمت ہوتی ہے۔ ڈنکی کے دوران بوٹ ٹوٹ جاتے ہیں یا چوری ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ لوٹنے والے سب سے پہلے بوٹوں کو ہی بلیڈ مار کر تلاشی لیتے ہیں۔'' نوید سر کھجانے لگا۔

''نوید صاحب! خالص راجھستانی خون ہوں۔ اگر یہ دو دو ڈالر چوری کرنے والے ایرانی ہم سے پیسے چھین گئے تو ہمارے لیے تو مرنا ہی بہت ہے۔'' میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی تو وہ ایک بار پھر حیرانگی سے سر کھجانے لگا۔

میں نوید کو لے کر بازار چلا گیا اور وہاں سے دو شرٹوں کا سستا لیکن موٹا کپڑا خرید لیا۔ وہ کپڑا ہمیں کوئی تین سو کے قریب ملا۔ میں اس کپڑے کو لے کر اپنے محلے کے ہی ایک درزی کے پاس آ گیا۔ وہ زمانہ سستا تھا، درزی ایک شرٹ سلائی کرنے کے ایک سو بیس یا ایک سو تیس روپے لیتا تھا۔ میں نے کپڑا اس بوڑھے درزی کے سامنے رکھا اور اسے ڈالر شرٹ کی آستین کے بازو اور بٹنوں والی پٹی میں سینے کے لئے کہا اور خود وہیں بیٹھ گیا۔ درزی اپنے کام میں ماہر تھا۔ اس نے ڈالروں کو چپس (بکرم کی ایک قسم ہے۔ جو گرم کرنے سے آپس میں مل اتی ہے۔ درزی حضرات اسے کپڑے پر رکھ کر استری پھیرتے ہیں تو وہ کپرے سے چپک جاتی ہے۔ مجھے اب اس کا صحیح نام یاد نہیں ہے)۔ کے درمیان میں رکھا اور استری سے دونوں چپس کو ملا دیا۔

اس ٹیکنیک سے اس نے کالر بٹن اور آستین کے کفوں کو بنایا اور اس بکرم کو شرٹ میں رکھ کر سلائی کر دی۔ اب اگر کوئی بلیڈ سے کالر کو پھاڑتا بھی تو تب اسے سفید بکرم ہی نظر آتا۔ ڈالر بہت اچھی طرح چپک گئے تھے اور وہ پوری شرٹ اکھیڑنے سے ہی نظر آ سکتے تھے۔ یہ ٹیکنیک صرف ڈالر کے لئے ہی کامیاب تھی کیونکہ ڈالر کا کاغذ کبھی کسی بھی حالت میں خراب نہیں ہوتا۔ اگر کوئی دوسرا کاغذ ہو تو وہ چپک کر خراب ہو جاتا ہے اور پھر وہ بکرم سے علیحدہ نہیں ہوتا بلکہ پھٹ جاتا ہے۔ درزی نے ہم سے 150 روپے کے حساب سے 300 روپے دو شرٹوں کے لئے۔ اس کے بعد ہم ڈنکی لگانے کے لئے تیار ہو گئے۔

اسی دن شام کو ایجنٹ نے ہمیں تیار رہنے کے لئے کہا۔ دوسرے دن شام کو چھ بجے والی بس پر ہماری سیٹیں کنفرم تھیں۔ کراچی سے تربت کا سفر تقریباً دس گھنٹے کا ہے۔ ہم رات کو سفر کرتے اور صبح صبح چار بجے تربت پہنچ جاتے۔ صبح صبح خطرہ بھی کم ہوتا تھا اور ناکے پر موجود پولیس والے بھی تھکے ہوئے ہوتے تھے۔ ان کی ڈیوٹی ختم ہونے والی ہوتی اور وہ زیادہ سختی نہیں کرتے تھے۔ تھوڑے سے پیسے لیتے تھے اور بس کو آگے جانے کی اجازت دے دیتے تھے۔ ساٹھ ستر آدمیوں کی اس بس کو پکڑ کر اگر وہ تھانے لے جاتے تو پھر ان پولیس والوں کا آدھا دن ہمارا کیس بنانے میں ہی صرف ہو جاتا۔

پولیس والے ساری رات کی ڈیوٹی دے کر تھکے ہوئے ہوتے تھے اور ہمیں روک کر اپنی روزی اور نیند خراب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ویسے بھی تربت پاکستان کے اندر ہی آتا ہے اور وہاں جانا کوئی جرم بھی نہیں ہے۔ اگر کبھی پولیس والوں سے پیسے کے معاملے پر جھگڑا ہو جاتا تو پولیس والے پوری بس کو پکڑ کر تھانے میں لے جاتے تھے اور پھر دو تین دن تھانے میں رکھ کر چھوڑ دیتے تھے۔ ایجنٹ کی گیم دو دن لیٹ ہو جاتی اور اس کا آگے کا نیٹ ورک ٹوٹ جاتا۔ اس سے زیادہ کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

وہ رات ہم دونوں نے گھر میں ہی تقریباً جاگتے ہوئے گزاری۔ نوید کی شادی شدہ بہن بھی اپنے دو بچوں کے ساتھ ادھر ہی آ گئی تھی۔ چار بہنوں کا اکلوتا بھائی اور اس گھر کا واحد کفیل کل کو اپنے بہتر مستقبل کے لئے اس ملک کو چھوڑ کر جا رہا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کا یہ کام غلط تھا۔ غیر قانونی طریقے سے بارڈر کراس کر کے بغیر ویزے کے جانا بہت خطرناک تھا لیکن ہم جیسے غریب لوگوں کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔

اس وقت مسقط جانے کا لیگل ویزہ تین لاکھ کا آتا تھا اور غریب آدمی جو پانچ ہزار ماہانہ ایک فیکٹری میں کام کرتا ہو۔ گھر میں پانچ پانچ لوگ کھانے والے بیٹھے ہوں تو تین لاکھ تو کیا تین روپے بھی اکٹھے نہیں ہوتے۔ ایسے میں یہی غیر قانونی طریقے سے باہر جانے کا راستہ ہی بچتا ہے۔ تین لاکھ کا کام دس ہزار میں ہو رہا ہو تو انسان کے دل میں لالچ آ ہی جاتا ہے۔ نوید کے دل میں بھی لالچ آ گیا تھا۔ وہ بھی اپنے اور اپنے گھر والوں کے بہتر مستقبل کے لئے ان تاریک راہوں کا مسافر بن رہا تھا۔

دوسرے دن شام کو پانچ بجے ہم اسٹین پر آ گئے۔ آج ہمارا پورا گھر ہی اسٹیشن پر بنے ٹائلٹ پر رک گیا تھا۔ شیرو چاچا نے اب ٹائلٹ جانے والوں سے پیسے لینا بند کر دیا تھا۔ میں نے شیرو چاچا سے کہا بھی لیکن وہ مسکرا دیئے۔

"نہیں بیٹا! آج میرے دو بیٹے گھر سے جا رہے ہیں۔ ساری زندگی ان ٹائلٹوں کی کمائی کھائی ہے اور اپنے بچوں کو بھی اپنی ٹائلٹوں سے کما کر کھلایا ہے۔ آج تم ایک گھنٹے کے لئے ادھر ہو تو ایک گھنٹے تک میں کسی سے کوئی پیسے نہیں لوں گا۔ شاید وہ خدا میری اسی ادا سے خوش ہو کر تم دونوں کو اپنی اپنی منزل پر پہنچا دے۔ بیٹا! جہاں بھی رہو جس بھی ملک میں رہو خوش رہنا! ہمارا پورا گھرانہ تجھے اپنے ہی گھر کا ایک فرد سمجھتا ہے۔"

ساڑھے پانچ بجے کے قریب ایجنٹ آ گیا اور ہم دونوں باری باری سب گھر والوں سے گلے ملے۔ نرما کی طرف میں نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔

''راضی صاحب! خدا آپ کو اپنی محبت میں کامیاب کرے گا۔ یہ نرما کی آپ کے لئے سپیشل دعا ہے۔اگر مسلمانوں کے اس خدا نے آپ کی دعا قبول نہیں کی تو شاید ہم عیسائیوں کا خدا آپ کی مراد پوری کر دے۔'' نرما کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ مجھ سے الگ ہو کر کھڑی ہو گئی۔

''بیٹا خدا تو ایک ہی ہے۔ ہم سب کا پالنے والا ایک ہی اوپر بیٹھا ہے۔ ہم ہی اسے الگ الگ روپ میں دیکھتے ہیں۔'' شیرو چاچا نے میرے اور نوید کے سروں پر ہاتھ رکھا اور ہم ایجنٹ کے ساتھ اندر اسٹیشن میں آ گئے۔

ایجنٹ نے ہمیں ایک بس میں سوار کروا دیا۔ وہاں ہم سے پہلے بھی قریباً تیس لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم دونوں جا کر سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ دوسرے جانے والے لڑکے بھی دو دو تین تین کر کے آتے رہے اور دس پندرہ منٹ میں پوری بس بھر گئی۔ ایجنٹ نے بس کے ڈرائیور کو پیسے دیئے اور ڈرائیور ہمیں لے کر آہستہ آہستہ اسٹیشن سے باہر نکلنے لگا۔ سب کو کراچی شہر سے باہر نکلنے میں تقریباً چالیس منٹ لگے۔ اس کے بعد بس تربت جانے والے روڈ پر فراٹے بھرنے لگی۔

بس میں بیٹھے ہوئے تمام لڑکے آہستہ آواز میں درود شریف پڑھنے لگے۔نوید عیسائی تھا اور مجھے پتہ نہیں کیوں بہت زیادہ ڈر لگ رہا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے تھے۔شاید یہ ایمان کا شہر چھوڑنے کا خوف تھا یا کچھ اور۔ میں نے نوید کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔نوید نے بھی میرے ہاتھوں کی کپکپاہٹ کو محسوس کر لیا تھا۔اس لیے اس نے دوسرا ہاتھ میرے سر کے پیچھے سے گزار کر مجھے اپنے کندھے سے لگا لیا۔

''یار بہت درد ہوتا ہے۔۔۔خدا نے شاید ساری آزمائشوں کے لئے مجھے ہی چن لیا ہے۔ بہت درد ہوتا ہے۔ یہ دل کسی دن ایسے ہی پھٹ جائے گا۔ ہے تو گوشت کا ایک چھوٹا سا لوتھڑا ہی نا؟ کسی دن برداشت سے باہر ہو گیا تو دھڑکنا ہی بند کر دے گا۔اور یقین کرو کہ وہ دن میری زندگی کا سب سے حسین دن ہو گا۔ساری زندگی کے دکھ تکلیفیں سب کچھ ختم ہو جائے گا۔'' میں بلک بلک کر رونے لگا۔

وہ مجھے آہستگی سے تھپتھپاتا رہا اور اس لڑکے کی اسی محبت نے مجھے سونے پر مجبور کر دیا۔آدھے گھنٹے تک میں دنیا کے ہر دکھ اور تکلیف سے آزاد ہو کر سو رہا تھا۔بس پوری رات سفر کرتی رہی۔ میرے سونے کے تھوڑی دیر بعد نوید بھی سو گیا تھا۔ہم پوری رات ایسے ہی کبھی سوتے کبھی جاگتے رہے۔

ڈرائیور تجربہ کار آدمی تھا اور اسے ان سارے راستوں کا علم تھا۔ بلوچستان میں بہت زیادہ ناکے اور پولیس چوکیاں تھیں اور ڈرائیور ان چوکیوں اور ناکوں سے بچ کر نکلتا تھا۔ اسے کراچی سے تربت تک کے روڈ کی تمام چوکیوں کا پتہ تھا۔ اور وہ ان چوکیوں سے پہلے ہی بس کو مین روڈ سے اتار کر کچے راستے پر ڈال لیتا تھا۔ کچھ پولیس والے ڈرائیور سے بھی زیادہ ہوشیار تھے اور ان کو ڈرائیوروں کی چالاکیوں کا علم تھا اور وہ انہی راستوں پر ناکہ لگا کر بیٹھ جاتے تھے۔

شاید یہ بات کچھ لوگوں کے حلق سے نہ اترے۔۔۔ ہمارے ملک کی پولیس ان کاموں میں ماہر ہے۔ ان کا ذہن ان کاموں میں بہت چلتا ہے اور یہی پولیس والے ہزاروں کی دیہاڑی لگا کر گھر جاتے ہیں۔

بس کراچی سے لے کر تربت تک کم ازکم پانچ جگہ پر پولیس کی چیکنگ سے گزری۔ ڈرائیور ہر جگہ پر پانچ سو کا نوٹ دیتا تھا جہاں کم ازکم دس پولیس والے ہوتے تھے۔ بلوچستان کے حالات خراب ہونے کی وجہ سے پولیس یا ایف سی والے ہوتے تھے۔ صرف ایک گاڑی ہی روڈ پر سامنے ہوتی تھی۔ جبکہ بیک اپ پر ایک اور گاڑی آگے تھوڑی ہٹ کر تیار حالت میں کھڑی ہوتی تھی۔

ڈرائیور کبھی بھی پولیس کے اشارہ دینے پر گاڑی بھگانے کی غلطی نہیں کرتا تھا۔ گاڑی بھگانے کی صورت میں پولیس یا ایف سی والے ڈائریکٹ گولی مار دیتے تھے۔ دوسری گاڑی کی چھت پر ہیوی مشین گن لگی ہوتی تھی۔ یہ آرمی کی پانچ انچ لمبی گولی والی گن ہوتی تھی جو کہ ایک سیکنڈ میں کم ازکم پچاس راؤنڈ فائر کرتی تھی۔ گولی پوری کی پوری گاڑی کو کراس کر جاتی تھی۔

ایران میں حالات مختلف تھے، وہاں کوئی بھی گاڑی نہیں رکتی تھی۔ پولیس پیچھا کر کے پکڑتی تھی اور زیادہ تر گاڑیاں ہاتھ نہیں آتی تھیں۔ وہ گاڑیوں کو جہاز کی رفتار سے اڑاتے تھے۔ اگر پکڑے بھی جاتے تو وہ راستے میں تمام غیر قانونی سامان پھینک دیتے تھے۔ ایرانی پولیس والے صرف خالی گاڑی ہی پکڑتے تھے۔

غیر قانونی سامان سے شاید آپ سوچ رہے ہوں یہ کونسا سامان ہے تو جناب یہی تو وہ سامان ہے جس سے یہ پاکستانی پولیس والے ہزاروں روپیہ کما کر لے جاتے ہیں۔ ورنہ پانچ سو روپیہ تو صرف پچاس پچاس روپے ہی فی کس پولیس والوں کے ہاتھ میں آتے ہیں۔

اس زمانے میں ایران پر امریکہ اور اس کے اتحادی ملکوں نے پابندیاں لگائی ہوئی تھیں اور یہ معاشی پابندیاں آج بھی ایران پر لگی ہوئی ہیں۔ ایران پاکستان کے مقابلے میں امیر ملک تھا۔ یہاں ادویات اور مختلف چھوٹی چھوٹی چیزیوں کی پاکستان کے مقابلے میں کہیں زیادہ قیمت تھی اور یہی چیزیں سمگل ہو کر ایران جاتی تھیں۔

لاکھوں روپے کا سامان اور منشیات اپنی گاڑیوں کے ذریعے ایران سمگل ہوتی تھیں۔ اور جو لاکھوں کا سامان لے جاتے ہیں وہ پولیس والوں کو ہزاروں دینے میں تامل نہیں کرتے۔ یہاں سے تو پولیس والوں کی دیہاڑی بنتی ہے۔ امید ہے اب آپ کو سمجھ آ گئی ہو گی اور اس سے زیادہ میں کچھ اور لکھوں گا بھی نہیں کیونکہ یہ ایک رومانی سفر کی داستان ہے اور میں اس سفر کو پولیس والوں کی کرپشن کی نظر نہیں کرنا چاہتا۔

دوسرے دن آٹھ بجے کے قریب ہماری بس ہمیں تربت شہر کے مضافات میں ایک بڑی سی حویلی میں لے گئی۔ وہاں پر ہم سے پہلے بھی قریباً پچاس ساٹھ لڑکے رہ رہے تھے۔ یہ سب آگے تربت سے مند تک چھوٹے چھوٹے ڈالوں کے ذریعے جاتے تھے۔ تربت سے آگے بس نہیں جاتی تھی۔ یہ کوئی دو گھنٹے کا سفر تھا اور یہ علاقہ بہت خطرناک تھا۔ کراچی سے تربت آٹھ گھنٹے کے سفر میں اگر چار پانچ پولیس چوکیاں تھیں تو تربت سے آگے صرف دو گھنٹے کے سفر میں قریبا سات آٹھ ناکے اور چوکیاں پڑتی تھیں۔

یہاں پر سیکورٹی بہت سخت تھی اور حالات بہت خراب تھے۔ اس لئے ہم لڑکوں کی گاڑیاں ہمیشہ دن کو ہی نکلتی تھیں کیونکہ رات کو خطرہ زیادہ تھا۔ یہاں پر ہم لوگوں کو پولیس یا ایف سی کا خطرہ نہیں تھا بلکہ بلوچستان کے ان شرپسندوں اور دہشت گردوں سے تھا۔ جو صرف دہشت پھیلانے کے لئے لوگوں کا قتلِ عام کرتے تھے۔

چیف آف آرمی سٹاف جنرل راحیل شریف کے دور میں حالات بہت ٹھیک ہو گئے ہیں۔ ورنہ اس وقت تو ان کے پاس راکٹ لانچر تک بھی موجود تھے اور وہ روڈ پر چلنے والی کسی بھی گاڑی کو ہٹ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس حویلی میں ہم سب کوئی ایک سو بیس کے قریب لڑکے تھے۔ ابھی ہمیں وہاں آئے ہوئے آدھا گھنٹہ ہی ہوا تھا جب ایک بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی روٹیوں کے دو بڑے بڑے بنڈل لے کر آ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک اور آدمی تھا جس کے کندھے پر ٹماٹروں کا ایک تھیلا لدہ ہوا تھا۔

''السلام وعلیکم سب لڑکوں کو! آپ لوگوں کا کھانا لے کر آیا ہوں۔'' اس نے اونچی آواز میں سلام کہا تو ہم سب لڑکے بالکل سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

''سو بچو! ایک ایک روٹی دو دولڑکوں کو ملے گی اور اس کے ساتھ ٹماٹر ملے گا۔ یہی آپ لوگوں کا کھانا ہے۔ جس نے کھانا ہے وہ کھا لے اور جس جس نے نہیں کھانا وہ اس کو رول کر کے اپنی جیب میں رکھ لے، آگے کام آئے گا۔ اور میری ایک بات پلے سے باندھ لو! کھانا اور پانی کبھی بھی مت پھینکنا کیونکہ یہ زندگی ہے۔ آگے حالات ایسے ہوں گے کہ آپ لوگوں کو سارا سارا دن کچھ بھی نہیں ملے گا، تو یہی سوکھی روٹیاں ہی آپ کے کام آئیں گی۔ ان کو ہلکا سا پانی لگاؤ اور ایک منٹ کے لئے لفافے میں رکھو تو پھر کھانے کے قابل ہو جاتی ہیں۔'' مونچھوں والا آدمی اونچی آواز میں ہم لڑکوں سے جیسے خطاب کر رہا تھا۔

میں اور نوید نے ایک بڑی روٹی کے ساتھ دو ٹماٹر لئے اور کمرے کے ایک کونے میں بیٹھ کر کھانے لگے۔ اس آدمی نے دس منٹ تک ہمیں کھانے دیا۔ اس کے بعد اس نے کاپی پنسل نکالی اور ہماری گنتی کرنے لگا۔ ان ایک سو بیس لڑکوں کے مختلف ایجنٹ تھے۔ یہ سارے ایجنٹ گجرات کھاریاں، منڈی بہاالدین اور سیالکوٹ کے تھے۔ تقریباً سارے لڑکے ہی انہی علاقوں کے تھے۔

''بچو! آپ سب نے کھانا کھا لیا ہے؟ ابھی تھوڑی دیر میں گاڑیاں آنا شروع ہو جائیں گی تو آپ سب کو یہاں سے مند لے جایا جائے گا۔ مند سے آگے ایران کا بارڈر ہے اور آپ سب لڑکوں کو آج رات ہی بارڈر کراس کروانے کی کوشش کی جائے گی۔ میری ایک بات دھیان میں رکھ لو! زیادہ سے زیادہ کپڑے اپنے جسم پر پہن کر رکھنا۔ پینٹ کے نیچے پورا ٹراؤزر پہنو اور اس کے علاوہ کم از کم تین شرٹ اور اوپر گرم جرسی پہنو۔ رستے میں گرمی لگے تو اتار کر بیگ میں رکھ لینا۔ جب پیدل چلو گے تو بیگ بہت بھاری ہو گا۔ آپ لڑکے ایک ایک کر کے سارے کپڑے نکال کر پھینک دو گے۔ بہت لمبا سفر ہوتا ہے اور اس سفر میں بیگ اٹھا کر چلنا بہت مشکل ہوتا ہے اس لئے کبھی بھی شرٹ اور جرسی مت پھینکنا۔۔۔ جسم کے اوپر پہن کر چلو گے تو گرمی تو لگے گی لیکن اس گرمی کے عادی ہو جاؤ گے۔ کبھی بھی کھانا اور جرسی پھینکنے کی غلطی مت کرنا! رستے میں بہت سردی ہوتی ہے، بعض اوقات جنگل میں آپ کو دو دو تین تین دن رہنا پڑے گا اور وہاں پر کوئی کھانا نہیں ملے گا، کوئی کپڑا نہیں ہو گا۔ یہی چیزیں آپ کے کام آئیں گی۔'' پہلی گاڑی آ چکی تھی جو کہ ایک ڈالا تھا۔

اس مونچھوں والے آدمی نے دو ایجنٹوں کے لڑکے علیحدہ کئے اور ان کو ڈالے میں بٹھا دیا۔ اس کے بعد مسلسل مختلف گاڑیاں آتی رہیں اور لڑکے ان میں بیٹھتے رہے۔ ہمارے لئے سوزوکی کی ایک پرانی کار آئی۔ آدمی نے مجھے

نوید اور مزید آٹھ لڑکوں کو علیحدہ کیا۔ ہم دس لڑکے تھے۔ ڈرائیور سمیت ہم گیارہ لڑکے تھے۔ گیارہ آدمی ایک کار میں نہیں آسکتے تھے لیکن ہمارا ڈرائیور خالص بلوچی نسل کا تھا۔ اس نے سب سے پہلے نوید کا بازو پکڑا اور کار کی ڈگی کھول کر اسے اندر لیٹنے کو کہا۔ نوید نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا تو میں مسکرانے لگا۔

''بیٹھو بیٹھو ماڑا۔ کیا دیکھ رہے ہو؟'' بلوچی نے نوید کو ڈگی کی طرف دھکیلا تو وہ خاموشی سے اندر چلا گیا۔

مجھے معلوم تھا کہ ڈگی میں ایک اور لڑکا بھی آئے گا اور یہی سوچ کر میں مسکرا رہا تھا۔ بلوچی نے قصائی کی نظروں سے ہماری طرف دیکھا اور ایک اور چھوٹے سے لڑکے کو پکڑ لیا۔ نوید بھی بہت پتلا سا اور چھوٹا سا لڑکا تھا اس لئے اس کا نمبر ڈگی میں لگا تھا۔ بلوچی نے اس کے بعد چار لڑکوں کو گاڑی کی پچھلی سیٹوں پر بٹھایا اور نیچے پیروں والی جگہ پر مزید دو لڑکے بٹھا دیئے۔ اب صرف دو لڑکے رہ گئے تھے۔ ان کو اس نے آگے بٹھا لیا۔ میں بھی اگلی سیٹ پر بلوچی کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

بلوچی بہت باتونی آدمی تھا۔ اس کے پاس رول کئے ہوئے پانچ پانچ سو کے دس نوٹ تھے۔ تربت سے مند تک ایک چھوٹی سی سڑک تھی۔ پوری سڑک راستے میں جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی اور اس سڑک کے باہر لق ودق صحرا تھا۔ یہ صحرا بہاول پور کے ریگستان سے مختلف تھا۔ یہاں پر دور دور آپ کو پہاڑوں کی قطاریں بھی نظر آئیں گی۔ اس کے علاوہ سمندر نزدیک ہونے کی وجہ سے آب و ہوا بھی خشک نہیں تھی۔ یہاں پر پیاس کا احساس نہیں ہوتا تھا جبکہ اس کے مقابلے میں بہاولپور کا صحرا خشک اور گرم ہے۔ جہاں پر پہاڑوں کا نام ونشان بھی نہیں ہے اور چہروں کو جھلسا دینے والی انتہائی گرم ہوا چلتی ہے۔

لیکن ان سب چیزوں کے باوجود بہاولپور کے راجھستان میں محبت کی خوشبو آتی تھی جبکہ بلوچستان کی فضا بارود کی بو سے بھری ہوئی تھی۔ بلوچی ڈرائیور آنے والی ہر چوکی پر کار کو تھوڑا آہستہ کرتا۔ کار کے شیشے کے پاس آنے والے ایف سی کے اہلکار کے ہاتھ پر پانچ سو روپے کا رول شدہ نوٹ رکھتا اور گاڑی آگے روانہ ہو جاتی۔ کار کے اندر بلوچی زبان کا کوئی غمگین سا گانا لگا ہوا تھا۔ اور بلوچی اس گانے کے ساتھ کبھی کبھی خود بھی گانا شروع ہو جاتا تھا۔

''راضی صاحب! یہ پاکستان ہے، میرا پیارا پاکستان ہے۔ یہاں پر سب کچھ چلتا ہے۔ پیسے سے اس ملک کا وزیر اعظم بھی خریدا جا سکتا ہے۔'' اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگا کر کہا تو میں بے اختیار مسکرانے لگا۔ مشرف کی کابینہ میں بیٹھے ہوئے ملک کے وزیر اعظم شوکت عزیز کے فرشتوں کو بھی پتہ نہیں تھا کہ تربت سے مند جانے والی

سڑک پر ایک بلوچی ڈرائیور اس کو خریدنے کی بات کر رہا تھا۔

اس دو گھنٹے کے سفر میں اس بلوچی نے سب کچھ بتایا۔ بلوچستان کی سرزمین کا ایک ایک راز، یہاں سے نکلنے والا اسمگلنگ کا سامان اور واپسی پر ایران سے آنے والا تیل جو ایران سے دس روپے لیٹر کے حساب سے آتا تھا اور آٹھ نو سو کلومیٹر دور کراچی جا کر پچاس ساٹھ روپے فی لیٹر بکتا تھا۔

اس دور میں آدھے کراچی کو یہی پٹرول سپلائی ہوتا تھا۔ آپ کراچی سے تربت اور پھر مند جانے والی بسوں کی حالت دیکھ لیں تو حیران رہ جائیں گے۔ ہر آدھے گھنٹے بعد ادھر سے بس نکلتی تھی۔ 72 سیٹوں والی وہ بس تین یا چار مسافر لے کر تربت آتی تھی اور واپسی پر تیل کے کینوں سے بھری ہوئی واپس آتی۔ تین چار مسافروں کے کرایہ سے تو رستے میں آنے والے ٹول ٹیکس ہی پورے نہیں ہوتے تھے۔ یہی تیل اور دوسری چیزوں کے لئے اتنی بڑی بڑی بسیں چلتی تھیں۔

وہ بلوچی پہلے سمگلنگ کے کاروبار سے ہی منسلک تھا لیکن بلوچستان کے حالات خراب ہوئے تو اس نے وہ کام چھوڑ دیا تھا۔ یہاں کے حالات اب رات کو کام کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے اسلئے وہ اب انسانی سمگلنگ کی طرف آ گیا تھا۔ اس کو تربت سے مند ایک چکر کے پانچ ہزار ملتے تھے۔ گاڑی کا تیل اور چیک پوسٹوں پر لگنے والے پیسے ایجنٹ ادا کرتا تھا۔ اسے ایک چکر کے پانچ ہزار مل جاتے اور وہ ایک دن میں دو چکر لگا کر دس ہزار روپیہ روزانہ کماتا تھا۔

یہ روز کا کام تھا، کوئی چھٹی نہیں تھی۔ چھٹی صرف تب ہوتی جب کبھی کبھار کوئی گاڑی یا بس زیادہ پیسوں یا کسی اعلیٰ افسر کے اچانک چھاپے کی وجہ سے پکڑی جاتی تو ایک دو دن تک کام بند ہو جاتا تھا۔ سختی زیادہ ہو جاتی تو یہ لوگ ایک دو دن انتظار کرتے اور اس کے بعد کام دوبارہ سٹارٹ ہو جاتا۔

میں یہاں پر یہ واضح کر دوں کہ یہ ساری معلومات اس بلوچی ڈرائیور کی دی ہوئی تھیں۔ میرا ذاتی مشاہدہ اس میں کچھ نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ضرورت سے زیادہ ہوشیار بن رہا ہو یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سب کچھ جھوٹ بول رہا ہو۔

”راضی صاحب! میں دل سے پاکستانی ہوں۔ پاکستان سے محبت کرتا ہوں۔ ہم انسانوں کی مثال بہتے

ہوئے اس پانی کی طرح ہوتی ہے جسے جتنا مرضی روکنے کی کوشش کر و وہ کہیں نہ کہیں سے سوراخ کر کے نکل ہی جاتا ہے۔ جب ایک نمبر سے کام بند ہو جاتا ہے تو پھر اس کے ہزار چور راستے نکل آتے ہیں۔ یہ بھی ایک عبادت ہے کہ آپ جیسے غریب جب باہر کے کسی بڑے ملک میں عزت سے چار پیسے کما کر اپنے گھر والوں کو بھیجو گے اور جو خوشی آپ کے والدین اور بہن بھائیوں کے چہرے پر ہوگی وہی خوشی ہمارے لئے آخرت میں نجات کا ذریعہ بن جائے گی۔'' اس نے پیکٹ سے ایک اور سگریٹ نکال کر سلگایا اور ایک لمبا کش لے کر دھواں باہر چھوڑ دیا۔

''راضی صاحب! یہ بھی عبادت ہے۔ رزق کا وسیلہ بننا بھی عبادت ہوتی ہے۔''

ٹھیک دو گھنٹے بعد ہم ایران کے بارڈر پر ایک چھوٹے سے گاؤں ''مند'' پہنچ گئے۔ یہاں پر بھی ہمیں گاؤں سے باہر بھیڑوں کے باڑے میں رکھا گیا۔ ہمارے ادھر تک پہنچے میں ایجنٹ کے ہزار پندرہ سو روپے فی لڑکا لگ گئے تھے اس لئے ہماری حفاظت شروع ہوگئی تھی۔ پندرہ سو روپے ایسے تو کچھ نہیں بنتے ہیں لیکن اگر اس کو ایک سو بیس سے ضرب دو تو رقم آپ کے اندازے سے بھی زیادہ ہی بنے گی۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ہمارے تو پندرہ ایجنٹ ہیں۔ کسی ایجنٹ کے تین چار اور کسی ایجنٹ کے دس بارہ لڑکے ہیں تو پھر ایک سو بیس سے ضرب کیوں دیں؟ نقصان کسی ایک کا تو نہیں ہوگا بلکہ پندرہ کے پندرہ ایجنٹوں کو ہو گا۔۔۔تو آپ غلط سوچ رہے ہیں۔

بے شک ہم پیچھے سے تقریباً سولہ کے قریب ایجنٹوں کے لڑکے تھے لیکن یہاں پر صرف ایک ہی ایجنٹ پیسے لگا رہا تھا۔ جس نے کراچی سے لے کر مند اور پھر ایران کا بارڈر کراس کروانا تھا اور پھر بحفاظت ایران کے سرحدی گاؤں سولدان تک پہچانا تھا اور پھر پیسے لینے تھے۔ گجرات یا منڈی میں بیٹھے ہوئے ہمارے مین ایجنٹوں نے سولدان پہنچے پر ہی رقم ادا کرنی تھی۔ اگر راستے میں کہیں بھی پکڑے جاتے تو ہماری چھڑوانے کی ذمہ داری اسی ایجنٹ کی تھی اور عموماً یہ لوگ کراچی سے سولدان تک ایک لڑکے کے تقریباً پانچ ہزار کے قریب روپے لیتے تھے۔

اگر ایک ایجنٹ روزانہ 100 لڑکوں کو بھی بارڈر کراس کروائے تو اسے پانچ لاکھ کے قریب روپے ملتے تھے۔ مند سے بارڈر کراس کروا کر سولدان پہنچانے والا ڈنکر ایک لڑکے کا ایک ہزار لیتا تھا۔ کراچی سے مند اور مند سے سولدان تک ایک لڑکا بڑے ایجنٹ کو ڈھائی ہزار میں پڑتا تھا اور وہ پانچ ہزار لیتا تھا۔ مزید پچاس ہزار وہ مختلف جگہوں پر لگا دیتا تھا۔ پھر بھی اسے ایک رات میں دو لاکھ سے اوپر بچتے تھے۔

یہ بہت بڑی گیم ہوتی ہے۔ انسانی سمگلر بارڈر پر انسانوں کو انسان نہیں بلکہ گنتی سمجھتے ہیں۔ ہم وہ بھیڑ بکریاں ہوتے ہیں جو ایک ایک کی بجائے تھوک کے حساب سے بکتی ہیں۔ بالکل باٹاریت نہ کم نہ زیادہ، چھوٹا بڑا کالا سفید سب کے ایک جیسے پیسے وصول ہوتے ہیں۔

بھیڑوں کے اس فارم میں تین بڑے بڑے مٹی کے بنے ہوئے شیڈ تھے۔ مٹی کی چھوٹی چھوٹی دیواریں اور اس کے اوپر درختوں کی شاخیں ڈال کر اوپر مٹی ڈال دی گئی تھی۔ چونکہ بارش کا پانی مٹی اور شاخوں سے کراس کر جاتا ہے اس لئے وہ لوگ مٹی برابر کرنے کے بعد اس کے اوپر پلاسٹک کا لفافہ ڈالتے ہیں اور اس کے بعد پھر مٹی ڈال کر جانوروں کے گوبر اور مٹی وغیرہ سے لیپ دیتے ہیں۔ گوبر اور گندم کی ٹوڑی کا جب مٹی کے ساتھ مکس کر کے آمیزہ بنایا جاتا ہے تو پھری لیپ ہر قسم کی بارش اور برف باری کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

سرحدی گاؤں کے رہنے والے یہ غریب چرواہے بہت بڑے انجینئر ہیں۔ چونکہ یہ ہال بہت بڑے ہوتے ہیں اور چھت کے لئے اتنی بڑی لکڑی کی چھتیریں میسر نہیں ہوتی ہیں اس لئے وہ ہال کے اندر دو یا تین مزید چھوٹی چھوٹی دیواریں یا پلّر بناتے ہیں اور لکڑی کی لمبائی کی کمی پوری کر لیتے ہیں۔

ہم یہاں پر دن کے بارہ بجے کے قریب ہی آ گئے تھے۔ آگے کا سفر رات کو بارہ بجے کے بعد شروع کرنا تھا۔ یہ بہت بڑا ہال تھا اسلئے ہم لڑکوں کو آسانی سے جگہ مل گئی۔ یہاں پر میں ایک اور بات بتا دینا چاہتا ہوں کہ جتنے بھی لڑکے پاکستان سے یونان کے لئے نکلتے ہیں اور ان کا ایک ایک ایجنٹ ہوتا ہے۔ وہی ایجنٹ جس کو ہم اپنے شہر میں پیسے دیتے ہیں۔

کچھ لڑکوں کے دو ایجنٹ ہوتے ہیں۔ ایک سب ایجنٹ ہوتا ہے جو متعلقہ گاؤں یا ملحقہ گاؤں کا ہوتا ہے۔ اس آدمی کو آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ ایجنٹ اگر آپ سے سات لاکھ وصول کرتا ہے تو وہ آگے مین ایجنٹ کو چھ لاکھ میں فروخت کرتا ہے۔ ایک لاکھ روپیہ وہ سب ایجنٹ اپنی گارنٹی کا وصول کرتا ہے۔ کیونکہ وہ آپ کو جانتا ہے اور آپ اور مین ایجنٹ کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ آپ کے گھر والے اسی سب ایجنٹ سے آپ کی خیریت معلوم کرتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات وہ آپ کی فون پر بات بھی کروا دیتے ہیں۔

پوری ڈنکی کے دوران آپ کو مین ایجنٹ کے نام سے ہی بلایا جاتا ہے۔ جیسے میرے اور نوید کے مین ایجنٹ کا نام بشیر آسی تھا اور ہمیں ہر جگہ پر اسی کے نام سے بلایا جاتا تھا۔ یہ غلط نام ہوتا ہے۔ آپ کو سب ایجنٹ کا نام تو پتہ ہوتا

ہے کیونکہ وہ آپ کے گاؤں کا یا رشتہ دار وغیرہ ہوتا ہے لیکن مین ایجنٹ کا نام کسی کسی کو پتہ ہوتا ہے۔ پوری ڈنکی کے دوران وہی غلط نام ہی استعمال ہوتا ہے۔ پکڑے جانے کی صورت میں بھی ان ایجنٹوں کا کہیں پتہ نہیں چلتا ہے۔ یہ ایجنٹ کبھی بھی لڑکوں کے ساتھ نہیں ہوتے۔ صرف ڈرائیور یا ڈنکر ہی ہوتے ہیں اور یہی پکڑے جاتے ہیں۔ ان کے پاس بھی ایجنٹ کا فون نمبر ہی ہوتا ہے اور کوئی معلومات نہیں ہوتیں۔ پکڑے جانے کی صورت میں ایجنٹ فوراً نمبر تبدیل کر لیتے ہیں۔

اس زمانے میں موبائل عام ہو گیا تھا۔ ٹیلی فون کی سم 200 روپے میں مل جاتی تھی اور اس کے اندر تین سو سے بھی زیادہ روپے بیلنس ہوتا تھا۔ سم اپنے نام پر رجسٹر کروانے کا کوئی قانون نہیں تھا اس لئے ان ایجنٹوں کے پاس سموں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ جبکہ اس کے مقابلے میں ایران میں سموں کی بہت قیمت تھی۔ وہاں پر ایک سم کی قیمت تیس پینتیس ہزار پاکستانی روپے تھی اور وہ لوگ فون کی احتیاط بھی بہت کرتے تھے۔

ترکی میں حالات پھر بھی ٹھیک تھے۔ وہاں پر سم کی قیمت نارمل ہی ہے اور نئی سم ایک ہزار کے قریب مل جاتی تھی۔ اسی قیمت کی وجہ سے پاکستان میں ہمارے گھر والوں کو پریشانی ہوتی تھی۔ کیونکہ ایران کے اندر سفر کر رہے ہوں تو ڈنکر ایک شہر سے دوسرے شہر یا ایک ڈنکر سے دوسرے ڈنکر یا ڈرائیور کے پاس بندے پہنچنے کی اطلاع ہمارے ایجنٹ کو تو ضرور دیتے تھے لیکن ہر لڑکے کی بات اس کے گھر والوں سے نہیں کروا سکتے تھے۔ اور یہ بات ہمارے گھر والوں کو سمجھ نہیں آتی تھی۔ وہ ہمارے سب ایجنٹوں سے لڑنا شروع کر دیتے تھے۔

صرف ایک اور بات یہ کہ ہمارے مقامی مین ایجنٹ ہم کو آگے مزید چار پانچ ایجنٹوں کو دیتے ہیں۔ میں آپ کو ان ایجنٹوں کی بھی تفصیل بھی بتا دیتا ہوں۔ سب سے پہلا ایجنٹ آپ کو کراچی اسٹیشن سے وصول کرتا ہے۔ وہ آپ کو کراچی سے ایران کا بارڈر کراس کرواتا ہے اور ایرانی گاؤں سولدان پہنچا کر اپنے پیسے وصول کر لیتا ہے۔ یہ پیسے عموماً پانچ یا چھ ہزار کے قریب ہوتے ہیں۔ اس کا انحصار مین ایجنٹ پہ ہوتا ہے۔

کچھ ایجنٹ ایسے ہوتے ہیں جن کے روزانہ تیس پینتیس لڑکے نکلتے ہیں تو وہ فی لڑکے کا پانچ ہزار سے بھی کم دیتا ہے۔ جو چھوٹے ایجنٹ ہوتے ہیں ان کے صرف تین چار یا پانچ لڑکے ہوتے ہیں تو وہ چھ چھ ہزار روپے بھی ادائیگی کرتے ہیں۔ سولدان سے دوسرا ایجنٹ لیتا ہے اور وہ آپ کو پورا ایران کراس کرواتا ہے اور ماکو یا سلماس پہنچاتا ہے۔

یہ دونوں ایران کے چھوٹے چھوٹے سرحدی گاؤں ہیں اور کرد جنگجوؤں سے بھرے ہوئے ہیں۔ جیسے ہمارے پاکستان میں فاٹا کی سات ایجنسیاں ہیں۔ جہاں پر پاکستان کی سول گورنمنٹ کا کوئی اا ختیار نہیں ہے اور اسلحے کی فروانی ہے۔ ایران میں حالات اتنے برے تو نہیں ہیں لیکن پھر بھی اس علاقے میں ایرانی پولیس کا اختیار نہیں ہے۔ جو لوگ غیر قانونی طریقے سے ایران میں آئے ہوئے ہوتے ہیں ان کا کوئی بھی کیس پولیس میں رپورٹ نہیں ہوتا۔ ماکو اور سلماس ترکی کے ساتھ ایران کے دو مختلف گاؤں ہیں اور انسانی سمگلنگ کا گڑھ ہیں۔ اس کے علاوہ بھی شاید ایک دو اور دیہات ہوں مجھے ان کا پتہ نہیں ہے۔ چونکہ میں صرف ان دونوں دیہات میں رہا ہوں اس لئے مجھے صرف ان دونوں کا ہی پتہ ہے۔

دوسرا ایجنٹ ایران کے ان دونوں دیہات میں پہنچا کر پیسے لے لیتا ہے۔ اس کے بعد کرد ایجنٹ ہوتا ہے۔ وہ ماکو یا سلماس سے لیتا ہے اور ترکی کا بارڈر کراس کروا کر ترکی کے ایک چھوٹے سے شہر دوگو بیاز پہنچاتا ہے۔ یہ بارڈر سے تقریباً تیس کلومیٹر اندر ایک نسبتاً بڑا شہر ہے۔ ماکو یا سلماس سے دوگو بیاز قریباً چالیس سے پچاس کلومیٹر کا فاصلہ بنتا ہے اور اس فاصلے کا وہ کرد ایجنٹ پندرہ سے بیس ہزار کے قریب روپیہ لیتا ہے۔ ایک لڑکے کا اگر وہ پندرہ ہزار وصول کرے تو 100 لوگوں کا پندرہ لاکھ روپیہ بنتا ہے۔ اس قدر زیادہ پیسہ۔۔۔ وہ لوگ تو دنوں میں ہی ارب پتی کیوں نہیں ہو جاتے؟ اور اتنے زیادہ پیسے کیوں لیتے ہیں؟ اس کا جواب آگے تفصیل سے دیا جائے گا۔

دوگو بیاز سے ڈرائیور حضرات اٹھاتے ہیں اور استنبول تک پہنچاتے ہیں۔ استنبول میں ہاؤس انچارج ہوتے ہیں وہ لڑکوں کو استنبول میں محفوظ رہائش دیتے ہیں اور کھانا دیتے ہیں۔ یہ ہاؤس انچارج صرف یہی سہولت فراہم کرنے کی قیمت وصول کرتے ہیں۔ پولیس اور دوسرے اداروں سے محفوظ رکھنا، لڑکوں کو استنبول میں وصول کرنا اور آگے یونانی ڈنکروں کو دینا انکا یہی کام ہے۔

اس کے بعد یونانی ایجنٹ ڈنکر یا لانچ والے ہوتے ہیں۔ یہ لڑکوں کو استنبول سے وصول کرتے ہیں اور یونانی بارڈر کراس کروا کر ''الیگزینڈروپولی'' لے جاتے ہیں۔ یہاں یونان کی حکومت لڑکوں کو یونان میں سیاسی پناہ کی بنیاد پر رہنے کی اجازت دے دیتی ہے۔ یہاں پر سیاسی پناہ کے کافی چانس ہوتے ہیں لیکن ہمارے مین ایجنٹ یہ رسک نہیں لیتے۔ وہ لڑکوں کو اس شہر سے ایک ہزار کلومیٹر دور ایتھنز شہر میں لاتے ہیں۔ اس شہر میں بھی ہاؤس انچارج ہوتے ہیں جو لڑکوں کو وصول کرتے ہیں اور ان کی انکے گھر میں بات کرواتے ہیں۔

پاکستان والے ایجنٹ یونان تک کے سفر کے چھ سات لاکھ روپے وصول کرتے ہیں اور اس کے بعد آپ کو ایتھنز شہر میں آپ کے مطلوبہ دوست بھائی یا کزن کے گھر چھوڑ کر آجاتے ہیں۔ یہ ہے پاکستان سے یونان کی ٹوٹل گیم۔

آپ کو پاکستان سے آپ کے گھر سے اٹھاتے ہیں اور ہزاروں کلومیٹر دور آپ کے مطلوبہ گھر تک پہنچا کر پیسے لیتے ہیں۔ راستے میں آپ سات آٹھ ایجنٹوں کے ہاتھوں میں بکتے ہیں اور دو اڑھائی مہینے کا سفر طے کر کے آخر یونان تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس سفر میں آپ قدم قدم پر موت سے بچتے ہیں۔ پولیس، آرمی اور بارڈر سیکورٹی فورسز غرضیکہ ایجنٹ آپ کو ہر جگہ سے بچا کر نکال لے جاتے ہیں۔ یہ اربوں روپے کی گیم ہوتی ہے اور اس میں سینکڑوں لوگ ملوث ہوتے ہیں۔

میرے خیال میں مجھے اب واپس مند کے اس بھیڑوں والے فارم میں چلا جانا چاہیے۔ جہاں پر میں نوید کے ساتھ فارم کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔

نوید نے کپڑوں والے بیگ کو سر کے نیچے رکھ لیا تھا اور اب آرام سے سو رہا تھا۔ مجھے ابھی نیند نہیں آرہی تھی اور میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ ذہن بار بار ایمان کی یادوں کی طرف پلٹ رہا تھا لیکن میں کوشش کر کے اسے اس چیز سے روک رہا تھا۔ ایمان کی یاد اب بہت تنگ کرنے لگ جاتی تھی۔ رات کو پیدل بارڈر کراس کرنا تھا جو کہ پوری رات کا سفر تھا، اسلئے ابھی سونا چاہتا تھا لیکن ایمان کی یادیں سونے نہیں دے رہی تھیں۔ دل ایک بار پھر کٹنا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔ مزید ایک گھنٹے تک ایسے ہی ایمان کی یادوں سے لڑتے لڑتے میں سو گیا۔

سارے نیک لڑکے تھے۔ پنجاب سے کراچی اور پھر کراچی سے یہاں مند تک کے سفر نے ان لڑکوں کو تھکا دیا تھا۔ پہلی بار گھر سے نکلے تھے اس لئے اب جوان کو جگہ ملی تو وہ سارے ہی سو گئے۔ وقفے وقفے سے ایک دو لڑکے قضائے حاجت کے لئے اٹھتے رہے لیکن میں اور نوید مسلسل سوتے رہے۔ ہماری آنکھ اس وقت کھلی جب ڈنکر آیا اور اس نے آکر سب لڑکوں کو جگانا شروع کر دیا۔

''چلو ماڑا جلدی کرو! ابھی آدھے گھنٹے میں ادھر سے نکلنا ہے۔ اٹھو اٹھو! جلدی کرو۔'' وہ پاؤں سے لیٹے ہوئے لڑکوں کو ٹھوکریں مار کر جگا رہا تھا۔

اس نے آدھے گھنٹے کا کہا تھا لیکن اس کے ٹھڈوں کی وجہ سے لڑکے پانچ منٹ میں تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ گاڑی آدھے گھنٹے کی بجائے چالیس منٹ میں آئی۔ اس نے پینتیس چالیس لڑکوں کو گاڑی میں بٹھایا اور بارڈر کی طرف لے گیا۔ گاڑی نے ہمیں اس چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں والے جنگل میں لے جانے میں صرف دس منٹ لگائے تھے۔ وہاں سے آگے پیدل بارڈر کراس کرنا تھا۔ ہمیں وہیں چھوڑ کر گاڑی واپس چلی گئی اور اس کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا پھیرا لگایا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ہم سب 100 سے زیادہ لڑکے جمع ہو گئے تھے اور چھ سات ڈنکر تھے۔

''ڈنکر'' ڈنکی لگوانے والے کو کہتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیں پیدل بارڈر یا چوکیاں کراس کرواتے ہیں۔ گاڑی میں لے کر جانے والے کو ڈرائیور ہی کہتے ہیں جبکہ پیدل لے جانے والے کو ڈنکر کہا جاتا ہے۔

ان ڈنکروں نے ہمیں دو حصوں میں تقسیم کیا اور تین ڈنکر پہلے والے گروپ کو لے کر چلے گئے۔ میں اور نوید دوسرے گروپ میں تھے۔ ڈنکر نے ہمیں ادھر ہی خاموش بیٹھے رہنے کو کہا اور خود چاروں ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے۔ آدھے گھنٹے تک ہم لوگ ادھر ہی بیٹھے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے ہمیں اٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر دو ڈنکر ہمارے آگے آگے چلنے لگے اور ان کے پیچھے پیچھے ہم چالیس پچاس لڑکے ایک قطار بنا کر چلنے لگے۔ ایک ڈنکر سب سے پیچھے چلا گیا اور ایک آگے پیچھے چکر لگانے لگا۔

''راضی بھائی! اور کتنا دور ہے؟ میں تھک گیا ہوں چلتے چلتے۔'' نوید کے چہرے سے تھکاوٹ کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔

دو گھنٹے تک رات کو مسلسل اس نیم پہاڑی علاقے سے گزرنا بہت مشکل تھا۔ لڑکے پہلی بار پیدل چل رہے تھے اس لئے ایک گھنٹے میں ہی تھک گئے تھے۔ ابھی تو چھ سات گھنٹوں کا مزید سفر تھا لیکن لڑکے ابھی سے تھکنا شروع ہو گئے تھے۔ ڈنکروں کو اس بات کا پتہ تھا کیونکہ ان کا یہ روزانہ کا کام تھا اور وہ اب دھیمی آواز میں لڑکوں کو گالیاں دینا شروع ہو گئے اور چھڑیاں بھی مارنے لگے۔ جو بھی لڑکا پیچھے رہ جاتا اسے وہ آگے کی طرف دھکا دیتے اور مارتے تھے۔ لڑکے مار، دھکے اور گالیاں سب کچھ برداشت کر رہے تھے لیکن کوئی بھی شور نہیں کر رہا تھا۔

ڈنکروں نے چلنے سے پہلے واضح کر دیا تھا کہ اگر کسی بھی لڑکے کی آواز آئی یا وہ تھک کر گرا تو اسے وہیں چھوڑ دیں گے اور بلوچستان کے اس انتہائی خطرناک علاقے میں چھوڑنے کا مطلب صرف موت ہی تھا۔ جو بھی لڑکا اس گروپ سے علیحدہ ہو جاتا تو پھر وہ ان دہشت گردوں کے ہاتھ چڑھ جاتا جو پورے بلوچستان میں پھیلے ہوئے تھے

اور جن کے نزدیک انسانی جان کی قیمت ایک مکھی یا مچھر جیسی تھی۔ اس لئے لڑکے برداشت سے کام لے رہے تھے اور گرتے پڑتے ساتھ چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں نے نوید کا بیگ پکڑا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ چلانے لگا۔ میرے پاس کوئی بیگ نہیں تھا۔ جتنے بھی کپڑے تھے وہ میں نے پہنے ہوئے تھے اور صرف ایک پانی کی بوتل میرے ہاتھ میں تھی۔ جبکہ نوید کے پاس پورا بیگ کپڑوں کا تھا جس میں سوکھے چنے اور بسکٹ کے پیکٹ تھے۔ میں نے پانی والی بوتل کو نوید کے بیگ میں ڈال لیا۔ نوید کے کندھے سے بیگ اترا تو اس کو کچھ حوصلہ ہو گیا اور وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

''اب ٹھیک ہو نا نوید؟'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے مجھے اس کے چہرے کے خدوخال تو نظر نہیں آ رہے تھے لیکن پھر بھی چہرا نظر آ رہا تھا۔

''جی جی راضی بھائی! میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے جلدی سے کہا اور میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں نے ابھی تک اس کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔

''راضی بھائی! آپ بالکل ہمارے گھر کا فرد بن گئے ہو۔ آپ سے بہت محبت ہو گئی ہے ہم لوگوں کو۔'' وہ مسلسل میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

''صرف ایک مہینے میں ہی آپ نے ہمارے پورے گھر کا دل جیت لیا ہے۔ آپ بہت اچھے ہو راضی بھائی! آپ کو کسی کا بھی دل جیتنے کا ہنر آتا ہے۔'' میں چلتے چلتے رک گیا۔

''نوید یار! مجھے دل جیتنا نہیں آتا ہے۔ میری پوری زندگی لگ گئی ہے صرف ایک شخص کا دل جیتنے میں اور وہاں پر بھی ناکام رہا ہوں۔ دل جیتنے کا ہنر خدا نے میری قسمت میں لکھا ہی نہیں ہے۔''

''چلو چلو! رکنا نہیں ہے۔'' پیچھے سے آنے والے ڈنکر نے ایک زوردار چھڑی میری پشت پر مارتے ہوئے کہا۔

''ادھر بہت خطرہ ہے ماڑا! جلدی جلدی چلو۔'' میں خاموشی سے نوید کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

لڑکے اب ایک ایک کر کے لڑکھڑانا شروع ہو گئے تھے۔ چالیس پچاس لڑکوں کا گروپ اب مزید تین

گروپوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ایک گروپ میں وہ لڑکے تھے جو بالکل ٹھیک تھے اور وہ ڈنکر کے قدم سے قدم ملا کر چل رہے تھے۔ وہ ہم سے بہت آگے نکل گئے تھے۔ میں اور نوید دوسرے گروپ میں رہ گئے تھے جو نارمل تھے اور تھوڑا آہستہ چل رہے تھے۔ ہمارے پیچھے سات آٹھ وہ لڑکے رہ گئے تھے جن سے بالکل چلا ہی نہیں جا رہا تھا۔ دو ڈنکر ان لڑکوں کے ساتھ رہ گئے تھے۔ انہوں نے ان لڑکوں کے بیگ خود اٹھا لئے تھے اور ان کے ہاتھ پکڑ پکڑ کر چلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ڈنکروں کو پیسے لڑکوں کو بارڈر کراس کروانے پر ہی ملتے تھے اور ان کے لئے ایک ایک لڑکا قیمتی تھا۔ وہ لڑکوں کو ادھر نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ایسا کبھی کبھی ہی ہوتا تھا جب کوئی لڑکا پیچھے رہ جاتا تھا۔ لڑکے کی زندگی اور موت کا انحصار تو اس کی قسمت پر ہوتا تھا۔ اگر وہ آرمی یا پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا تو بچ جاتا تھا لیکن اگر کسی اور کے ہاتھ لگ جاتا تو پھر موت ہی اس بے چارے کا مقدر ٹھہرتی تھی۔ اس کے علاوہ ڈنکر کبھی بھی لڑکے کو پیچھے نہیں چھوڑتے ہیں کیونکہ لڑکا چھوٹ جانے کی صورت میں ایجنٹ پھر کبھی بھی اس ڈنکر کو دوبارہ لڑکے نہیں دیتے۔

یہ ایسا غیر قانونی کاروبار ہے جس میں اعتبار ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ جو بھی ڈنکر لڑکا چھوڑ دیتا ہے اس کا نام خراب ہو جاتا ہے اور اسے دوبارہ کام نہیں ملتا۔ لڑکے کی زندگی اور موت سے ان کو کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔ ان کو صرف اپنے کاروبار سے مطلب ہوتا ہے اور وہ اپنے اسی کاروبار کو بچاتے ہیں۔

ان سات آٹھ لڑکوں کو بھی ڈنکر ہر حال میں آگے لے کر جاتے ہیں۔ باقی لڑکے اگر سات آٹھ گھنٹوں میں پہنچتے ہیں تو وہ ان لڑکوں کو دس دس گھنٹوں کا سفر کرواتے ہیں اور آخر کار لے ہی جاتے ہیں۔ ویسے یہی فاصلہ یہ ڈنکر چار پانچ گھنٹوں میں طے کر لیتے ہیں لیکن لڑکوں کی وجہ سے یہ فاصلہ سات آٹھ گھنٹے کا ہوتا ہے۔

اگلے ایک گھنٹے تک مسلسل چلنے پر ہمیں ایک کھائی کے اندر پہلے والے گروپ کے لڑکے بیٹھے ہوئے نظر آ گئے۔ یہ ہمارے ہی گروپ کا پہلا حصہ تھے۔ ہمارے ڈنکر نے ہمیں بھی ان کے پاس بٹھا دیا اور باقی لڑکوں کا انتظار کرنے لگے۔

آدھے گھنٹے تک پیچھے رہ جانے والے سات لڑکے بھی آ گئے۔ وہ لڑکے آتے ہی وہیں گر گئے۔ ڈنکروں نے جلدی جلدی ان کو زمین پر لٹایا اور ان کی ٹانگوں کی مالش کرنے لگے۔ وہ انتہائی تیزی سے ان کی ٹانگوں اور پیروں کی مالش کر رہے تھے۔ باقی لڑکے ٹھیک تھے لیکن وہ ساتوں لڑکے بالکل پیدل چل چل کر جیسے ختم ہو گئے تھے۔ اگر ان

کی ٹانگوں میں گلٹیاں پڑ جاتیں تو پھر وہ لڑکے کبھی بھی آگے چل نہیں سکتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ ڈنکران لڑکوں کی ٹانگوں کی مالش کررہے تھے اوران کو اگلے سفر کے لئے تیار کررہے تھے۔گلٹیاں تو ہماری بھی ٹانگوں میں پڑ گئی تھیں لیکن ہم باقی لڑکے نسبتاً مضبوط تھے اوران گلٹیوں کو برداشت کر سکتے تھے لیکن ان ڈنکروں نے لڑکوں کی ٹانگوں میں گلٹیاں نہیں پڑنے دیں۔آدھے گھنٹے تک وہ لڑکے بالکل ٹھیک ہو گئے تھے اوراگلے سفر کے قابل ہو گئے تھے۔

''ماڑا!تم میں سے کسی کے بیگ میں پیسے وغیرہ ہیں تو نکال لے اورضروری کپڑے بھی نکال کراوپر پہن لے، آگے کا سفرتم سب لڑکے بغیر بیگوں کے ہی کرو گے!'' ڈنکر نے کہاتو وہ ساتوں لڑکے اس کی منتیں کرنے لگے۔

ڈنکروں کومعلوم تھا کہ یہ لڑکے ان بڑے بڑے بیگوں کے ساتھ سفرنہیں کرسکیں گے اس لئے وہ ان سے بیگ لے کر بیگوں سے فالتو سامان نکال نکال کر باہر پھینکنے لگے۔ان ڈنکروں نے صرف اتنی مہربانی کی کہ انہوں نے بیگ ہلکے کر کے واپس کر دیئے اوردھمکی بھی دی کہ اگران میں سے ایک بھی لڑکا اب پیچھے رہاتو وہ اس کا بیگ ادھر ہی راستے میں چھین کر پھینک دیں گے۔

دس پندرہ منٹ مزید ادھر بیٹھنے کے بعد ہم ایک بار پھرآگے بڑھنے لگے۔چالیس پینتالیس منٹ تک ادھر بیٹھے رہنے سے ہماری تھکاوٹ کافی حد تک اتر گئی تھی اور ہم اگلے سفر کے لئے تیار ہو گئے تھے۔

ہم ابھی تک پاکستانی علاقے میں ہی تھے۔مزید ایک گھنٹے بعد بارڈرآنا تھااوراس کے بعد ایرانی علاقہ شروع ہوجاتا۔بالکل گھپ اندھیرا تونہیں تھا لیکن پھربھی ہمیں قطار کے ایک سرے سے دوسرا سرانظر نہیں آتا تھا۔ڈنکی میں بہت سے لڑکے سگریٹ پیتے تھے لیکن ڈنکروں نے سختی سے سگریٹ پینے سے منع کیا تھا۔سگریٹ کے آگے سلگنے والا سرادور سے نظرآجاتا تھا۔

ایران کا یہ بارڈر تقریباً ریگستانی علاقہ تھا اورسگریٹ کا سرا دو تین کلومیٹر سے بھی نظرآجاتا تھا اورایرانی فوجی دیکھتے ہی گولی چلادیتے تھے۔پاکستانی ایف سی یا آرمی والے اتنی جلدی گولی نہیں چلاتے تھے کیونکہ بارڈر پر موجود پاکستانی فوجیوں کو گولیاں گن کر دی جاتی ہیں اوران کا باقاعدہ اندراج ہوتا ہے۔اگر وہ ایک بھی گولی رات کو چلاتے ہیں تو پھرصبح کو اس کا حساب دینا پڑتا ہے۔دو دو تین تین انکوائریاں ہوتی ہیں۔چونکہ بلوچستان میں بہت زیادہ دہشت گردی کا خطرہ تھا اس لئے انٹیلی جنس کے ادارے بہت زیادہ معلومات اکٹھی کرتے تھے۔کئی کئی گھنٹے اس فوجی سے پوچھ گچھ ہوتی ہے اورآخر میں انٹیلی جنس والے رپورٹ فائنل کرتے ہیں۔بارڈر پر گولی چلنے کی صورت

میں ایران بھی جواب طلب کرتا ہے اور ان کو مکمل انکوائری کر کے بتایا جاتا ہے کہ یہ صرف ایک غلطی تھی، کوئی دہشت گردی نہیں تھی۔

پاکستان میں آرمی بہت کنٹرولڈ تھی جبکہ ایران میں یہ سب کچھ نہیں ہوتا تھا۔ معاشی پابندیوں کے باوجود وہ ایک امیر اور بڑا ملک تھا۔ بلوچستان میں جاری آپریشن کی وجہ سے دہشت گرد بارڈر کراس کر سکتے تھے۔ اس لئے ایران والے بلا دریغ بارڈر کراس کرنے والے کو گولی مار دیتے تھے۔ بارڈر کراس کرنے والے اور مرنے والے عام طور پر پاکستانی ہوتے تھے اور ایران کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ سگریٹ کے ایک ہلکے سے شعلے پر بھی گولی چلا دیتے تھے۔

ایرانی بارڈر پولیس کے پاس رات کو دیکھنے والی نائٹ وژن ٹیلی سکوپ ہوتی تھی لیکن ڈیوٹی پر بیٹھا ہوا اہلکار چوبیس گھنٹے تو ٹیلی سکوپ آنکھ پر لگا کر نہیں بیٹھا رہتا تھا۔ مجھے ایک بار ٹیلی سکوپ میں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس میں ایک منٹ سے زیادہ مسلسل نہیں دیکھا جا سکتا۔ ہر طرف عجیب سا سرخ کلر ہوتا ہے۔ اس لئے اہلکار ایسے ہی ڈیوٹی دیتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ بارڈر بہت بڑا تھا اور کئی کئی کلومیٹر تک ایسے ہی خالی پڑا ہوا تھا۔ کوئی چیکنگ، کوئی بارڈر پوسٹ نہیں ہوتی تھی۔ ڈنکروں کو بارڈر کے ایک ایک چپے کا پتہ تھا۔ وہ ہم لڑکوں کو انہی راستوں پر لے کر جاتے تھے اور بارڈر کراس کرواتے تھے۔

یہ سب باتیں آج سے گیارہ سال قبل کی ہیں۔ اس وقت ایران اور افغانستان دونوں ملکوں کے بارڈر کھلے ہوئے تھے۔ آج تو حالات بہت مختلف ہیں اور بہت زیادہ سختی ہو گئی ہے۔ افغانستان کا بارڈر تو تقریباً سیل ہو گیا ہے اور ایران کے ساتھ بھی بہت سی چیک پوسٹس بن گئی ہیں۔

ایران کا بارڈر تو ابھی بھی کراس ہوتا ہے لیکن اب ایران والے بھی گولی مارنے سے گریز کرتے ہیں۔ ورنہ اس دور میں ایران والے اپنے بارڈر پر گولی مار دیتے تھے۔ اس کے علاوہ ترکی والے بھی احتیاط نہیں کرتے تھے۔ ان کو بھی کرد جنگجوؤں سے خطرہ تھا اور اس کے علاوہ ان ڈنکیوں میں اسمگلنگ بھی ہوتی تھی۔ اس لئے ترکی والے بھی گولی چلا دیتے تھے۔

''راضی بھائی! آپ بیگ مجھے پکڑا دو، میں اٹھا لوں گا۔'' نوید نے میرے کندھے سے بیگ اتارنا چاہا تو میں نے اسے منع کر دیا۔

''دے دو بھائی! آپ تھک گئے ہوں گے؟'' اس نے ایک بار پھر زور دیا لیکن اب کی بار بھی میں نے اسے بیگ نہ پکڑایا بلکہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ ساتھ لے کر چلنے لگا۔

''بھائی! آپ تھک جاؤ گے۔'' اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اندھیرے کی وجہ سے اسے میرے چہرے کے تاثرات تو نہیں مل سکتے تھے لیکن پھر بھی اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''یار! میں تھکنے والی چیز نہیں ہوں اور ویسے بھی آپ مالک ہو، میں آپ کا ملازم ہوں۔ اور ملازم کے ہوتے ہوئے مالک کام کرتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرانے لگا۔

''بھائی! مالک تو آپ ہو ہمارے۔ جو محبت اور عزت آپ نے ہمارے گھر کو دی ہے اس حساب سے تو ہم آپ کے ملازم بنتے ہیں۔'' اس نے میرے ہاتھ کو دباتے ہوئے کہا۔

''اے ماڑا، چپ! چوبیس گھنٹے باتیں ہی کرتے رہتے ہو۔ یہ بارڈر ہے یہاں پر خاموشی سے چلو!''

اب کی بار نوید کی باری تھی۔ ڈنکر نے اسے چھڑی ماری تھی اور کافی زور سے ماری تھی۔ نوید نے اسے سندھی میں ایک موٹی سی گالی دی۔ نوید کی بدقسمتی تھی کہ اس ڈنکر کو سندھی آتی تھی اور اس نے ایک اور چھڑی ماردی۔

''پچھلے دو سال سے یہ ڈنکری کر رہاں ہوں۔۔۔ سندھی، پنجابی، اردو اور فارسی سب زبانوں کی گالیاں تو آتی ہیں مجھ کو۔'' اب کی بار اس نے پنجابی میں گالی دی۔

میں نے نوید کو آگے کی طرف دھکیلا اور ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔ یہ بارڈر تھا اور ہم یہاں پر کسی سے لڑنے نہیں آئے تھے۔ ویسے بھی قصور ہمارا ہی تھا۔ اگر ایسے ہی ہر لڑکا باتیں کرنے لگ جاتا تو ان چالیس پینتالیس لڑکوں کا شور بارڈر پر موجود چوکی تک بھی چلا جاتا اور پھر ہمارا بارڈر کراس کرنا مشکل ہو جاتا۔ میں نوید کو لے کر خاموشی سے چلتا رہا۔ آگے جا کر ڈنکر نے سب لڑکوں کو روک رکھا تھا۔ میں اور نوید بھی جا کر کھڑے ہو گئے۔ اب کی بار کوئی بھی لڑکا لیٹ نہیں ہوا تھا۔ دس منٹ تک سارے لڑکے اکٹھے ہو گئے۔

''ابھی یہاں سے بارڈر صرف پندرہ منٹ دور ہے، اب کوئی بھی لڑکا نہیں بولے گا۔ ایرانی بلا دریغ گولی مار دیتے ہیں اس لئے برائے مہربانی بس خاموشی سے چلتے رہنا ہے اور کوئی لڑکا بھی پیچھے نہیں رہے گا۔ اگر کوئی رہ گیا تو

پھراس کا ذمہ داروہ خود ہوگا۔ یہاں پر ہم اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔صرف ایک گھنٹے تک کا سفر مشکل ہے اس کے بعد ہم دوکلومیٹرا یران کی حدود کے اندر چلے جائیں گےتو پھر آگے کا سفر آسان ہو جائے گا۔اس کے بعد زیادہ سختی نہیں ہوگی۔ہم لوگ مزید چار گھنٹوں تک سولدان پہنچ جائیں گے۔وہاں پر سب کو کھانا بھی ملے گا اورسونے کے لئے جگہ بھی مل جائے گی۔'' ڈنکر نے دھیمی آواز میں لڑکوں کو ہدایات دیتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر تک ہم ایسے ہی کھڑے رہے اس کے بعد آگے بارڈر کی طرف سے ہمیں ٹارچ کی ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ٹارچ کی لائٹ صرف ایک لمحے کے لئے ہی جلی تھی اوراس کے بعد بجھ گئی۔وہ ہمارا ہی ڈنکر تھا جو ایرانی گاؤں سولدان سے آیا تھا۔وہ ادھر بارڈر کے اوپر ہی چھپا ہوا ایرانی گشتی پارٹیوں کی نقل وحرکت کو دیکھ رہا تھا۔سب حالات ٹھیک ہونے کی صورت میں ہی وہ سگنل دیتا تھا اور پھر ہم لوگ آگے بڑھتے تھے۔

یورپی ممالک میں رہنے والے کچھ دوست اسے حیرانگی سے پڑھیں گے کیونکہ یہاں پر حالات خراب نہیں ہیں، دہشت گردی نہیں ہے۔یونان سے مقدونیا یا مقدونیا سے سرجیا کا بارڈر کراس کرنا مشکل تو ہے لیکن ان بارڈرز پر جان کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا،لیکن پاکستان اور ایران کا بارڈر ان سب سے خطرناک ہے۔2006ء میں حالات زیادہ خراب تھے اور ایران والے بارڈر کراس کرنے والے کسی بھی آدمی کو گولی مار دیتے تھے۔ایسے واقعات روزانہ تو نہیں ہوتے تھے مگر پھر بھی مہینے میں ایک بار جب کوئی بہت ہی ظالم فوجی ڈیوٹی پر ہوتا تھا تو وہ گولی ماردیتا تھا۔یہ گشتی پارٹی والے فوجی ہوتے ہیں اور اگر کوئی لڑکا ان کی گولی کا شکار ہو جاتا ہے تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس کی گولی سے مرا ہے۔وہ عموماً پاکستانی لڑکا ہوتا ہے اور ایران والے انکوائری کی بھی زحمت نہیں کرتے۔

ڈنکروں نے لائٹ کا اشارہ دیکھ لیا تو وہ ہم لوگوں کو لے کر بارڈر کی طرف چل پڑے۔ہم لوگ بہت دھیمی رفتار سے چل رہے تھے۔سارے ڈنکر ہمارے پیچھے پیچھے تھے،صرف ایک ڈنکر آگے آگے چل رہا تھا۔یہ لمحہ سب سے زیادہ حساس اور خطرناک تھا۔کسی بھی وقت کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ڈنکروں کا تو یہ روز کا کام تھا لیکن ہم سب لڑکے پہلی بار کسی ملک کا بارڈر کراس کر رہے تھے۔اگلے پندرہ منٹ میں ہم پاکستان سے ایران چلے جاتے۔ایک نیا ملک،نئی زبان،سب کچھ ہی ان پندرہ منٹ میں بدلنے والا تھا۔

غیر قانونی طریقے سے بارڈر کراس کرنا زندگی اور موت کا معاملہ ہوتا ہے اور ہم اسی زندگی اور موت کے دوراہے پر آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ابھی ہم بارڈر سے صرف کچھ قدم ہی دور تھے جب مشین گن کا ایک لمبا برسٹ

فائر ہوا۔ ہماری بدقسمتی کہ ایران کی کوئی گشتی پارٹی خلاف معمول ادھر نکلی تھی اور انہوں نے ہم لوگوں کو دیکھ لیا تھا۔ برسٹ انہی کی طرف سے فائر کیا گیا تھا۔

''بیٹھو بیٹھو! نیچے بیٹھو! مادر۔۔۔ نیچے بیٹھو!'' ہم لڑکے مشین گن کا برسٹ سن کر بھاگنے لگے تھے لیکن ڈنکروں نے ہمیں بھاگنے سے روک لیا۔

وہ ہماری پوری قطار میں ایسے کھڑے تھے کہ ان پانچ ڈنکروں نے ہمیں تقریباً گھیرا ہوا تھا۔ جب ہم فائرنگ سے ڈر کر بھاگنے لگے تو ان ڈنکروں نے ہمیں روک لیا اور مار مار کر نیچے زمین پر بٹھانے لگے۔

ایک منٹ سے بھی کم وقفے میں ان ڈنکروں نے ہم سب لڑکوں کو زمین پر بٹھا دیا۔ مشین گن کا صرف ایک ہی برسٹ فائر ہوا تھا۔ ہمیں دور بارڈر کی دوسری طرف ایک فوجی گاڑی کھڑی ہوئی نظر آ گئی۔ گاڑی کی لائٹس آن تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور گاڑی بھی ادھر آ کر کھڑی ہو گئی اور ایک اور برسٹ مارا گیا۔ اب کی بار وہ برسٹ ہم سے کچھ فاصلے پر مارا گیا اور یہی ان ایرانی فوجیوں نے غلطی کر دی۔ وہ برسٹ ہم کو ڈرانے کے لئے تھا اور ہمارے اتنے نزدیک گولیوں کے برسٹ لگنے سے مٹی اور روشنی اوپر کی طرف اٹھی۔ اسی اثناء میں لڑکے ڈنکروں کی پرواہ کئے بغیر پیچھے کی طرف بھاگنے لگے۔

تقریباً ایک کلومیٹر دور پاکستان کی بھی چوکی تھی۔ انہوں نے جب دوسرے برسٹ کی آواز سنی تو وہ بھی ادھر لائٹیں مارنے لگے۔ چالیس پچاس لڑکے روشنی میں جب ادھر ادھر بھاگتے نظر آئے تو ایرانی فورسز والے لگا تار فائرنگ کرنے لگے۔ اب کی بار وہ اوپر کی طرف مشین گن کا منہ کر کے فائر کر رہے تھے۔ میں نوید کا بازو پکڑ کر پیچھے کی طرف بھاگنے لگا۔ میں نے ایک ڈنکر دیکھ لیا تھا اور اب میں نوید کو لے کر اسی ڈنکر کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ آدھے گھنٹے تک سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایرانی گشتی پارٹی تھوڑی دیر فائرنگ کرنے کے بعد واپس چلی جائے گی تو ڈنکر ہمیں ڈھونڈنا شروع کر دیں گے اور ایک بار پھر بارڈر کراس کرنے کی کوشش کریں گے۔

گولیاں گورنمنٹ کی طرف سے فری ہوتی ہیں اور یہاں پر ان کا آزادانہ استعمال ہو رہا تھا۔ اتنی زیادہ فائرنگ میں کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے نوید کا ہاتھ بہت مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ اچانک مجھے نوید کی ایک چیخ سنائی دی اور وہ زمین پر گر گیا۔ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور میں بھاگنے کی وجہ سے تھوڑا آگے نکل گیا۔ میں نے جلدی سے اپنے آپ کو روکا اور واپس آ گیا۔ نوید ابھی تک زمین پر گرا ہوا تھا۔

''نوید! جلدی کرو، اٹھو ادھر سے! تھوڑا مزید پاکستانی علاقے میں چلے جاتے ہیں۔'' اچانک فائرنگ چلتی چلتی رک گئی اور مجھے نوید کے کراہنے کی آواز آنے لگی۔ گشتی پارٹی اب واپس جا رہی تھی۔

''نوید! اٹھو یار جلدی کرو، بس تھوڑی دور اور چلے گئے تو پھر کچھ خطرہ نہیں ہوگا۔'' ڈنکر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

''نوید!'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا تو وہ میرے ہاتھ میں جھول گیا۔ میں نے اس کے چہرے کو ہاتھ سے اٹھایا تو اس کی گردن پیچھے کی طرف گر گئی۔

''نوید! نوید!'' میں نے اس کا سر گود میں رکھ کر اس کا سینہ ٹٹولا تو میرے ہاتھوں خون سے تر ہو گئے۔

بارڈر کی طرف چلائی گئی کوئی گولی میرے دوست نوید کو چاٹ گئی تھی۔ گولی سیدھی پیچھے کی طرف سے لگی اور اس کا دل پھاڑ کر نکل گئی تھی۔ نوید فوت ہو گیا تھا۔ مجھے اس کی ایک ہلکی سی چیخ ہی سنائی دی تھی اور وہ ایک لمحے میں ہی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ میں اس کا سر گود میں رکھ کر وہیں بیٹھ گیا۔ صرف کچھ دیر پہلے ہی وہ میرے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔

تین چار بہنوں کا اکلوتا بھائی اپنے گھر کے اچھے مستقبل کے لئے اس ملک کو چھوڑنا چاہتا تھا لیکن اس ملک کی مٹی نے اس کو اپنا مستقل قیدی بنا لیا تھا۔ نوید کی موت بلوچستان کے ان صحراؤں میں ہی لکھی ہوئی تھی اور وہ وہیں اپنی زندگی کی بازی ہار گیا، لیکن جاتے جاتے اپنے بوڑھے ماں باپ اور بہنوں کو اکیلا چھوڑ گیا۔ یورپی ممالک کے لوگ کہتے ہیں کہ آپ کو اپنے ملک میں جان کا خطرہ نہیں ہے اس لئے ہم آپ کو پناہ نہیں دے سکتے۔ مجھے ان یورپ والوں سے صرف یہی پوچھنا ہے کہ اگر ہمیں پاکستان میں کوئی خطرہ نہیں ہے تو پھر نوید کیوں مر گیا؟

اس دنیا میں سب سے بڑی حقیقت بھوک ہے اور یہی بھوک ہم انسانوں کو در در کے دھکے کھانے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ وہی بھوک ہے جس کے لئے آج نوید نے جان دے دی تھی۔ میں اس کا سر گود میں لئے لیٹا ہوا تھا۔ فائرنگ مکمل طور پر رک گئی تھی۔ میری آنکھوں سے مسلسل آنسو نکل رہے تھے لیکن میرے حلق سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ میرا پورا جسم درد سے کٹ رہا تھا لیکن پھر بھی میرا حلق آواز نکالنے سے قاصر تھا۔ شاید میں پاگل ہو گیا تھا۔ جو نوید کی ڈیڈ باڈی کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔

میری آنکھوں کے سامنے نرما کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ وہ پیاری سی خوبصورت لڑکی اپنے بھائی کی پہلی تنخواہ کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے پچیس تیس ہزار کا ایک چیک تو ضرور ملتا جو گورنمنٹ آف پاکستان مرنے والوں کے لواحقین کو ادا کرتی ہے لیکن بھائی کبھی نہ ملتا۔ بہنیں پاگل ہوتی ہیں جو اپنے بھائیوں سے اتنی محبت کرتی ہیں۔

پاکستانی آرمی اور ایف سی کی گاڑیاں اب اس بارڈر ایریا میں گھوم رہی تھیں۔ وہ بکھرے ہوئے لڑکوں کو اکٹھا کر رہی تھیں کیونکہ اگر کوئی لڑکا دہشت گردوں کے ہاتھ چڑھ جاتا تو وہ دہشت گرد ان لڑکوں کے بدلے بھاری تاوان وصول کرتے تھے اور بعض اوقات لڑکوں کو جان سے بھی مار دیتے تھے۔ آرمی اور ایف سی کی گاڑیاں انہی بکھرے ہوئے لڑکوں کو ان دہشت گردوں سے بچانے کے لئے ڈھونڈ رہی تھیں۔

کچھ ہی دیر میں ایک گاڑی ہماری طرف آ گئی۔ گاڑی سے ایک صوبیدار رینک کا افسر نیچے اترا اور نوید کی ڈیڈ باڈی دیکھ کر اس کی آنکھوں میں غصے اور بے بسی کے ملے جلے تاثرات ابھر آئے۔ وہ ادھیڑ عمر صوبیدار پنجاب کے کسی دیہی علاقے کا رہنے والا تھا۔ صوبیدار پنجابی میں ایرانیوں کو گالیاں دینے لگا۔ کوئی بہت بڑا قصور بھی نہیں تھا، صرف بغیر ویزے کے بارڈر ہی کراس کر رہے تھے اور اس کی سزا موت مل رہی تھی۔

صوبیدار نے آگے بڑھ کر نوید کی گردن پر ہاتھ رکھا۔ اسے مرے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی اور اب اس کا جسم آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہونا شروع ہو گیا تھا۔

''بیٹا! اس لڑکے کا سر نیچے رکھ دو اور ادھر گاڑی میں آ جاؤ۔'' صوبیدار نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو میں اس کی طرف بے بسی سے دیکھنے لگا۔

ایک سپاہی نے جلدی سے آگے بڑھ کر نوید کا سر میری گود سے اٹھایا اور اسے زمین پر رکھ دیا۔ نوید کا سر میری گود سے نکلا تو میں خاموشی سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور گاڑی کے ٹائروں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ صوبیدار نے یوں مجھے ٹیک لگاتے ہوئے دیکھا تو جلدی سے آگے بڑھ کر مجھے ادھر سے اٹھانا چاہا لیکن میری آنکھوں میں نمی دیکھ کر خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا اور وائرلیس پر پیچھے یونٹ ہیڈ کوارٹر پر رابطہ کرنے لگا۔

سرحدی یونٹ نزدیک ہی تھی اور بارڈر ایریا میں گاڑیاں چوبیس گھنٹے آپریشنل حالت میں ہوتی ہیں اس لئے تیس چالیس منٹ میں آرمی کی مزید تین گاڑیاں ادھر آ گئیں۔ ایک گاڑی میں آرمی کا ہی ایک ڈاکٹر اور دوسرا

میڈیکل سٹاف کے سپاہی تھے۔ ڈاکٹر نے نوید کی ڈیڈ باڈی کا معائنہ کیا۔ گاڑی کی ہیڈ لائیٹ کی روشنی میں نوید کی تصویریں لیں اور اسے گاڑی میں ڈال لیا۔ میں بھی اٹھ کر نوید کی ڈیڈ باڈی کے ساتھ بیٹھنے لگا تو ایک آرمی آفیسر نے مجھے کندھے سے پکڑ کر روک لیا۔

''بیٹا! آپ ہمارے ساتھ دوسری گاڑی میں جاؤ گے۔'' میری آنکھیں آنسوؤں سے خشک ہو گئیں تھیں۔ حلق تو بہت پہلے ہی خشک ہو گیا تھا، اب آنکھیں بھی خالی ہو گئیں تھیں۔ میں نے افسر کی طرف دیکھا تو وہ میرے کندھے پر تھپکی دینے لگا۔

''بیٹا! حوصلہ رکھو، خدا کو یہی منظور تھا۔ بھائی تھا تمہارا؟'' اس نے سوال کیا تو میں نے سر ہلا دیا۔ نوید بھائی ہی تو تھا میرا، بلکہ شاید بھائی سے بھی بڑھ کر تھا۔ اس افسر نے مجھے ایک دوسری گاڑی میں بٹھایا اور ساری گاڑیاں ہمیں لے کر یونٹ ہیڈ کوارٹر آ گئے۔

یہ ایک بہت بڑی قلعہ نما عمارت تھی۔ جسے عارضی طور پر یونٹ کی طرز پر استعمال کیا جاتا تھا۔ احاطے کے اندر دس بارہ فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں اور اسلحہ سے لیس فوجی جوان پہرہ دے رہے تھے۔ اس احاطے کے اندر ایک بڑی سی عمارت کو ہسپتال کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور اسی کے ساتھ منسلک ایک کمرہ آپریشن تھیٹر تھا۔ نوید کی ڈیڈ باڈی کو اسی آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا۔ آرمی والے مجھے لے کر ایک اور کمرے میں آ گئے۔ وہاں پر انہوں نے میرے بوٹ اتروا کر میرا منہ ہاتھ دھلوایا اور ایک بریڈ کھانے کے لئے دیا۔ میں خاموشی سے بریڈ کھانے لگا۔

''سر! جب میں اس لڑکے کے پاس پہنچا تھا تو اس نے ڈیڈ باڈی کا سر اپنی گود میں رکھا ہوا تھا۔ بالکل خاموش۔۔۔تب سے لے کر اب تک ایک لفظ بھی نہیں بولا ہے۔''

''بھائی تھا اس کا۔۔۔شاید بہت زیادہ صدمہ لگ گیا ہے۔'' صوبیدار نے اس نوجوان آفیسر کو کہا تو اس نے سر ہلا دیا۔

ایک گھنٹے تک دوسری فوجی گاڑیاں بھی لڑکوں کو اکٹھا کر کے لے آئیں تھیں۔ تیس کے قریب لڑکے مل گئے تھے جبکہ باقی لڑکوں کو ڈنکر بچا کر لے گئے تھے۔ ڈنکر ایک بھی ان لوگوں کے ہتھے نہیں چڑھا تھا۔ ڈنکر مقامی تھے اور ان کو محفوظ راستوں کا پتہ ہوتا ہے۔ یہ اتنی جلدی آرمی یا ایف سی کے ہاتھ نہیں لگتے تھے۔ مجھ سمیت تقریباً تیس کے

قریب لڑکوں کو ایک بڑے کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔

آرمی والے اب ایک ایک لڑکے کے کوائف لکھنے لگے۔ اس زمانے میں بارڈر کراس کرنا اتنا بڑا جرم نہیں ہوتا تھا۔ زیادہ تر لڑکوں کو ویسے ہی چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اگر کوئی زیادہ ہی سختی ہو تو عدالت میں جج کے پاس ہمارے کوائف جاتے تھے اور عام طور پر جج چار پانچ ہزار روپے جرمانہ کر کے چھوڑ دیتا تھا۔

کوائف لکھوانے کی میری باری آئی تو میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ سامنے احاطے میں ایک بڑی ٹیبل لگی ہوئی تھی اور اس پر تین آرمی کے آفیسر بیٹھے ہوئے تھے، ان میں ایک تو کیپٹن رینک کا آفیسر تھا جو درمیان میں بیٹھا ہوا تھا۔ جبکہ باقی دونوں چھوٹے درجے کے نان کمیشنڈ آفیسر تھے۔ کیپٹن وہی تھا جو نوید کی ڈیڈ باڈی اٹھا کر لایا تھا۔ میں اب نوید کے مر جانے کے اچانک صدمے سے باہر نکل آیا تھا اور کچھ سنبھل گیا تھا۔

''بیٹا! کرسی پر بیٹھ جاؤ۔'' کیپٹن مجھ سے عمر میں زیادہ سے زیادہ دس سال بڑا تھا لیکن وہ مجھے بیٹا کہہ کر بلا رہا تھا بلکہ وہ ہر لڑکے کو بیٹا ہی کہہ کر پکار رہا تھا۔

ہم سارے لڑکے ان کے لئے بچوں کی مانند ہی تھے۔ نادان بچے تھے جو اپنا ملک اور گھر بار چھوڑ کر انجان راستوں کے مسافر بن رہے تھے۔ میں نے کرسی کو پیچھے کی طرف کھینچا اور آرام سے اس پر بیٹھ گیا۔ میرا چہرہ پتھر کی طرح ساکت ہو گیا تھا۔ ہر قسم کے تاثرات سے مکمل طور پر عاری۔۔۔ میں ان لوگوں کے چہروں کی طرف دیکھنے لگا۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' کیپٹن نے میری طرف بسکٹ کا پیکٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''رضوان علی۔۔۔سر! بہاولپور سے آیا ہوں۔'' میں نے ڈبے سے ایک بسکٹ پکڑ لیا اور اس کے دو ٹکڑے کر کے ایک ٹکڑا منہ میں ڈال لیا۔

''اوئے تم بہاولپور سے ہو؟ وہاں سے تو لڑکے ڈنکی لگانے کے لئے نہیں آتے ہیں۔''

یہ حقیقت تھی 2006ء میں ایک ہزار میں سے کوئی ایک لڑکا ہی بہاولپور کا ہوتا تھا۔ باقی سارے لڑکے اپر پنجاب کے ہوتے تھے۔ بہاولپور کے لوگ زیادہ تر سعودی عرب اور دوبئی تک ہی جاتے تھے۔ ان کے لئے سات سمندر پار یہی دو ملک تھے۔

''بیٹا! بہت افسوس ہوا تمہارے بھائی کے مرنے کا، ابھی اس کی مرنے کی عمر نہیں تھی لیکن خدا کے آگے کس کی مرضی چلتی ہے۔'' وہ مجھ سے نوید کی موت کا افسوس کرنے لگا۔ میری آنکھوں میں ایک بار پھر پانی اترنے لگا۔

''نام کیا تھا تمہارے بھائی کا؟'' کیپٹن نے ٹشو پیپر کا ڈبہ میری طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''جی نوید مسیح۔۔۔کرسچن تھا، کراچی میں اس کا گھر ہے۔'' میں نے ٹشو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

''کیا وہ تمہارا بھائی نہیں تھا اور وہ کراچی کا رہنے والا ہے؟'' کیپٹن نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

''تم دونوں صرف دوست تھے ایک دوسرے کے؟'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے۔ کیا آپ کو اس کا ایڈریس پتہ ہے یا پھر آپ راستے میں ہی اس کے دوست بنے تھے؟'' کیپٹن نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں، سر! کراچی میں اسٹیشن کے پاس ٹائلٹ بنے ہوئے ہیں۔ وہ ٹائلٹ نوید کے والد نے کرائے پر لئے ہوئے ہیں۔ وہیں سے ایک گلی اندر کی طرف ان کا گھر بھی ہے۔ میں نے ایک مہینہ ان کے ہاں ملازمت بھی کی ہے۔'' میں کیپٹن کو نوید کے گھر کا تفصیلی پتہ بتانے لگا۔ ساتھ میں بیٹھا ہوا ایک ٹائیک رینک کا کلرک نوٹ کرنے لگا۔

''تم یونان جا رہے ہو یا پھر مسقط اور دوبئی کی ڈنکی لگا رہے تھے؟'' میں کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہوا تو کیپٹن نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''سر! میں صرف ایران تک ہی جا رہا تھا۔ میرے پاس ایران سے آگے جانے کے پیسے نہیں تھے اس لئے صرف ایران تک ہی جا رہا تھا۔'' میں نے ان تینوں فوجیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! آپ باقی لڑکوں کے ساتھ جا کر بیٹھو۔ کل صبح آپ کو جج کے سامنے پیش کیا جائے گا اور پھر وہی فیصلہ سنائیں گے۔ ایک دو دن تک آپ کو آپ کے گھروں کی طرف بھیج دیا جائے گا۔ بیٹا! کوشش کرو کہ بیرون ملک ویزہ لے کر جاؤ، بغیر ویزے کے ڈنکی کا سفر زندگی اور موت کا سفر ہوتا ہے۔ تم ابھی نوجوان لڑکے ہو، زندگی کی اہمیت سمجھو۔ اس بارڈر نے پتہ نہیں کیسے کیسے نوجوان خوبصورت لڑکے نگل لئے ہیں۔'' میں خاموشی سے پیچھے کی

طرف مڑا اور واپس کمرے میں آ گیا۔ میرے جانے کے بعد باقی رہ جانے والے لڑکے بھی ایک ایک کر کے جاتے رہے اور اپنے اپنے کوائف لکھواتے رہے۔

میں واپس آ کر کمرے کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میں نے آہستگی سے آنکھیں بند کی تو ایمان پتہ نہیں کہاں سے میرے تخیل میں اچانک نمودار ہوگئی۔ وہ میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی تھی اور میرے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے صرف ایک لمحے کے لئے اس کی طرف دیکھا اور دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

''ناراض ہو راضی مجھ سے؟ اپنی ایمان سے ناراض ہو؟'' ایمان نے میرے گالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

''نہیں ایمان! میں کون ہوتا ہوں تم سے ناراض ہونے والا، اور تم کو فرق بھی تو نہیں پڑتا ہے نا میرے ناراض ہونے یا نہ ہونے سے؟ خدا کی ناراضگی بندوں کے لئے مشکلات کا باعث بنتی ہے۔ بندوں کی ناراضگی سے خدا کی خدائی تو نہیں رک جاتی۔ اسے کوئی فرق نہیں پڑتا وہ خدا ہی رہتا ہے۔'' میرے جسم کا ایک ایک رنگ ایمان کو دیکھنے کے لئے تڑپ رہا تھا لیکن میں ضبط کر کے بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے اپنی ناراضگی کا اظہار اس خدا کے سامنے کرنا تھا اور اس کے لئے میں اپنے پورے جسم سے لڑ رہا تھا۔

''راضی! یہ جو محبت ہوتی ہے یہ انسان کو خدا سے ملانے کی کوشش کرتی ہے۔ جب عشق کی انتہا تک پہنچو گے نا تو سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔ نوید کی موت کا مجھے بھی دکھ ہوا ہے۔ چار بہنوں اور بوڑھے ماں باپ کا اکلوتا سہارا تھا لیکن آپ خدا کے فیصلوں میں دخل اندازی تو نہیں کر سکتے۔'' وہ اٹھ کر جانے لگی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ایمان! سارے فیصلے ہی ٹھیک ہوتے ہیں لیکن اس خدا نے تمہارے اور میرے ساتھ ہی کیوں بے انصافی کی؟ آخر ہم دونوں ہی کیوں ملے تھے اس خدا کو اپنی خدائی دکھانے کے لئے۔'' میری آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔

''راضی! خدا سے شکوہ نہیں کرتے بلکہ اس سے صرف مانگتے ہیں۔ نہ دینے کی وجہ ہم نہیں پوچھتے۔ مسلمان رہو راضی مسلمان۔'' اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑوایا اور میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

میری کتاب پڑھنے والے قارئین اسے کوئی جادوئی کہانی نہ سمجھیں۔ کراچی سے جرمنی تک کے تمام سفر میں ایمان کی یادیں ہی میرے ساتھ سفر کرتی تھیں۔ میرا اپنا ذہن ایمان کا تصور بنا لیتا تھا اور میں اس سے خیالی باتیں کر

کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا تھا۔ میرے جیسے کئی قارئین بھی ہوں گے جن کو محبوب تو نہیں ملتا لیکن وہ جاگتی آنکھوں سے ہی محبوب کے سپنے دیکھتے ہیں اور اپنی مرضی سے محبوب کی محبت حاصل کرتے ہیں۔

میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا تھا۔ میں جب حالات کے ستم سہتے سہتے ٹوٹ جاتا تھا تو ایمان کے خیالات کو ذہن میں لا کر اپنے آپ کو ٹوٹنے سے بچاتا تھا۔ ایمان کی یادیں مجھے نیا حوصلہ اور نئی طاقت دیتی تھیں۔ صبح ہونے میں ابھی چھ گھنٹے باقی تھے۔ ہم سارے لڑکے ایک ایک کر کے سو گئے تھے۔

دوسرے دن صبح 9 بجے کے قریب ہمیں ایک بڑی فوجی گاڑی میں تربت لے جایا گیا۔ وہاں سے ہمیں پولیس نے رسیو کیا اور ہم سب لڑکوں کو تربت تھانے کے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ نوید کی ڈیڈ باڈی کو رات ہی کراچی لے گئے تھے۔ پوسٹمارٹم وغیرہ شاید کراچی میں ہی ہوتا۔ اس چیز کا مجھے پتہ نہیں تھا۔ مجھے رات کو نوید کا چہرہ دیکھنے کے لئے لے جایا گیا۔ ایک ہنستا مسکراتا ہوا لڑکا ایک لمحے میں ہی ہمیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا تھا۔ اسے کچھ کہنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ ایک منٹ سے بھی کم وقفے میں موت نے اسے کھا لیا تھا۔

میرے اندر نوید کا چہرہ دیکھنے کی ہمت نہیں تھی لیکن پھر بھی مجھے اس کا چہرہ آخری بار تو دیکھنا ہی تھا کیونکہ اس کے بعد میں ساری زندگی اس کا چہرہ نہ دیکھ سکتا تھا۔ بچھڑنے والے تو کبھی نہ کبھی مل ہی جاتے ہیں لیکن جو اس دنیا سے ہی چلا جاتا ہے وہ کبھی پھر لوٹ کر واپس نہیں آتا۔

نوید نے اپنے پیچھے بہت سے رونے والے چھوڑے تھے اور ان میں ایک میں بھی تھا۔ اس کا ملازم، اس کا بھائی، اس کا دوست۔۔۔ وہ میرے لیے سب کچھ تھا اور آج سب کچھ چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ میں ایک بار کراچی جانا چاہتا تھا۔ نرما اور نوید کے ماں باپ کو دیکھنا چاہتا تھا لیکن میرے اندر اتنی طاقت نہیں تھی جو میں نرما کا سامنا کر سکتا۔ وہ لوگ اپنے دوسرے بیٹے کو انہی راستوں پر جاتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن مجھے تو بہر حال جانا ہی تھا۔ جس راستے کا میں مسافر بن گیا تھا اس راستے پر اب موت ہی مجھے جانے سے روک سکتی تھی۔ محبت دل کا روگ بن گئی تھی۔

تربت کا یہ تھانہ کسی یورپین تھانے کی طرح لگتا تھا۔ ایک بہت بڑی کوٹھی نما عمارت تھی جس کے اندر تین چار گاڑیوں کے کھڑے ہونے کی جگہ تھی۔ اندر سات آٹھ سنگل سٹوری کمرے تھے۔ دو کمروں کے آگے لوہے کی جالی لگا کر اسے سیل بنا دیا گیا تھا اور آپ حیران ہوں گے کہ ان دونوں سیل کے اندر اٹیچ باتھ رومز بھی تھے۔ ایک کمرے کو ٹارچر سیل کی طرز پر استعمال کیا جاتا تھا۔ آرمی والے تو بہت شریف اور رحم دل بھی ہوتے ہیں مگر یہ پولیس والے ان

سب چیزوں سے عاری تھے۔

ہمیں یہاں تھانے میں آئے ابھی صرف آدھا گھنٹہ ہی ہوا تھا جب ایک سپاہی نے لاک اپ کا دروازہ کھولا اور ایک لڑکے کا بازو پکڑ کر اسے ٹارچر روم میں لے گیا۔ اگلے دو منٹ بعد ہی لڑکے کی چیخوں کی آواز سنائی دی۔ دو تین بار مارنے کے بعد وہ تھک گئے تھے اور پھر اگلے دس منٹ تک خاموشی ہی رہی۔ اب وہ لڑکے کا بیان لکھ رہے تھے۔

دس منٹ بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور وہی سپاہی اس لڑکے کا بازو پکڑ کر اسے باہر لے آیا۔ اس نے لڑکے کو لاک اپ میں ڈالا اور ایک اور لڑکے کو پکڑ کر لے گیا اور پھر وہی کاروائی دوبارہ سے شروع ہوگئی۔ وہ ایک ایک لڑکے کو پکڑ کر لے جاتے رہے اور اس سے مار مار کر پوچھ گچھ کرتے رہے۔

وہ لڑکوں سے ان کے ایجنٹوں کے نام و پتہ پوچھ کر لکھ رہے تھے۔ ایجنٹوں کو پتہ تھا کہ یہ لڑکے پولیس کی ایک منٹ کی مار بھی نہیں سہہ سکیں گے اور وہ غلط نام و پتہ بتاتے تھے۔ پولیس والے بھی بس خانہ پری کرتے تھے۔ ان کا زیادہ دھیان لڑکوں کے پاس موجود پیسوں پر ہوتا تھا جو لڑکوں نے اپنے کپڑوں میں چھپائے ہوتے تھے۔ پولیس والے ڈرانے دھمکانے کے لئے پہلے ہی مارنے لگتے تھے تا کہ لڑکا سب کچھ نکال دے۔ باقی کے چھتر لڑکے پر منحصر ہوتے ہیں کہ وہ کتنے کھا کر سچ بولتے ہیں۔

میری باری ساڑھے گیارہ بجے کے قریب آئی۔ پولیس والا مجھے لے کر اندر کمرے میں چلا گیا۔ وہاں پر پہلے سے تین پولیس والے موجود تھے۔ انہوں نے مجھے زمین پر اوندھے منہ لٹایا اور دو پولیس والوں نے مجھے ہاتھوں اور پیروں سے پکڑ لیا۔ ان کے پاس چمڑے کا بہت بڑا جوتا تھا اور اس پر حقیقت میں ''جی آیانوں'' لکھا ہوا تھا۔ میں نے صرف سن رکھا تھا لیکن اس تھانے میں وہ جوتا حقیقت میں موجود تھا اور اس پر لکھا بھی ہوا تھا۔

دونوں پولیس والوں نے مجھے ہاتھوں اور پیروں سے پکڑا ہوا تھا۔ تیسرے پولیس والے نے میری پشت پہ پیر رکھا اور اسے نیچے کی طرف دبا دیا۔ صرف چوتھا پولیس والا رہ گیا تھا۔ اس نے جوتا اٹھایا، ہوا میں لہرایا اور پھر پوری قوت سے مار دیا۔ درد کی ایک تیز لہر میرے جسم میں محسوس ہوئی اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ پولیس والے نے اس کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا جوتا مارا۔ میں خاموشی سے ان کے جوتے سہتا رہا۔

''ہاں! تو بچے۔۔۔اب کھڑے ہو جاؤ اور اپنا نام اور پتہ لکھواؤ۔ کدھر سے آئے ہو اور کونسے ملک جا رہے تھے؟'' ایک پولیس والے نے مجھے بازو سے پکڑا اور کھڑا کر دیا۔

''جی! میں بہاولپور سے آیا ہوں اور ایران جا رہا تھا۔'' میں نے نارمل لہجے میں کہا۔ میرے پیٹھ پر ابھی تک جلن ہو رہی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ اپنا پورا نام پتہ لکھواؤ اور پیسے بھی بتاؤ کہ گھر سے کتنے لے کر نکلے تھے، ابھی کتنے ہیں اور ایجنٹ کو کتنے دیئے؟'' میں نے اپنا نام پتہ لکھوایا۔ اس وقت میری جیب میں ٹوٹل چار سو پچاس روپے تھے باقی ڈالر تو میری شرٹ میں سلے ہوئے تھے۔ پولیس والے چار سو پچاس کا نام سن کر ہی غصے میں آ گئے۔

''بچے! ہمارے ماتھے پر بے وقوف لکھا ہوا ہے؟ تم جیسے پتہ نہیں کتنے بے غیرتوں کو ہم روزانہ پکڑتے ہیں۔ ابھی ماں کا دودھ بھی نہیں پیا ہوا ہوتا ہے کہ باہر جانے کی جلدی لگ جاتی ہے۔ بچے! تمہارے جیسے بچونگڑے ہمیں بے وقوف نہیں بنا سکتے ہیں۔'' جوتے والے پولیس والے نے میرے چہرے پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔ اس کا ہاتھ کافی بھاری تھا۔ میرا وزن پچاس کلو کے قریب تھا۔ پولیس والے کے تھپڑ کے زور سے میں کمرے کی دیوار سے جا کر ٹکرایا

''اور کتنے پیسے بلکہ ڈالر ہیں تمہارے پاس، کدھر کدھر چھپائے ہیں؟ اگر خود بتا دو گے تو ٹھیک ورنہ اگر ہم نے نکال لئے تو اس کے بعد دوبارہ کبھی سیدھے لیٹ نہیں سکو گے۔'' اسی تھپڑ مارنے والے پولیس مین نے مجھے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں سر! آپ تلاشی لے سکتے ہیں۔ میرے پاس چار سو پچاس روپے سے اوپر کچھ بھی نہیں ہے۔'' میں دوبارہ سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔

''حنیف! اس کو دوبارہ زمین پر لٹا، کچھ زیادہ ہی تیز لڑکا لگ رہا ہے اور ابھی پینٹ بھی نیچے اتارنا۔ صرف ایک دو جوتوں سے ہی چڑیا کی طرح بولنا شروع کر دے گا۔'' ان لوگوں نے ایک بار پھر مجھے زمین پر الٹا لٹا دیا۔ اب کی بار انہوں نے میری شرٹ کے علاوہ پینٹ بھی نیچے کر دی اور جوتے مارنے شروع کر دیئے۔ اس نے لگاتار چار پانچ جوتے مارے۔ میرا جسم مکمل طور پر سن ہو گیا تھا۔ اس لیے کسی بھی قسم کے درد کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ صرف پہلے دو

جوتوں کا درد ہوا تھا۔اس کے بعد ذہن ہر قسم کے احساس سے عاری ہو گیا تھا۔

''ہاں بچے! اب بتا ایران سے آگے کدھر جا رہے تھے اور کتنے ڈالر ہیں تمہارے پاس؟'' ایک پولیس والے نے میری پینٹ اوپر کی اور مجھے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔میں کھڑا ہوا تو درد کی شدت سے میری ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں اور میں زمین پر گر گیا۔

''بس اتنی ہی جان تھی اندر؟ دو جوتے برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے تم لوگوں کے اندر اور یونان جانے کی بات کرتے ہو؟ کھڑا کرو اسے!'' ایک پولیس والے نے میرا بازو پکڑا اور پھر کھڑا کر دیا۔اب کی بار میں کھڑے ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

'' کتنے ڈالر ہیں تمہارے پاس؟'' اب کی بار حنیف نے مجھ سے پوچھا۔

''چار سو پچاس روپے ہیں۔اس سے زیادہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔'' میں نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''حنیف! تلاشی لو اس بے غیرت کی ، چار سو پچاس میں کون لڑکا بارڈر کراس کرتا ہے؟ بہاولپور سے آیا ہے، اس کے پاس تو یہاں سے واپس بہاولپور جانے کا بھی کرایہ نہیں ہے۔'' پہلے والے پولیس والے نے حنیف سے کہا تو اس نے میرے ہاتھ اوپر کی طرف کروائے اور میری تلاشی لینے لگا۔

''سر! غریب آدمی ہوں، کراچی میں مزدوری کرتا تھا وہیں سے نو ہزار اکٹھے کر کے ایجنٹ کو دے دیئے تھے۔ ایران جانا چاہتا تھا، وہاں مزدوری زیادہ ملتی ہے۔میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔'' میں وہیں کمرے کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور پتھرائی ہوئی نظروں سے ان پولیس والوں کی طرف دیکھنے لگا۔

''سر! میں غریب ضرور ہوں لیکن بے غیرت نہیں ہوں۔'' اگلے کئی لمحے پولیس والے میرے چہرے کی طرف دیکھتے رہے۔آخر ان میں سے قدرے ادھیڑ عمر آدمی جسے وہ سب سر کہہ رہے تھے اٹھا اور اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور کمرے میں رکھی ہوئی کرسی پر بٹھا دیا۔

''پانی پیئو گے؟'' اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''حنیف! جاؤ باہر سے پانی کی بوتل لے کر آؤ۔'' شاید ان میں حنیف ہی سب سے جونیئر تھا اس لیے سارے کام اسی کو کہے جا رہے تھے۔

وہ خاموشی سے اٹھا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔تھوڑی دیر بعد اس کی واپسی پانی کی بوتل کے ساتھ ہوئی۔اس نے پانی والی بوتل میری طرف بڑھا دی اور میں خاموشی سے پانی پینے لگا۔پانی پی کر انہوں نے مجھے کمرے سے باہر نکالا اور لے جا کر لاک اپ میں بند کر دیا۔ابھی ان کے کھانے کا وقفہ ہو گیا تھا۔

ایک بجے کے قریب پھر وہی سپاہی آیا اور ایک بار پھر لڑکوں کو ایک ایک کر کے ٹارچر روم میں لے جاتے رہے اور ان کے کوائف لکھتے رہے۔لڑکے بہت ڈرے ہوئے تھے اور وہ جاتے ہی سب کچھ بتانے کی کوشش کرتے تھے لیکن پھر بھی پولیس والے کسی کو بھی خالی نہیں بھیج رہے تھے۔سب کو دو دو تین تین جوتے مار کر ہی بھیجا جاتا تھا۔اس لیے لڑکے سب کچھ اگل دیتے تھے۔یہ سلسلہ شام پانچ بجے تک چلتا رہا۔تقریباً سارے لڑکوں کے کوائف انہوں نے لکھ لیے تھے۔

تقریباً چھ بجے کے قریب کھانا دینے والا آ گیا۔یہاں پر کھانا پیسوں سے خرید کر کھانا پڑتا تھا۔پچیس روپے کی چنے کی دال اور اس کے ساتھ دو روٹیاں تھیں۔مرغی پچاس روپے کی تھی اور تقریباً اتنی ہی قیمت کی بریانی تھی۔زیادہ تر لڑکوں نے چنے کی دال ہی خریدی تھی۔صرف تین چار لڑکے ہی ایسے تھے جنہوں نے مرغی یا بریانی خریدی۔شاید وہ کسی کھاتے پیتے گھرانے سے تھے۔

مجھے بھوک نہیں تھی اور ویسے بھی میرے پاس صرف چار سو پچاس روپے تھے اور میں ان پیسوں کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔یہ پیسے میرے ایران کے سفر میں کام آنے والے تھے۔میں خاموشی سے کمرے کی ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔میں نے کھانے کی طرف دیکھا۔ایک چھوٹے پلاسٹک بیگ میں مرغی کی دو بوٹیاں اور باقی شوربہ تھا۔جس کو اوپر سے گانٹھ دے کر باندھ دیا گیا تھا۔اس کے علاوہ ایک اخبار میں دو روٹیاں لپیٹ کر رکھی ہوئی تھیں۔میں لاک اپ کی سلاخوں کی طرف دیکھنے لگا۔وہاں پر وہی لڑکا کھانے والے کو پیسے دے کر ایک اور کھانا خرید رہا تھا۔وہ کھانا دے کر واپس آیا اور آ کر میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''میرا نام ندیم ہے۔محمد ندیم اور میں لاہور سے آیا ہوں۔آپ کا کیا نام ہے؟''

''میرا نام راضی ہے اور میں بہاولپور سے آیا ہوں۔'' میں نے اس خوبصورت سے نوجوان لڑکے سے ہاتھ ملایا۔

گول چہرہ اور بالکل چینیوں کی طرح سیدھے اور سلکی بال لیکن اس کی آنکھیں چینیوں سے بالکل مختلف موٹی موٹی اور چمکدار تھیں۔اتنی بڑی بڑی اور چمکدار آنکھیں میں نے بہت کم لوگوں کی دیکھی تھیں۔وہ اپنے چہرے سے ہی بہت ذہین لگ رہا تھا۔

''ندیم بھائی! آپ تو بہت پڑھے لکھے لگ رہے ہو؟ کدھر گمنام راستوں کے مسافر بن رہے ہو؟'' مجھے ندیم کو بھائی کہنا اچھا لگ رہا تھا۔

''راضی بھائی! یورپ میں بہت سکوپ ہے ترقی کرنے کا، وہاں انسان کے ٹیلنٹ کی قدر کی جاتی ہے۔'' اس نے روٹی کا ایک چھوٹا ٹکڑا توڑا اور اسے چنے کی دال میں بھگو کر منہ میں ڈال لیا۔وہ اپنے لیے چنے کی دال لے آیا تھا۔

''ندیم بھائی! لاہور میں کیا کرتے ہو آپ؟'' میں نے اپنے والا کھانا پھر اس کے سامنے کر دیا اور اس کی دال میں لقمے لگا کر کھانے لگا۔

''میں تک کمپوزر ہوں، پروفیشنل کمپوزر۔میں تحریروں کو خوبصورتی دیتا ہوں۔'' اس آدھے چینی لڑکے نے میرے آگے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔

''مرغی بھی کھاؤ بھائی! یہ بے چاری اب دوبارہ زندہ تو نہیں ہو گی نا؟'' اس نے مرغی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو میں خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔

کھانا کھانے کے بعد ہم دونوں کمرے کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔اس نے اپنے بارے میں سب کچھ بتایا۔محبت، نفرت، شرارت اور کام کرنے کا جنون۔۔۔وہ بہت باتونی تھا اور بالکل چینیوں کی طرح ذہین بھی تھا۔یورپ جانے کا جنون اتر گیا تھا اور اب وہ واپس لاہور جا کر اپنا الگ کمپوزنگ سنٹر بنانے کا ارادہ کر رہا تھا۔میں نے قریباً دس سال بعد انٹرنیٹ سے اسے تلاش کیا تھا اور میرا اب بھی اس سے رابطہ ہے۔وہی محبت اور شرارت کا ملا جلا اندازِ گفتگو۔۔۔وہ چینی لڑکا آج بھی نہیں بدلا ہے۔

رات کو تقریباً دس بجے کے قریب ایک بہت ہی خوفناک سا پولیس والا لاک اپ کا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

اس کی بہت بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ہم سب لڑکے سہم کر بیٹھ گئے۔ ہماری حالت ان مرغیوں جیسی ہوگئی تھی جو ایک ڈربے میں بند ہوتی ہیں۔اچانک قصائی ڈربے کا دروازہ کھول کر اندر آ جائے تو ساری مرغیاں سہم کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔اس پولیس والے کو ہماری حالت کا اندازہ ہو گیا تھا اور وہ زیرِلب مسکرانے لگا۔

''کل صبح نو بجے آپ سب کو عدالت لے کر جایا جائے گا۔جج نے آپ سب کو پانچ پانچ ہزار روپے جرمانہ کرنا ہے۔آپ میں سے جن لڑکوں کے پاس جرمانہ ادا کرنے کے پیسے نہیں ہیں، وہ اپنے ساتھی لڑکوں سے پیسے ادھار لے لیں یا کسی بھی طریقے سے کل بارہ بجے تک پیسوں کا انتظام کر لیں۔ورنہ آپ کو ایک مہینے تک جیل جانا پڑے گا۔اگر کسی لڑکے کو اپنے گھر فون کر کے پیسے منگوانے ہیں تو وہ فون کر سکتا ہے۔پچاس روپے کی ایک کال ہے۔'' تین چار لڑکے تھے جنہوں نے اپنے گھر کال کرنی تھی۔وہ ان لڑکوں کو لے کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

''بھائی! آپ پیسے کدھر سے لاؤ گے؟'' ندیم نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میرے پاس کھانے کے پیسے نہیں تھے۔جرمانے کے پانچ ہزار روپے کدھر سے آتے۔

''میں نے جرمانہ ادا نہیں کرنا ہے۔ایک مہینہ جیل میں رہنے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔جیل میں کھانا تو ملے گا نا؟ صرف ادھر تھانے میں ہی کھانا نہیں ملتا ہے اور ویسے بھی میرا بہاولپور میں کوئی بھی انتظار نہیں کر رہا ہے، مجھے آگے جانا ہے۔ایک مہینے بعد چلا جاؤں گا۔ مجھے تو سالوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور یہ تو پھر بھی ایک مہینہ ہے۔'' ندیم نے میری بہت منتیں کی کہ اس کے پاس پندرہ ہزار سے زیادہ روپے تھے۔اس کے علاوہ کچھ ڈالر بھی تھے۔

آدھے گھنٹے بعد ایک سول کپڑوں والا آدمی آیا اور وہ ڈالروں کے بدلے میں پیسے دینے لگا۔زیادہ تر لڑکوں کے پاس ڈالر ہی تھے۔ بازار میں ساٹھ روپے کا بکنے والا ڈالر وہ آدمی ادھر پچاس روپے میں خرید رہا تھا اور لڑکے مجبوری میں اسی ریٹ پر ڈالر فروخت کر رہے تھے۔اس آدمی کے جانے کے بعد پھر وہی مونچھوں والا سپاہی دوبارہ آیا اور وہ ان لڑکوں کے نام لکھنے لگا جن کے پاس پانچ ہزار روپے تھے یا جنہوں نے پانچ ہزار دوسرے لڑکوں سے لے کر پورے کر لیے تھے۔ہم ٹوٹل 32 لڑکے تھے۔ چوبیس لڑکوں نے پانچ ہزار پورے کر لیے تھے اور باقی مجھ سمیت آٹھ لڑکے رہ گئے تھے جن کے پاس ابھی تک پیسوں کا انتظام نہیں ہوا تھا۔مونچھوں والا آدمی ہمیں صبح تک پیسوں کا انتظام کرنے کا کہہ کر چلا گیا اور ہم سب لڑکے گہری سوچوں غرق پتہ نہیں کب سو گئے۔

صبح نو بجے کے قریب ہی ان لوگوں نے ہم سب لڑکوں کو جگا دیا۔ہم آٹھ لڑکوں میں سے چار لڑکوں کے تو

پیسوں کا انتظام ہو گیا تھا۔ پولیس والوں نے لڑکوں سے پانچ پانچ ہزار لے کر ان کے نام لکھنے شروع کر دیے اور ہم چار لڑکوں کو علیحدہ کر دیا اور ہمیں پیسے پورے کرنے پر زور دینے لگے۔

آٹھ بجے کے قریب چار میں سے تین لڑکوں کے ایجنٹ کا بھی فون آ گیا۔ اس کا آدمی آدھے گھنٹے میں ہی تھانے آ کر پندرہ ہزار روپیہ دے گیا۔ نوید کے مرنے کی وجہ سے میرا ایجنٹ بھاگ گیا تھا۔ اس نے موبائل کی سم نکال کر پھینک دی تھی۔ میری اور نوید کی اس سے ملاقات ایک ہوٹل پر ہوئی تھی۔ ہمیں اس کے گھر کا پتہ نہیں تھا۔ کراچی کے تھانے میں اس کے خلاف پرچہ کٹا ہوا تھا لیکن اس کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ میرے دیئے ہوئے نو ہزار ضائع ہو گئے تھے۔

نو بجے کے قریب ایک بس تھانے کے دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ یہ بس ہم لڑکوں کو لے کر کراچی جانے والی تھی۔ بلوچستان میں حالات خراب تھے اس لیے وہ کبھی بھی لڑکوں کو بلوچستان میں نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ وہ ہم کو بس میں ڈال کر کراچی چھوڑ دیتے اور اس کے بعد ہم آزاد تھے۔ کراچی سے ہم جدھر بھی جانا چاہتے جا سکتے تھے۔ بس میں ہم لڑکوں کو بٹھا دیا گیا۔

میں نے پانچ ہزار جرمانہ ادا نہیں کیا تھا لیکن پولیس والے نے جھوٹ بولا کہ ایجنٹ بیس ہزار دے کر گیا ہے۔ اس نے میری بھی پیمنٹ کر دی ہے لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ میرا ایجنٹ ہی نہیں تھا تو کیسے میری پیمنٹ ادا کر سکتا تھا لیکن میں خاموش رہا۔ جب بغیر پیسوں کے آزادی مل رہی تھی تو کیا ضرورت تھی کہ فالتو کی بکواس کرتا۔ میں خاموشی سے بس میں سوار ہوا اور بس ہم سب لڑکوں کو لے کر تربت سے باہر نکلنے لگی۔

تربت بہت چھوٹا سا شہر ہے۔ بس کو تربت شہر سے باہر نکلنے میں دس منٹ ہی لگے اور بس کراچی جانے والے راستے پر فراٹے بھرنے لگی۔ پولیس کی گاڑی صرف تربت شہر تک ہی بس کے ساتھ رہی اس کے بعد وہ واپس شہر چلی گئی۔ ہماری بس کو شہر سے نکلے آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت ہو گیا تھا۔ میں اور ندیم بس کی آخری سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ندیم کو روڈ پر دو بڑے بڑے ڈالے بس کا پیچھا کرتے ہوئے نظر آئے۔ وہ انتہائی تیز رفتاری سے ہماری طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔

''راضی بھائی! خدا خیر ہی کرے، ڈالے بہت خطرناک لگ رہے ہیں۔'' ندیم کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ ڈالے ہماری بس کے قریب ہی پہنچ چکے تھے اور اب بس کو کراس کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہماری بس روڈ کے ایک طرف ہوئی اور ان ڈالوں کو آگے جانے کا راستہ دے دیا۔ دونوں ڈالے بس سے آگے نکلے اور روڈ کے درمیان میں چلتے ہوئے بس کو روکنے کا اشارہ کرنے لگے۔

ڈرائیور نے بس کو آہستہ کرنا شروع کیا اور روڈ کے ایک طرف کر کے بریک لگا لیے۔ دونوں ڈالے سامنے کھڑے تھے اور ان میں سے ایک بلوچی اترا اور اس نے بس ڈرائیور کو نیچے آنے کا کہا۔ ڈرائیور نے بس کو سٹارٹ ہی رہنے دیا اور بس سے نیچے اتر کر اس بلوچی کی بات سننے لگا۔ وہ دونوں پانچ منٹ تک ایسے ہی بات کرتے رہے۔ اس کے بعد بلوچی ڈرائیور کو لے کر ڈالے کی طرف چلا گیا۔ ڈالے کی اگلی طرف بیٹھا ہوا آدمی نیچے اتر گیا اور بلوچی ہمارے بس ڈرائیور کو لے کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ صرف دو منٹ بعد بس ڈرائیور ڈالے سے نکل کر ہماری بس کی طرف آ گیا۔ ڈالے والوں نے ڈالوں کو موڑا اور ہماری بس کے نزدیک کھڑا کر دیا۔

''چلو بھئی! جلدی سے اٹھو اور اس ڈالے میں بیٹھ جاؤ۔ آپ لوگوں کو آج رات ہی بارڈر کراس کروا کر ایران پہنچا دیا جائے گا۔ چلو چلو جلدی کرو!'' بلوچی چیخ چیخ کر لڑکوں کو گاڑی میں بیٹھنے کا کہہ رہا تھا۔ لڑکے دو راتوں سے مسلسل ڈرے ہوئے تھے اور وہ گاڑی میں بیٹھنے کا رسک نہیں لے رہے تھے لیکن اس بلوچی نے زبردستی بازو پکڑ پکڑ کر لڑکوں کو بس سے نیچے اتارنا شروع کر دیا۔

''لڑکو! میرا دس ہزار روپیہ لگ گیا ہے اور تم نخرے کر رہے ہو۔ تین دن پہلے کراچی سے مند پہنچانے میں بھی میرا ستر ہزار لگ گیا تھا اور آج دس ہزار۔ میرا تم پر ٹوٹل اسّی ہزار روپیہ لگ گیا ہے اور تم بڑے آرام سے ادھر لیٹے ہوئے ہو؟'' اس بلوچی نے فارسی میں گالی نکالتے ہوئے کہا۔

''جس کو کراچی واپس جانا ہے وہ میرے لگے ہوئے پیسے واپس کر دے اور پھر چلا جائے۔ گھر سے یونان جانے کے لئے نکلے ہو اور پولیس کے دو چھتروں سے ڈر کر بھاگ رہے ہو؟'' اس نے ایک بھی لڑکے کو پیچھے نہ چھوڑا اور سب کو دوبارا ڈالے میں بٹھا لیا۔

''تم میں سے بشیر آسی کا لڑکا کونسا ہے؟'' بلوچی نے اونچی آواز میں میرے ایجنٹ کا نام دہرایا لیکن میں خاموش رہا۔

مجھے اندازہ تھا کہ نوید کے مرنے کی وجہ سے میرا ایجنٹ بھاگ گیا ہوگا اور اب میرے پیسے بھی کوئی نہیں دے گا اور یہ لوگ مجھے آگے لے کر نہیں جائیں گے۔ میں نے سوچا شاید وہ ایک ایک لڑکے سے ان کا ایجنٹ نہیں پوچھیں گے۔ بتیس لوگوں کے دس بارہ ایجنٹ تھے۔ مین روڈ پر خطرہ تھا، کسی بھی وقت پولیس یا آرمی کی گاڑی آسکتی تھی۔ اس لیے وہ بغیر پوچھ گچھ کے یہی لے جائیں گے۔ مند جا کر اگر وہ مجھے چھوڑ بھی دیتے تو کوئی بات نہیں تھی۔ مند سے آگے میں خود بارڈر کراس کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ اس لیے خاموشی سے کھڑا رہا۔

اس بلوچی نے کاپی نکالی اور ایجنٹوں کے نام پکارنے شروع کر دیئے۔ میرے اندازے کے برعکس صرف سات ایجنٹوں کے ہی لڑکے تھے۔ دو منٹ میں ہی لڑکے الگ ہو گئے اور میں اکیلا رہ گیا۔

''نام کیا ہے تمہارے ایجنٹ کا؟'' بلوچی نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی مجھے پتہ نہیں ہے، میں نوید کے ساتھ آیا تھا۔ اسے بارڈر پر گولی لگ گئی تھی۔ اسے ہی ہمارے ایجنٹ کا نام معلوم تھا۔'' میں نے نیچے زمین پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں! تم نوید کے ساتھ ڈنکی لگا رہے تھے۔ بس میں بیٹھ جاؤ! یہ تمہیں کراچی پہنچا دے گی۔ تمہارے بھائی کے مرنے کا مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔'' بلوچی واپس پلٹنے لگا جب میں نے اس کی قمیض کا پلو پکڑ لیا۔

''سر! مجھے بس اپنے ساتھ لے چلو میں نے ایران جانا ہے۔ میں نے ایجنٹ کو ایران جانے کے لئے پورے پیسے دیئے تھے۔ شاید نوید کے مرنے کی وجہ سے وہ غائب ہو گیا ہے اور میرے پیسے بھی ڈوب گئے ہیں۔ آپ صرف مند تک لے جاؤ آگے میں خود ہی کوشش کر کے بارڈر کراس کر لوں گا۔'' بلوچی واپس میری طرف پلٹا۔

''بیٹا! بات پیسوں کی نہیں ہے، تمہارا بھائی مرا ہے۔ مجھے لگا شاید تم اپنے گھر واپس جانا چاہتے ہو۔'' بلوچی نے میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! گھر چلے جاؤ، اس وقت ان لوگوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ ڈنکیاں تو بعد میں بھی لگتی رہیں گی۔'' بارڈر کراس کروانے والے وہ ایجنٹ صرف ظاہری طور پر ہی خطرناک لگتے تھے۔ ان کے سینوں میں بھی دل ہوتا ہے اور وہ بھی انسان ہوتے ہیں۔

''مجھے ایران جانا ہے، میں کراچی والوں کا سامنا نہیں کر سکتا۔ مجھے صرف آگے ہی جانا ہے۔ ایک بار واپس

چلا گیا تو پھر دوبارہ کبھی آگے نہیں جا سکوں گا۔'' میں نے اس کے آگے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا تو اس نے بے اختیار میرے ہاتھ پکڑ لیے۔

''انکل! میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ آپ صرف مند تک لے جاؤ آگے میں خود چلا جاؤں گا۔'' بلوچی میری بات سن کر مسکرانے لگا۔ اس نے بس کو اشارہ کیا تو بس ڈرائیور نے بس سٹارٹ کی اور بس کراچی جانے والے راستے پر دوڑنے لگی۔

''ادھر آ جاؤ ڈنکر صاحب! اکیلے ہی بارڈر کرو گے۔۔۔ پتہ بھی ہے نا بارڈر کس کو کہتے ہیں؟ کوئی سکول کی دیوار نہیں ہے جسے تم پھلانگ لو گے۔ اسی بارڈر کو کراس کرتے ہوئے تمہارا بھائی مارا گیا ہے۔'' بلوچی نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے لے کر ڈالے میں بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ آگے بٹھا لیا۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' اس نے سگریٹ کے پیکٹ سے سگریٹ نکالا اور اس کا تمبا کو نکالنے لگا۔

''راضی نام ہے میرا چاچا، بہاولپور سے آیا ہوں۔'' میں نے اس کو بتایا تو اس نے سر ہلا دیا۔

''کدھر جا رہے ہو؟ مسقط یا یونان کی ڈنکی ہے؟ میرے خیال میں مسقط ہی جا رہے ہو گے؟ ایران جانے کے پیسے نہیں ہیں تمہارے پاس تو یونان کیسے جاؤ گے؟'' اس نے نکالے ہوئے تمبا کو کو ایک کاغذ پر ڈال لیا اور کاغذ اس نے میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے کاغذ کو احتیاط سے پکڑ لیا۔

''میں صرف ایران تک ہی جا رہا ہوں، وہیں کام کروں گا۔'' میں نے زیادہ تفصیل بتانے سے گریز کیا۔

''بہت عجیب سے لڑکے ہو؟ بھائی بارڈر پر مارا گیا اور تم صرف ایران تک جا رہے ہو؟ ایران میں تو کچھ بھی نہیں رکھا ہوا ہے۔ ادھر تین سو روپیہ مزدوری ملتی ہے اور ادھر پانچ سو روپیہ بن جاتا ہے۔ ایران میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے۔ ادھر کام بھی بہت مشکل سے ملتا ہے۔ اگر صرف ایران تک جا رہے ہو تو میرا مشورہ ہے کہ مت جاؤ، ایران میں کچھ بھی نہیں رکھا ہوا ہے۔'' اب اس نے چرس کی ایک چھوٹی سی ڈلی نکال لی تھی جس کو اس نے ماچس کی تیلی کے ساتھ چپکایا اور دوسری تیلی جلا کر اسے گرم کرنے لگا۔

چرس کی ڈلی جب تھوڑی گرم ہو گئی تو وہ اس کو ہتھیلی پر رکھ کر مسلنے لگا۔ جب وہ اچھی طرح تیار ہو گئی تو اس نے میرے ہاتھ سے تمبا کو لیا اور اس میں چرس کو مکس کر کے دوبارہ خالی سگریٹ میں بھرنے لگا۔ ڈالا انتہائی تیز رفتاری

سے سڑک پر دوڑ رہا تھا لیکن وہ بلوچی اس کام میں ماہر تھا۔ وہ روڈ پر آنے والے ہر جھٹکے سے سگریٹ کو گرنے سے بچا رہا تھا۔

''کیا سوچا ہے بھائی؟ ایران ہی جانا ہے؟'' اس نے سگریٹ کا ایک کش لگاتے ہوئے کہا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور گاڑی سے باہر دیکھنے لگا۔ میری نظریں دور آسمان پر اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھ رہی تھیں۔ آزاد پرندے جن کے لئے کوئی بارڈر نہیں تھا۔ کوئی محبت نہیں تھی اور نہ ہی اس محبت کے لئے کوئی درد تھا۔ وہ اپنی مرضی سے اڑ رہے تھے۔

''راضی صاحب! آزاد پرندوں کو مت دیکھو۔ خدا ہر کسی کے نصیب میں آزادی نہیں لکھتا ہے۔'' چرس کا کش لگانے والا بلوچی بہت گہری بات کر گیا تھا۔

واقعی خدا ہر کسی کو آزاد پیدا نہیں کرتا۔ کچھ لوگوں کے نصیب میں ہمیشہ کی غلامی لکھ دی جاتی ہے جیسے کہ ایمان کے نصیب میں بکنا لکھا تھا اور وہ تیس ہزار میں بک گئی۔ وہ بھی غلام تھی اور میں بھی غلام تھا۔ میں بے مول غلام تھا جس نے اپنے ہاتھوں سے پر کاٹ کر اپنے محبوب کے ہاتھ میں دے دیئے تھے۔

اب کی بار ہم تربت شہر میں نہیں گئے بلکہ وہ بلوچی ڈائریکٹ ہی ہمیں مند لے آیا۔ وہ راستے میں آنے والی ہر ایک چوکی یا ناکے پر اسی ترتیب سے پانچ سو روپے کا نوٹ دیتا چلا آیا تھا۔ مند میں بھیڑوں والے احاطے کی بجائے اب ہم لوگوں کو ایک اور گھر میں لے کر آئے تھے۔ یہ ایک چھوٹا سا مکان تھا اور خالی تھا۔ ان لوگوں نے ہم سب لڑکوں کو ایک کمرے میں بٹھا دیا اور مکان کو باہر سے تالا لگا کر چلے گئے۔ آدھے گھنٹے تک تقریباً لڑکے ایسے ہی بیٹھے رہے۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے باہر نکلنے لگے۔

یہ تین کمروں پر مشتمل گھر تھا جس کی بڑی بڑی اور اونچی دیواریں تھیں۔ ہم کو کوئی باہر سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ باقی دونوں کمروں کو تالے لگے ہوئے تھے۔ سامنے ہی ایک پرانا سا ٹائلٹ تھا۔ پانی کے لئے پلاسٹک کا ڈرم رکھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی دو لوٹے بھی پڑے ہوئے تھے۔ رات کو تقریباً آٹھ بجے تک ہم لڑکے ادھر ہی رہے۔ اس کے بعد وہی ڈالے والے دوبارہ آ گئے۔ ان کے ساتھ دن والا بلوچی بھی تھا۔

''چلو چلو ماڑا! جلدی کرو آج رات خیریت سے بارڈر کراس کریں گے اور کل صبح آپ انشاءاللہ ایران میں

ہوں گے۔ چلو چلو لڑکو! جلدی کرو۔'' وہ ہمیں جلدی سے گاڑی میں ڈالنے لگے۔ میں ڈالے میں بیٹھنے لگا تو اس بلوچی نے میرا ہاتھ پکڑ کر روک دیا۔ میں خاموشی سے ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔

''راضی صاحب! آپ نے تو اکیلے ہی بارڈر کراس کرنا تھا۔'' اس نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ میں خاموش رہا۔ جب سب لڑکے ڈالے میں بیٹھ گئے تو اس نے میرا بازو پکڑا اور اپنے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بٹھا لیا۔

''راضی صاحب! مجھے پتہ نہیں کیوں لگتا ہے کہ آپ بہت پہنچی ہوئی چیز ہو۔ آپ کی عزت کرنے کو دل کرتا ہے۔ کتنی عمر ہے تمہاری؟ وہ آپ سے پھر تم پر آ گیا۔

''جی بیس سال۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''میرا بڑا بیٹا بائیس سال کا ہے۔ وہ تم سے دو سال بڑا ہے لیکن پھر بھی زمانے کا ایک ایک درد مجھے تمہارے چہرے پر نظر آتا ہے۔ کوئی بہت بڑی توپ قسم کی چیز ہو۔ آج سارا دن میں تمہارے بارے میں ہی سوچتا رہا ہوں۔ صرف ایک مہربانی کر دو! کچھ تو اپنے بارے میں بتا دو۔ وہ لڑکا تو کرسچن تھا، کیا تم بھی عیسائی ہو؟'' میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''وہ آپ کا بھائی نہیں تھا؟ دوست تھا۔ تو کیا آپ مسلمان ہو؟'' اس نے پیکٹ سے سگریٹ نکال لیا تھا۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''راضی صاحب! کچھ تو بتاؤ اپنے بارے میں۔۔۔ اتنا درد کیسے اتنی چھوٹی سے عمر میں تمہاری آنکھوں میں آ گیا ہے؟'' اس نے سگریٹ سلگا لیا۔

''چاچا! کبھی محبت کی ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں! مجھے اپنے بچوں سے بہت محبت ہے۔ میں نے اپنی بیوی سے محبت کی ہے۔'' اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا اور دھوئیں کو گاڑی سے باہر پھینکنے لگا۔

''چاچا کبھی عشق بھی کیا ہے؟'' میں نے نارمل انداز میں کہا تو اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

''نہیں! عشق کرنا ہمیں نہیں آتا، یہ تو بہت اوپر کی چیز ہوتی ہے۔'' وہ سر کو دائیں بائیں ہلا رہا تھا۔ میں

مسکرانے لگا۔

''میں نے عشق کیا ہے۔ یہ جو اوپر بیٹھا ہوا ہمارا خدا ہے نا اسے عشق کرنے والے لوگ پسند نہیں ہیں۔ اس لیے دوسرے خدا کو تلاش کررہا ہوں۔ وہ بہت دور ہے، بہت زیادہ دور۔۔۔آپ کی اور میری سوچ سے بھی آگے بیٹھا ہوا ہے۔ بس اسی کو ڈھونڈنے جارہا ہوں۔ چاچا! کہتے ہیں ناڈھونڈے والے کو خدا بھی مل جاتا ہے تو بس اسی کو ڈھونڈنا ہے۔ اس سے ایک شخص کا ہاتھ مانگنا ہے۔ اسی دنیا میں اسی زندگی میں۔۔۔میں ہندو نہیں ہوں جو دوسرے جنم کا انتظار کروں۔'' میری ساری باتیں اس بے چارے بلوچی کے سر کے اوپر سے گزر گئی تھیں اور اس نے صرف سر ہلانے میں ہی عافیت جانی۔ اب کی بار وہ لوگ ہمیں ایک دوسرے پوائنٹ پر لے کر آئے۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا اور ہم سب لڑکوں کو گاڑی سے اتار کر پہاڑی کی ایک طرف بٹھا دیا گیا۔

''راضی صاحب! مجھے تمہاری باتوں کی سمجھ تو نہیں آئی لیکن پھر بھی اتنا تو پتہ چل گیا ہے کہ تم زمانے کے کچھ زیادہ ہی ستائے ہوئے ہو۔ میرا اختیار صرف سولدان تک ہی ہے، اس سے آگے دوسرا ایجنٹ لے کر جائے گا۔ بلکہ اس سے آگے تین مختلف ایجنٹ ہوتے ہیں۔ مسقط کیلئے چابہار، دوبئی کے لئے بندر عباس اور ترکی یونان کے لئے ماکو لے جانے والے۔۔۔تم نے تو ترکی طرف جانا ہے۔ تہران سے پہلے پہلے کہیں سے بھی پکڑے گئے تو وہ ڈی پورٹ کر دیں گے۔''

''تم اکیلے تہران تک نہیں جا سکتے۔ ایران والے پکڑتے ہیں اور پھر زاہدان کی طرف سے لڑکوں کو پاکستانی آرمی کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہاں سے روزانہ دس بارہ لڑکوں کو ڈی پورٹ کیا جاتا ہے۔ یہ تہران سے پیچھے پیچھے کہیں سے بھی لڑکا پکڑا جائے تو اسے زاہدان بھیج دیتے ہیں اور پھر وہیں سے ڈی پورٹ ہو جاتا ہے۔ تم ایک بار ڈی پورٹ ہو گئے تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ ادھر سے افغانسان کا بھی بارڈر لگتا ہے۔ وہاں سے پھر بارڈر کراس کرنا تقریباً ناممکن ہے۔'' (یہ اس بلوچی کا ماننا تھا حالانکہ اس وقت بھی جتنا بارڈر تربت سے کراس ہوتا تھا اتنا ہی زاہدان سے ہوتا تھا۔)

''ان ایجنٹوں کو آپ پیسے دو تو یہ لوگ آپ کی چاند کی طرف بھی ڈنکی لگوا دیں گے اور یقین کریں یہ لوگ آپ کو چاند پر بھی پہنچا دیں گے۔ یہ دو سو ڈالر ہیں میرے پاس۔۔۔رکھ لو آگے کام آئیں گے۔ پتہ نہیں کیوں تم مجھے بہت اچھے لگے ہو۔ میں نے اپنی زندگی میں ہزاروں لڑکوں کو بارڈر کراس کروایا ہے لیکن کبھی بھی کسی لڑکے سے اتنا متاثر

نہیں ہوا ہوں۔تمہارے لیے کچھ کرنے کو دل کرتا ہے لیکن میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔سولدان سے آگے جو ایجنٹ اٹھانے کے لئے آئے گا اسے یہ دوسو ڈالر دے دینا میری اس سے بات ہوگئی ہے۔وہ تم کو ان دوسو ڈالر میں تہران تک لے جائے گا۔اس سے آگے میرا کوئی رابطہ نہیں ہے۔تہران سے آگے تمہیں خود ہی راستہ تلاش کرنا ہوگا۔ میں زیادہ پیسے بھی تم کو دے سکتا ہوں۔''

''میری جیب میں اس وقت پچاس ہزار سے زیادہ روپیہ ہے اور حقیقت میں میں چاہ کر بھی تم کو پچاس ہزار نہیں دے سکتا کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ پشین سے رَسک کے درمیان آپ کو جان بوجھ کر ایک چار گھنٹوں کی ڈنکی لگوائی جائے گی اور راستے میں پانچ چھ ڈاکو ڈنکی کو روک کر لوٹ لیں گے۔وہ رائفلوں سے لیس ہوں گے اور ایک ایک لڑکے کے بیگ اور کپڑوں کی تلاشی لیں گے۔تم لوگ کہیں بھی پیسے چھپا لو وہ نکال لیں گے۔ان کا کام ہی یہی ہے۔یہ سارا کام آپ کے مین ایجنٹ کی مرضی سے ہوتا ہے اور اس میں چھوٹے سے لے کر بڑے ایجنٹ تک سب ملوث ہوتے ہیں۔آپ لوگ پاگل ہو جو گھروں سے تیس تیس ہزار روپیہ لے کر نکلتے ہو۔'' بلوچی نے میری کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔

میری مٹھی میں دوسو ڈالر دبے ہوئے تھے۔اس بار ڈنکر سارے ایران کی طرف سے آئے تھے۔آٹھ ڈنکر تھے اور سب کے سب ہی ایرانی تھے۔ہم سے پہلے بھی ادھر لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔انہوں نے آتے ہیں فارسی میں لڑکوں کو کھڑے ہونے کا کہا۔میرے والے بلوچی نے ایک ڈنکر سے کچھ کہا اور پھر اسے لے کر میرے پاس آ گیا۔

''السلام وعلیکم!'' اس ڈنکر نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور مجھ سے فارسی میں کچھ پوچھنے لگا لیکن مجھے فارسی نہیں آتی تھی اور اردو اور انگلش اس کو نہیں آتی تھی۔اس لیے مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی اور میں بے چارگی سے بلوچی کی طرف دیکھنے لگا۔

''یار!تمہارا حال چال پوچھ رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ فکر مت کرو،یہ تمہیں خیریت سے سولدان لے جائے گا اور وہاں سے تہران والے ایجنٹ کے حوالے کر دے گا۔'' بلوچی نے ہنستے ہوئے کہا تو میں بھی مسکرا دیا۔

''زدزد!'' اس نے لڑکوں کی طرف دیکھ کر چیختے ہوئے کہا اور باقی ڈنکر لڑکوں کو دو قطاروں میں کرنے لگے۔

''ٹھیک ہے راضی صاحب! دعا کرنا خدا ہمارے بھی گناہ معاف کر دے۔زندگی اسی بارڈر کی تاروں سے

الجھتے ہوئے گزر گئی۔کبھی ان تاروں سے باہر کی دنیا کا سوچا ہی نہیں۔اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا، گلے سے لگایا اور ڈالے میں بیٹھ کر واپس چلا گیا۔ چرس سے بھرے ہوئے سگریٹ پینے والا بلوچی اندر سے ایک معصوم بچے کی مانند تھا۔جاتے جاتے مجھے کئی دنوں تک کے لئے اداس کر گیا۔

میں خاموشی سے قطار میں چلنے لگا۔ایرانی ڈنکر بہت تیز تھے اور زبان کے بھی بہت برے تھے۔وہ ہر بات پر گالی دے رہے تھے۔اس بار پہاڑی ڈنکی تھی اور لمبی بھی تھی۔لڑکے دو گھنٹے میں ہی تھک گئے لیکن ڈنکر پھر بھی گالیاں دیتے اور ٹھڈے مارتے ہوئے لڑکوں کو آگے کی طرف دھکیل رہے تھے۔جو لڑکا بھی تھوڑا کمزور پڑتا تھا اس کی یہ لوگ شامت لے آتے تھے۔ہر طرف ''کوئی کوئی'' اور ''کش کش'' کی آوازیں ہی آ رہی تھیں۔مجھے وہ ایرانی پہلے پہلے بہت برے لگے لیکن بعد میں مجھے ان کی باتیں اچھی لگنے لگی تھیں۔وہ اگر زیادہ سختی نہ کرتے تو لڑکے کبھی بھی یہ ڈنکی مکمل نہ کر سکتے تھے۔

یہ ان ڈنکروں کی ہی مہربانی تھی جو ان لوگوں نے صرف چار گھنٹوں میں ہی ہمیں بارڈر پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ بارڈر کے اوپر خاردار تار لگی ہوئی تھی۔ پہلے صرف سنگل تار ہی ہوتی تھی لیکن اب یہاں پر گول تار تھی۔ یہ گچھے کی طرح زمین پر بچھی ہوئی تھی۔زمین سے تقریباً پانچ فٹ اونچی یہ تار بہت خطرناک تھی۔اس کو بہت سختی سے کس کر باندھا جاتا تھا تو پھر اس کو عبور کرنا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔اس میں انتہائی سخت اور تیز پتری لگی ہوتی ہے جو ایک بار کپڑے میں اڑ جائے تو پھر کبھی بھی اس سے باہر نہیں نکلتی۔ پورا کپڑا پھٹ جاتا ہے بلکہ بعض اوقات تو کپڑے کو چھڑوانے کے چکر میں یہ ٹانگوں اور بازوؤں کو بھی پھاڑ دیتی ہے۔

ان ڈنکروں کے پاس ایک بڑا سا تار کاٹنے والا اوزار تھا۔ایک ڈنکر نے تار کو کاٹنا شروع کر دیا۔دس منٹ تک وہ تار کے ساتھ زور آزمائی کرتا رہا اور اتنا سوراخ کر دیا جس سے ہم لڑکے ایک ایک کر کے آسانی سے گزر سکیں۔دو ڈنکر تار کے دونوں طرف پاؤں رکھ کر کھڑے ہو گئے اور ایک ایک لڑکے کو بارڈر کراس کروانا شروع کر دیا۔

''زدزد!'' وہ نہایت آہستگی سے کہہ رہے تھے۔

دو ڈنکر تار کراس کر کے آگے چلے گئے تھے اور پیچھے رہ جانے والے دو ڈنکر لڑکوں کو پکڑ پکڑ کر بارڈر کراس کروا رہے تھے۔وہ لڑکے کو تار کے اوپر پیر رکھواتے اور زور سے آگے دھکا دے دیتے۔لڑکے تیزی سے بارڈر کراس کر

رہے تھے۔ چالیس منٹ کے اندر اندر ان لوگوں نے سب لڑکوں کو بارڈر کراس کروا دیا تھا۔

یہاں پر ہم لوگ کھڑے ہونے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ اس لیے بیس پچیس لڑکے جب بارڈر کراس کر گئے تو ایک ڈنکران کو لے کر آگے بڑھ جاتا۔ اگر اچانک گشتی گاڑی ادھر آنکلتی تو کم از کم آگے جانے والے لڑکے تو بچ جاتے۔ وہ سب لڑکوں کا اکٹھا رسک نہیں لے رہے تھے۔

میں تین دن پہلے بھی ڈنکی لگا چکا تھا اور یہ ڈنکی میری فری میں لگ رہی تھی۔ اس کے علاوہ میرے پاس دو سو ڈالر موجود تھے۔ اس لیے اب کی بار میں پیچھے رہ کر رسک نہیں لے سکتا تھا۔ اگر اب کی بار بھی میں پکڑا جاتا تو میری ڈنکی بھی جاتی اور دو سو ڈالر بھی پولیس والے مجھ سے چھین لیتے۔ اس لیے میں آگے آگے تھا اور دل میں پکا ارادہ بنا لیا تھا کہ اگر اب کی بار اگر ایران والے مار بھی دیتے تب بھی آگے کی طرف ہی بھاگنا ہے، پیچھے کی طرف نہیں بھاگنا۔ جو بھی ہو ہر حال میں آگے ہی جانا ہے۔ اس لیے میں پہلے گروپ میں تھا۔

ایک ڈنکر نے ہم کو ساتھ لیا اور اندھیرے میں آگے بڑھنے لگا۔ ہمارا گروپ سب سے تیز گروپ تھا اس لیے لڑکے بہت تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ڈنکر نے ہم کو مزید ایک گھنٹے تک چلایا اور اس کے بعد ایک نالے کے کنارے پر بٹھا دیا۔ ہم وہاں پر بیٹھتے ہی تھکاوٹ سے گر گئے۔ سب لڑکوں نے بیگ سر کے پیچھے رکھے اور لیٹ گئے۔ میرے پاس بیگ نہیں تھا۔ میں خالی ہاتھ سفر کر رہا تھا اس لیے میں نے بازو سر کے نیچے رکھا اور ایسے ہی لیٹ گیا۔ آسمان پر چاند تو نہیں تھا لیکن ستارے پورے آسمان پر پھیلے ہوئے تھے۔ میں ان ستاروں کو دیکھنے لگا۔

آسمان چاند کے بغیر بہت ادھورا ادھورا لگ رہا تھا۔ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک چاند کو تلاش کرنے لگا لیکن مجھ کہیں بھی چاند نہ ملا۔ آخر میں مایوس ہو گیا اور اسی مایوسی میں اپنی آنکھیں بند کیں تو چپکے سے چاند میرے تخیل میں اتر آیا۔ ایمان کا خوبصورت سا چہرہ میری آنکھوں میں اترنے لگا۔ وہ بہت پیار سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ مجھے نیند آنے لگی اور میں آہستہ آہستہ نیند کی گہری وادیوں میں چلا گیا۔

اجنبی ملک اجنبی سرزمین سرحدی علاقہ پولیس اور ایرانی آرمی کا ڈر سب کچھ چھوڑ کر میں سکون سے سونے لگا۔ آج بڑے دنوں کے بعد نیند آ رہی تھی۔ شاید خدا کو میری حالت پر ترس آ رہا تھا یا شاید میرے محبوب میری ایمان کو مجھ پر ترس آ گیا تھا۔ آج میں نے اس کا ملک چھوڑ دیا تھا۔ اس کے خواب کو پورا کرنے کے لئے میں آج دیسی سے پردیسی ہو گیا تھا اور اسی خوشی میں آج اس خدا نے اپنا دیدار کروا دیا تھا۔

محبت ہمیشہ درد ہی نہیں دیتی ہے بلکہ کبھی کبھی اس درد میں مزے کے وہ لمحات بھی آتے ہیں جن کے لئے آدمی جنت اور دوزخ دونوں کو قربان کر سکتا ہے۔ یہی تو وہ لمحات ہوتے ہیں، یہی تو وہ عشق ہوتا ہے جس کے لئے بڑے بڑے بادشاہ اپنی بادشاہی کو ٹھوکر مار کر درویشی اختیار کر لیتے ہیں۔ آج میں بھی اپنی زندگی کو ٹھوکر مار رہا تھا۔

سارے لڑکوں کے گروپ ایک ایک کر کے وہیں اکٹھے ہوتے رہے اور جب سارے اکٹھے ہو گئے تو ہم ایک بار پھر اکٹھے ہو کر آگے کی طرف سفر کرنے لگے۔ اس کے بعد مزید تین گھنٹوں کا سفر تھا۔ لڑکے تھک کر چُور ہو گئے تھے اور ان سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ ان کے پاس موجود پانی ختم ہو گیا تھا۔ بیگوں میں موجود بھاری سامان ایک ایک کر کے گرنا شروع ہو گیا تھا اور یہاں پر میں نے سامان اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ مجھے آگے کے سفر کے لئے کچھ مزید کپڑے اور سامان چاہیے تھا اور میں ان کپڑوں کو اٹھاتا، چیک کرتا اور اگر وہ مجھے پورا ہوتا یا اچھا ہوتا تو اسے رکھ لیتا۔

میرے پاس بیگ نہیں تھا اس لیے میں نے ایک شرٹ کو نیچے سے گانٹھ دے کر بند کر لیا اور اس کے گلے کی طرف سے سامان اندر رکھ کر بند کیا اور بازو کو اپنے جسم کے گرد کس کر باندھ لیا۔ اب میرے پاس بھی ایک دیسی بیگ بن گیا تھا۔

''زدزد، جلدی جلدی!''

ڈنکروں نے ہاتھ میں پلاسٹک کی تاریں پکڑی ہوئی تھیں۔ اگر کوئی بھی لڑکا پیچھے رہتا تو وہ اسے مارنا شروع کر دیتے۔ اگر کوئی لڑکا بالکل ہی گر جاتا تو اسے ٹھڈے مارنا شروع کر دیتے۔ اس کو زبردستی کھڑا کرتے اس کی ٹانگوں پر تیل لگا کر ایک منٹ تک مالش کرتے اور ایک زوردار تار مار کر اسے دوبارا قطار میں لگا دیتے۔

صبح کے تقریباً پانچ بجے ہمیں راستے پر دو تین ڈالے نظر آئے۔ وہ ڈالے ہمارے لیے ہی کھڑے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے لڑکوں کو ڈالے کے اندر کھڑا کیا۔ یہ ٹرالی ٹائپ ڈالے ہوتے تھے۔ آگے ڈرائیور اور دوسری سیٹ ہوتی تھی اور پیچھے ٹرالی ٹائپ ہوتی تھی۔ چونکہ ہم لڑکے بہت زیادہ تھے اور تین ڈالوں کے اندر پورے نہیں آ سکتے تھے اس لیے انہوں نے ہمیں ڈالے کے اندر کھڑے رکھا کیونکہ بیٹھنے کی صورت میں جگہ کم ہو جاتی۔ مجھے ڈر تھا کہ ہم نیچے گر جائیں گے۔ صرف ایک فٹ کا کنارا تھا اور گاڑی چلتی تو گر جاتے۔ ڈرائیور نے ہمیں ایک دوسرے کو مضبوطی سے پکڑنے کو کہا تو ہم لڑکوں نے ایسا ہی کیا۔ واقعی یہ تکنیک کامیاب بھی ہوئی۔ گاڑی جہاز کی سی رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ لڑکے تھوڑا دائیں بائیں ہوتے لیکن نیچے نہیں گر سکتے تھے۔

صرف بیس منٹ میں ہی ہم سب سولدان پہنچ گئے تھے۔ ایران کے پہلے سرحدی گاؤں سولدان۔۔۔زیادہ بڑا تو نہیں تھا لیکن پاکستان کے دیہی علاقوں کی طرح تنگ تنگ گلیاں نہیں تھیں بلکہ بڑی بڑی گلیاں تھیں۔ دکانوں کے پوسٹر فارسی میں لکھے ہوئے تھے۔ ڈالا ہم سب لڑکوں کو لے کر ایک گھر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا ڈنکر جلدی سے باہر نکلا اور ہم لڑکوں کو تیزی سے نیچے اترنے کا کہنے لگا۔

''جلدی جلدی!'' اسے شاید تھوڑی بہت اردو آتی تھی۔ ایک منٹ میں ہی ہم سب لڑکے ڈالے سے نیچے اتر گئے تو وہ ہم کو ایک گھر کے اندر لے گیا۔

یہاں پر پانچ کمرے تھے اور تقریباً ہر کمرے میں ہی لڑکے پہلے سے موجود تھے۔ تقریباً دوسو کے قریب لڑکے پہلے سے ہی وہاں موجود تھے۔ ایک سو پچاس ہم آ گئے تھے اور سب ہی ان کمروں میں جدھر جگہ ملی گھس گئے۔ پوری رات کا سفر کیا تھا اس لیے سارے لڑکے ہی تھک گئے تھے اور سونا چاہتے تھے۔ لیکن اتنے سارے لڑکوں کی وجہ سے لیٹنا ناممکن تھا اس لیے بیٹھے بیٹھے ہی لڑکے سونے لگے۔ باقی دونوں ڈالے بھی لڑکوں کو لے کر آ گئے تھے۔ ڈنکر ہم لڑکوں کو ہاؤس انچارج کے حوالے کر کے چلے گئے۔

''ماڑا! تھکے ہوئے ہو اس لیے جدھر جگہ ملتی ہے بیٹھ جاؤ اور سونے کی کوشش کرو۔ کھانا دوپہر کو بارہ بجے ملے گا اور اسی وقت تم لوگوں کی حاضری بھی لگ جائے گی۔''

میں نے پانچوں کمرے میں جا کر کونا تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن کمروں کی دیواریں پہلے سے ہی لڑکوں نے سنبھال رکھی تھیں۔ بیٹھنے پر اگر پیچھے کی طرف ٹیک لگانے کے لئے کچھ مل جاتا تو آسانی سے آدمی سو سکتا تھا۔ کچھ لڑکے کمرے کے درمیان میں ہی بیگ رکھ کر اس کے ساتھ ٹیک لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے باہر باتھ روم کے دروازے کے پاس تھوڑی جگہ مل گئی تو میں وہیں پر آ کر بیٹھ گیا۔ یہاں پر باتھ روم کی بہت بدبو آ رہی تھی لیکن چونکہ میں نے ایک مہینہ کراچی میں یہی کام کیا تھا اس لیے مجھے اس بدبو سے نفرت نہیں محسوس ہو رہی تھی۔

میں اسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن باہر سردی کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ ادھر لیٹنے کے لئے جگہ تو تھی لیکن اتنی سردی میں سویا نہیں جا سکتا تھا۔ لڑکے کمروں سے تنگ آ کر باہر لیٹنے کیلئے آتے تھے لیکن بیس پچیس منٹ جب باہر سردی سے ٹھٹھرنے لگتے تو واپس کمروں میں جا کر بیٹھ جاتے۔ وہاں پر لیٹنے کی جگہ تو نہیں تھی لیکن اندر بہت زیادہ لڑکوں کی وجہ سے گرمی ہو گئی تھی اور وہاں پر آسانی سے بیٹھا جا سکتا تھا۔

دوسرے دن بارہ بجے کے قریب گھر کے بیرونی دروازہ کھلا اور دو ایرانی اندر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑے بڑے دیگچے تھے۔ انہوں نے دیگچے ہمارے ہاؤس انچارج کو پکڑائے اور واپس جا کر دوسرے دیگچے لے آئے۔ ان کے پاس ٹوٹل دس دیگچے تھے جن میں چاول پکے ہوئے تھے۔ باتھ روم کی چھت کے اوپر دس بارہ سٹیل کی پراتیں الٹی پڑی ہوئی تھیں۔ اس لیے بارش کا پانی یا صبح کی اوس کا پانی ان میں نہیں جا تا تھا۔

سردی اور سمندر سے نزدیک ہونے کی وجہ سے ہوا میں نمی تھی۔ ہمارے ہاؤس انچارج کے پاس ایک بڑا کپڑا تھا۔ ایک لڑکے نے آگے بڑھ کر اس سے کپڑا لیا اور پراتیں صاف کر کر کے اسے پکڑانے لگا۔ ہاؤس انچارج ان میں چاول ڈالتا اور لڑکوں کی طرف بڑھا دیتا۔ تقریباً بیس بیس لڑکوں کا گروپ بن گیا تھا۔ وہ پرات کو درمیان میں رکھتے اور مل کر کھانے لگتے۔ نمکین چاول بنے ہوئے تھے۔ باسمتی چاول ایران میں زیادہ نہیں کھایا جاتا بلکہ سوری کھایا جاتا ہے۔ یہ مہنگا چاول ہوتا ہے اور ہاؤس انچارج کبھی بھی مہنگی چیز نہیں خریدتے ہیں۔

چاولوں میں ٹماٹر بہت زیادہ ڈالے گئے تھے بلکہ وہ ٹماٹر چاول بنائے گئے تھے۔ میں نے کل رات کو تھانے میں ہی کھانا کھایا تھا اس لیے بہت زیادہ بھوک لگی ہوئی تھی۔ دو دن گزر گئے تھے کھانے کے بغیر اس لیے باقی لڑکوں کو بھی بھوک تھی اور ہم سب کو یہی چاول کسی بریانی کی طرح لگ رہے تھے۔ کھانا ختم کر کے ہاؤس انچارج نئے آنے والے لڑکوں کا اندراج کرنے لگ گیا۔

یہاں پر ہم کو پرانے لڑکے بھی مل گئے۔ یہ وہی دس بارہ لڑکے تھے جو اس دن فائرنگ سے بھاگ گئے تھے۔ ہم لوگ تو آرمی کے ہتھے چڑھ گئے تھے لیکن ان لڑکوں کو واپس ڈنکر لے گئے تھے اور دوسرے دن ان لوگوں کو بارڈر کراس کروا دیا تھا۔

اس دن دو گروپ بنے تھے اور ہم سے پہلے والا گروپ صحیح سلامت کراس کر گیا تھا اور وہ کل رات آگے بھی نکل گئے تھے۔ جس پوائنٹ سے کل رات ہم لوگوں نے بارڈر کراس کیا تھا وہ بہت سیف تھا اور ایرانی ڈنکر بھی بہت تیز تھے۔ کل رات تو صرف ایک سو پچاس کے قریب لڑکے بارڈر کراس کر کے نکلے تھے۔ ابھی ان ایجنٹوں کی بڑی گیم نکالنے کا ارادہ تھا اور اس کے لئے ان کو زیادہ تیزی سے آگے سفر کروانا تھا۔ اس لیے ہاؤس انچارج سب لڑکوں کو ان کے ایجنٹوں کے حساب سے جمع کر رہا تھا۔

''بشیر آسی کا لڑکا کون ہے؟'' ہاؤس انچارج نے میرا نام پکارا تو میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''جی میں ہوں۔'' میں اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

''تم صرف تہران تک ہی جاؤ گے نا؟'' اس نے سرسری انداز میں پوچھا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میری طافو سے بات ہو گئی تھی۔گھبرانا مت! میرا جگری دوست ہے۔اس نے تمہاری ذمہ داری مجھے سونپی ہے تو میں تم کو خیریت سے آگے تہران تک پہنچا دوں گا۔اس نے دو سو ڈالر دیئے تھے آگے جانے کے لئے؟'' اس نے دو سو ڈالر کا پوچھا تو میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دو سو ڈالر نکال کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دیئے۔

''ٹھیک ہے۔رات کو جب گاڑیاں لینے کے لئے آئیں تو میں ان کو پیسے دو دوں گا۔اس کے بعد تمہارا ایجنٹ طافو ہو گا۔ہر جگہ پر اب تم طافو کے نام سے ہی پکارے جاؤ گے۔ٹھیک ہے نا؟ کوئی پرابلم نہیں ہو گی اور کوئی چیز وغیرہ چاہیے ہو تو بول دو۔کپڑے وغیرہ ہیں تمہارے پاس؟'' اس نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اس کی نظر میرے دیسی بیگ پر پڑ گئی۔

''تمہارے پاس بیگ نہیں ہے؟'' میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''ایک منٹ ٹھہرو میں دیکھتا ہوں۔'' وہ جلدی سے ایک کمرے کے اندر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک مضبوط سا بیگ تھا۔

''یہ لو یار! اس میں دو تین گرم شرٹیں بھی ہیں۔پہن کر ٹرائی کر لو،تمہیں تھوڑی بڑی تو ہوں گی لیکن یہ پردیس ہے یہاں سب کچھ چلتا ہے۔صرف سردی سے ہی بچنا ہے یہاں پر کس کو دکھانا ہے ڈھنگ والے کپڑے پہن کر؟'' اس نے بیگ میرے ہاتھ میں پکڑایا اور دوبارہ کمرے میں چلا گیا۔میں نے اپنے سارے کپڑے اس بیگ میں منتقل کئے اور وہیں بیگ کو سرہانے کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔

رات کو آٹھ بجے جب مکمل طور پورا اندھیرا چھا گیا تو ان ڈنکروں کی گاڑیاں آنا شروع ہو گئیں۔ہاؤس انچارج پچاس پچاس لڑکوں کا ایک گروپ بناتا اور دو دو گروپ باہر موجود ڈالوں میں بٹھا دیتا اور ڈالے ان لڑکوں کو لے کر غائب ہو جاتے۔میرا نمبر سب سے آخری تھا اور میری باری رات کو تقریباً گیارہ بجے کے قریب آئی۔

ہم سولڑ کے دو ڈالوں میں سوار ہو گئے اور ڈالے ہمیں لے کر گاؤں سے باہر نکل گئے۔سولدان سے پشن تقریباً بارہ کلومیٹر دور ہے اور یہ مین روڈ پر واقع ہے۔سولدان مین روڈ سے ہٹ کر بنا ہوا ہے۔ڈالے ہمیں لے کر پشن کی

طرف روانہ ہو گئے لیکن وہ چھوٹی چھوٹی کچی سڑکوں پر ہی رہے۔ مین روڈ پر جانے کے لئے انہوں نے پہلے پشن کو باہر سے ہی کراس کیا اور اس کے بعد مین روڈ پر آ گئے۔

پشن ایران کا پہلا سرحدی گاؤں ہے۔ ایران کے پشان صوبے کا یہ گاؤں اپنے بہت بڑے ڈیم کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ ڈیم پشان صوبے کا سب سے بڑا ڈیم ہے جو ایرانی گورنمنٹ نے پینے اور کھیتی باڑی کے مقصد کے لئے بنایا ہے۔ اس کے علاوہ پشن میں ہی پاکستان ایران ٹریڈ کو دیکھنے کیلئے کسٹم کی ایک بوہٹ بنی ہوئی ہے۔ ایران کے اس چھوٹے سے گاؤں میں بلوچی زبان ہی بولی جاتی ہے۔ ہماری گاڑیاں پشن کو باہر سے ہی کراس کر کے مین روڈ پر آ گئیں اور انتہائی تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑنے لگیں۔

یہاں سے اب ہماری منزل رَسک تھی۔ رسک سے مسقط جانے والے لڑکے ہم سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ پشن سے پینتیس کلومیٹر دور ہے۔ گاڑیاں صرف دس منٹ ہی روڈ پر رہیں اس کے بعد ایک بار پھر کچے راستوں پر دوڑنے لگیں اور آخر کار ایک ویران سے رستے پر رک گئیں۔

''زدزد!'' ڈرائیور گاڑی روکتے ہی تیزی سے نیچے آیا اور چیخنے لگا۔ اس نے تین چار لڑکوں کو تھپڑ مارے تو لڑکے جلدی سے نیچے اتر آئے۔ ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر ڈنکر بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسری گاڑی میں بھی ایک ڈنکر تھا۔ ان تینوں ڈنکروں نے ہم کو پیدل ہی آگے چلانا شروع کر دیا۔

گاڑیوں والے گاڑیاں بھگا کر آگے لے گئے اور ہم ایک کچی سی پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ آگے چل کر ایک نالہ آ گیا۔ ہم نے نالہ کراس کیا اور وہیں پر ہم کو ڈاکو مل گئے۔ وہ تعداد میں تقریباً دس کے قریب تھے اور ان سب کے پاس جدید ترین رائفلیں تھیں۔ یہ نشیبی علاقہ تھا۔ ان دس ڈاکوؤں نے ہم سب لڑکوں کو مکمل طور پر گھیر لیا۔ انہوں نے آتے ہی لڑکوں کو گنوں کے بٹ مارنے شروع کر دیئے۔ لڑکے چیختے تو وہ اور زور سے مارنا شروع کر دیتے۔ صرف تین چار لڑکوں کو مار کر ہی ان کی دہشت ہم سب 100 سے زیادہ لڑکوں پر غالب آ گئی تھی۔ ویسے بھی سارے لڑکے ایورج بیس پچیس سال کی عمر کے تھے اور پہلی پہلی بار گھروں سے نکلے تھے۔

ہم کوئی تجربہ کار تو نہیں تھے جن پر ان کو محنت کرنا پڑتی۔ انہوں نے ایک ایک لڑکے کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ یہ بہت کھلا علاقہ تھا۔ انہوں نے سب لڑکوں کو ایک سائیڈ پر کر دیا تھا اور جس جس کی تلاشی لے لیتے اسے ڈنکروں کے حوالے کر دیتے۔ ان کے ہاتھوں میں کٹر تھے اور وہ کالر، بوٹوں کے تلے اور بیگوں کی سیلیں بھی اکھاڑ کر

دیکھ رہے تھے اور تقریباً کامیاب ہو رہے تھے۔ زیادہ تر لڑکوں کی جیبوں میں ہی پیسے تھے یا پھر بوٹوں کے تلوں کے نیچے رکھے ہوئے تھے اور ڈاکو ان کو اکھاڑ اکھاڑ کر نکال رہے تھے۔

پاکستان میں رہنے والے اس بلوچی نے سچ کہا تھا کہ آپ کو پشن اور رسک کے درمیان جان بوجھ کر ایک تین گھنٹے کی ڈنکی لگوائی جائے گی اور اس ڈنکی میں ڈاکو آپ سے آپ کی ساری رقم چھین کر لے جائیں گے اور وہی ہوا تھا۔ ڈنکی لگی اور ڈاکو سب کچھ چھین کر لے گئے۔ میری جیب میں ڈالر بہت مہارت سے سلے ہوئے تھے۔ وہاں پر انہوں نے ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا لیکن ان کو کوئی شک نہیں ہوا اور نہ انہوں نے کٹر سے کالر پھاڑا۔ بوٹوں کے تلے ویسے ہی علیحدہ ہو جاتے تھے اور وہاں بھی کوئی چیز نہ نکلی نہ ہی نکلنی تھی۔ میرے پاس صرف چار سو پچاس پاکستانی روپے تھے اس کے علاوہ کبھی نہیں تھا۔ انہوں نے وہ پیسے رکھے اور ایک زوردار تھپڑ مار کے فارسی میں ایک موٹی سی گالی دی اور آگے کی طرف دھکا دے دیا۔ میں خاموشی سے آگے جا کر بیٹھ گیا۔

وہ دس ڈاکو تھے اور ان میں سے آٹھ ڈاکو تلاشی لے رہے تھے۔ اس لئے انہوں نے آدھے گھنٹے میں ہم کو فارغ کر دیا۔ ڈنکر ہمیں لے کر آگے چل پڑے اور ہم لٹے پٹے قافلے کے ساتھ ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ ہم میں سے اب کچھ خوش قسمت لڑکے ہی بچے تھے جن کے پیسے چھننے سے بچ گئے تھے۔ آگے تہران جا کر مزید پیسے منگوانے تھے جو کہ پھر ترکی کے بارڈر پر کر دچھین کر لے جاتے۔

یہ سرکل ایسے ہی چلتا تھا اور ہم بے وقوف اسے خدا کی مرضی یا اپنی بدقسمتی سمجھ کر فراموش کر دیتے ہیں۔ مزید ایک گھنٹے تک ڈنکر ہمیں پیدل چلاتے رہے اور اس کے بعد آگے پھر وہی ڈالے لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں گاڑیوں میں ڈالا اور رسک کی طرف لے جانے لگے۔

رسک میں ہمارے رہنے کے لئے احاطہ شہر سے باہر ایک بالکل سنسان سی جگہ پر تھا۔ یہ احاطہ بھی جانوروں کے رکھنے کے لئے استعمال ہوتا تھا لیکن یہاں جانور نہیں تھے۔ شاید جانوروں سے زیادہ ہم انسان پیسہ دیتے تھے اس لیے انہوں نے جانور چھوڑ کر ہمیں پالنا شروع کر دیا تھا۔ گاڑیاں ہمیں یہاں چھوڑ کر چلی گئیں۔ ہم سے پہلے پشن سے چلے ہوئے لڑکے یہاں پر پہنچ گئے تھے۔ صبح کے قریباً تین بج چکے تھے۔

ابھی ہمیں یہاں آئے ہوئے آدھا گھنٹہ ہی ہوا تھا جب ایک ایجنٹ آیا اور اس نے مسقط جانے والے لڑکے علیحدہ کر دیئے۔ ہم تین سو کے قریب لڑکے تھے اور ان میں سے آدھے لڑکے مسقط جانے والے تھے۔ چونکہ مسقط

جانے کے اس وقت صرف پینتیس چالیس ہزار لگتے تھے اس لیے ایک عام غریب آدمی بھی اتنے پیسوں کا بندوبست کرسکتا تھا۔ دبئی کا ریٹ پچاس ہزار کے قریب تھا لیکن ادھر زیادہ سختی تھی۔ زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ سال میں لڑکا پکڑا جاتا تھا اور وہ اسے واپس پاکستان ڈی پورٹ کر دیتے تھے جبکہ مسقط میں کوئی زیادہ سختی نہیں تھی۔ ڈی پورٹ تو وہ لوگ بھی کرتے تھے لیکن ادھر اتنی جلدی پکڑا نہیں جاتا تھا۔ اگر ایک لڑکا گھر سے سیدھا کام پر اور کام سے گھر آئے تو چار پانچ سال آسانی سے نکال جاتا تھا۔

یونان کا ریٹ سب سے زیادہ تھا۔ چھ چھ لاکھ روپے یونان جانے کا لیا جاتا تھا۔ یہ بہت لمبا سفر تھا اور یونانی گورنمنٹ پکا سٹے دیتی تھی۔ آپ ایک بار یونان میں داخل ہو گئے تو اس کے بعد اپنی مرضی سے ہی واپس آ سکتے ہیں۔ یونانی گورنمنٹ ڈی پورٹ نہیں کرتی تھی۔ اس کے علاوہ دوبئی اور مسقط والے لیگل ویزہ دیتے تھے لیکن یونان پاکستان کو کوئی ویزہ نہیں دیتا تھا۔ وہاں صرف ڈنکی لگا کر ہی جایا جاتا تھا۔

ایجنٹ نے مسقط جانے والے لڑکے علیحدہ کئے اور ایک بڑے ٹرالر میں ان لڑکوں کو بٹھا کر لے گئے۔ رسک سے لڑکے اللہ آباد جاتے تھے۔ رَسک سے اللہ آباد صرف پینتالیس کلومیٹر دور تھا۔ لڑکے ایک گھنٹے میں ہی اللہ آباد پہنچ جاتے اور پھر دن کو وہیں قیام کرتے اور اگلی رات وہ اللہ آباد سے ایران کی مشہور ترین بندرگاہ چابھار جاتے تھے۔ ایران اور مسقط کے درمیان ساری تجارت اسی بندرگاہ سے ہوتی تھی۔ انڈیا بھی اسی بندرگاہ پر پیسہ لگا رہا ہے کیونکہ یہ افغانستان کو نزدیک پڑتا ہے۔

پاکستان اور انڈیا کے کشیدہ حالات کی وجہ سے انڈیا کو افغانستان اور پھر دوسری شمالی ایشائی ملکوں تک راستہ نہیں ملتا تو اس کی کمی انڈیا چابھار کی بندرگاہ پر سرمایہ کاری کر کے پوری کر رہا ہے۔ انڈیا اپنا تجارتی سامان سمندر کے ذریعے چابھار کی بندرگاہ پر لاتا ہے اور پھر یہاں سے بذریعہ روڈ افغانستان چلا جاتا ہے۔

انڈیا نے ایران کے اندر ایک روڈ بھی بنائی ہے جو چابھار سے شروع ہوتی ہے اور پورے ایران کو کراس کر کے افغانستان کے شہر قندھار تک جاتی ہے۔ پاکستان اور انڈیا کی دشمنی کا ایران فائدہ اٹھا رہا ہے اور اس چیز کا اندازہ ہماری عوام کو بھی نہیں ہو رہا ہے۔ میں کوئی بہت بڑا دفاعی تجزیہ کار تو نہیں ہوں اور نہ ہی میرے پاس خارجہ پالیسی یا معیشت کی ڈگری ہے۔ ایران ہمارا برادر اسلامی ملک ہے۔ اگر آپ نقشہ نکالیں اور اس نقشے میں ایران کو دیکھیں تو یقیناً آپ کو گوادر کی بندرگاہ کی اہمیت معلوم ہو جائے گی۔

ہمارے میڈیا نے گوادر کی بندرگاہ کو ایسے بنا کر پیش کیا ہے جیسے پوری دنیا کی سب سے بہترین بندرگاہ یہی گوادر ہے۔ساری دنیا کی تجارت اسی بندرگاہ سے ہوتی ہے حالانکہ یہ چین کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔چین کا بھی یہ کچھ ہزار کلومیٹر فاصلہ کم کرتی ہے لیکن یہ کچھ ہزار کلومیٹر فاصلہ کم کرنے کے لئے چائنہ کو ہمالیہ کا پورا پہاڑی سلسلہ عبور کرنا پڑتا ہے اور یہاں پر بنی ہوئی سڑک جسے شاہراہ قراقرم کہتے ہیں سردیوں میں مکمل طور پر بند ہو جاتی ہے۔ یہ بہت دشوار گزار علاقہ ہے۔

انڈیا کی چین کیساتھ بھی دشمنی چل رہی ہے۔اگر کل کو انڈیا کی چین سے دوستی ہو جاتی ہے تو چین کے بارڈر پر انڈین سٹیٹ اترا کھنڈ سے نکلنے والی روڈ گجرات کے شہر سوات کی بندگارہ پر ختم ہو تو یہ فاصلہ پاکستان سے گزرنے والے ٹریڈ روڈ سے آدھا ہوگا اور اس کو دہلی اور ممبئی جیسے کروڑوں کی آبادی والے شہر بھی لگتے ہیں۔ ہماری بندرگاہ چائنہ کے ایک سرے کو لگتی ہے۔دوسرے سرے سے سامان لانے کے لئے چین کو مزید کئی سو کلومیٹر فاصلہ چین کے اندر کرنا پڑتا ہے۔جبکہ انڈیا کی اترا کھنڈ سٹیٹ چین کے درمیان سے لگتی ہے جس سے فاصلہ کافی کم ہو جاتا ہے۔ مشرقی اور مغربی چائنہ دونوں سرے اترا کھنڈ سے نزدیک ہیں۔چین کی انڈیا سے دشمنی کی وجہ ہماری گوادر کی بندرگاہ ہے۔ورنہ سوات اور ایران کی چابھار کے سامنے یہ زیرو ہے۔

کچھ لوگ شاید مجھے گالیاں دے رہے ہوں لیکن میں کوئی تجزیہ کار نہیں ہوں اور مجھے گالیاں کھانے کا اتنا شوق بھی نہیں ہے۔ میں ایک غریب سا پاکستانی ہوں جو جرمنی میں محنت مزدوری کر کے روزی کما رہا ہوں۔ میرے ہاتھ میں کوئی چیز نہیں ہے اور نہ ہی کوئی اعلیٰ تعلیمی ڈگری ہے۔بس ایک سادہ سا اوورسیز پاکستانی ہوں جس کو جو کام بھی مل جاتا ہے کر لیتا ہے۔لیکن میں یہاں پر حقیقت ہی لکھوں گا۔ ایران پر معاشی پابندیوں کی وجہ سے ہی پاکستان افغانسان کے راستے وسط ایشیائی ریاستوں تک رسائی حاصل کر رہا ہے کیونکہ ان ریاستوں کو کوئی سمندر نہیں لگتا۔

اگر کل کو ایران کے اندر کوئی اچھا حکمران آ گیا اور وہ ایران کو ان معاشی پابندیوں سے آزاد کر گیا تو ایران کی یہی بندرگاہ دنیا کی چند مصروف ترین بندرگاہوں میں شمار ہو گی۔ چونکہ ایران کو ایک طرف بحیرہ عرب کا سمندر لگتا ہے۔جہاں سے کویت، دوبئی، عراق، بحرین اور قطر جیسے بڑے بڑے تیل سے مالا مال ملک لگتے ہیں۔سعودی عرب کا ایشیائی ممالک کو جانے والا تیل اسی پشن سمندر سے ہو کر جاتا ہے اور دوسری طرف کیپٹین سی لگتا ہے۔ یہ وہی چھوٹا سا سمندر ہے جس کو روس اور روس سے آزاد ہوئے تمام ممالک کے کنارے لگتے ہیں۔

آپ روس کے اس ٹریڈ روٹ میں شامل ہونے کی بات کرتے ہو یہ صرف امریکہ کی لگائی معاشی بندیاں اور ایران کا جارحانہ پن ہے۔جس کی وجہ سے ایران باقی دنیا سے کٹ کر رہ گیا ہے۔ ورنہ جس دن یہ ختم ہو گیا، ایران کے اندر سے گزرنے والا ایک ایک روڈ افغانستان، روس اور دوسری ایشائی ریاستوں کی تجارت کا ذریعہ بن جائے گا۔ ہماری گوادر کی بندرگاہ کے پاس صرف چین اور افغانستان ہی ہیں۔چین کے ساتھ تو ہمارے تعلقات ٹھیک ہیں لیکن افغانستان کے ساتھ ہر مہینے ہم بارڈر بند کر دیتے ہیں۔

ہم پاکستانی دنیا کی واحد قوم ہیں جو اگر پاکستان کے کسی گاؤں کے اندر چھینک بھی آ جاتی ہے تو ہم افغانستان کو جانے والا ہر راستہ بند کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ انڈیا پچھلے دس سال سے ہم سے افغانستان کے لئے راستہ مانگ رہا ہے لیکن ہم شترمرغ کی طرح ریت میں اپنا سر دے کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے اگر ہم نے راستہ نہیں دینا ہے تو کیا انڈیا کو کہیں سے بھی راستہ نہیں ملے گا؟ وہ نہ صرف ایران سے راستہ لے گا بلکہ پوری دنیا کی تجارت کو ایران کی طرف موڑنے کی کوشش کرے گا۔

میں ایک سچا اور محب الوطن پاکستانی ہونے کے ناطے یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ لوگ خوابوں کی دنیا سے باہر نکلو، نفرت کی سیاست چھوڑ دو! ستر سال ہو گئے انڈیا سے لڑتے ہوئے۔۔۔ تین جنگیں کر کے بھی دیکھ لیں کچھ بھی نہیں ملا۔ ایک بار محبت کر کے بھی دیکھ لو! تین نسلیں پیدا ہو کر جوان ہو گئیں۔ اس نفرت کی آگ میں جلتے جلتے پتہ نہیں کتنے گھر جھلس کر رہ گئے لیکن ملا کچھ بھی نہیں۔ تو کیا ہے اگر کچھ سال محبت میں گزار کر دیکھ لیں؟

پہلی اور دوسری جنگ عظیم پوری انسانی تاریخ کی سب سے خوفناک جنگیں تھیں جن میں کروڑوں لوگ مارے گئے۔ یہ یورپی ممالک کی آپس میں جنگیں تھی لیکن آج یہی یورپی ممالک سب کچھ بھلا کر اکٹھے بھائیوں کی طرح بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہی جرمنی جس نے 1945ء میں پورے فرانس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی اور پھر یورپ نے مل کر اس جرمنی کے چار ٹکڑے کر دیئے تھے۔ آج پورے جرمنی اور فرانس کے کسی ایک بارڈر پر بھی آپ کو ایک بھی پولیس والا نظر نہیں آئے گا۔

یورپ کے کسی ایک ملک کی زبان دوسرے سے نہیں ملتی ہے لیکن پھر بھی یہ آپس میں مل کر رہ رہے ہیں اور ہماری تو زبان اور ثقافت سب کچھ ہی انڈیا سے ملتا ہے۔ صرف ایک کشمیر کا ایشو ہی تو ہے۔ ایک بار محبت سے اکٹھے رہ کر دیکھ لو کشمیر تو کیا پورا انڈیا ہی ہماری بانہوں میں ہوگا۔ محبت سے بڑی بڑی دنیا جیتی جا سکتی ہے تو پھر انڈیا تو ہمارا

اپنا بڑا بھائی ہے۔ دنیا صرف محبت کی زبان ہی سمجھتی ہے اور محبت سے ہی بڑے بڑے معرکے سرانجام دیئے جا سکتے ہیں۔صرف ایک بار دل سے محبت کرنا سیکھ لو! خدا کی قسم آپ نفرت کرنا ہی بھول جائیں گے اور انڈیا میں بسنے والے پچیس کروڑ مسلمانوں کی زندگیاں بھی آسان ہو جائیں گی۔

اسلام صرف پاکستان کے اندر ہی نہیں ہے۔انڈیا کے اندر ہم سے زیادہ مسلمان ہیں اور اسلام کا کوئی جہاد زمین یا حکومت حاصل کرنے کے لئے نہیں لڑا جاتا بلکہ صرف اسلام کی تبلیغ کو روکنے والوں کے خلاف لڑا جاتا ہے۔ شاید میں غلط ہوں یا میرے نظریات غلط ہیں لیکن ایک بار کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟ جنگیں کر کے بھی دیکھ لیں ہیں، ایک بار بھائی بنا کر بھی دیکھ لو اور سچے دل سے بنا کر دیکھو۔ مجھے یقین ہے انڈیا بھی ہماری محبت پر اپنی جان دینے کو بھی تیار ہو جائے گا۔

میں شاید بہت دور آ گیا ہوں، شاید میں نے کچھ زیادہ ہی لکھ دیا ہے۔اس لیے اگر میری کوئی بھی بات بری لگی ہو تو پلیز مجھے معاف کر دیں۔ میں محبت کرنے والا آدمی ہوں مجھ سے ایک شخص کی محبت تو سنبھالی نہیں گئی تو پورے انڈیا کی محبت کو کیسے سنبھالوں گا۔ میں واپس کہانی کی طرف آ جاتا ہوں۔

مسقط جانے والے لڑکوں کو ایران کی بندرگاہ چاہ بہار سے نہیں بھیجا جاتا تھا کیونکہ چابہار کی بندرگاہ چوبیس گھنٹے مصروف رہتی تھی اور یہاں پر سیکورٹی کے سخت انتظامات ہوتے تھے۔اس لیے ایجنٹ چابہار سے ستر کلومیٹر دور کونارک اور گورڈیم کے درمیانی علاقہ سے لانچیں نکالتے ہیں۔ یہ پورا ساحلی علاقہ کٹا پھٹا ہے۔کونارک سے مسقط 290 کلومیٹر سمندر پڑتا ہے اور یہ سمندر تیل بردار اور دوسرے تجارتی سامان والے جہاز، لانچیں اور ماہی گیری والی کشتیوں سے بھرا ہوا ہے۔

ایجنٹ رات کے اندھیرے میں لڑکوں کو لانچوں میں بٹھاتے ہیں اور چھ سات گھنٹوں میں مسقط پہنچا دیتے ہیں۔ یہ بہت زیادہ آسان کام ہے اور اس میں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ پکڑے جانے کے چانسز ایک فیصد سے بھی کم ہیں اور لانچ کے ڈوبنے کے چانسز البتہ دس فیصد سے زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ ایجنٹ حضرات زیادہ لانچ میں لڑکے بہت زیادہ بٹھا لیتے ہیں اس لیے زیادہ وزن ہونے کی وجہ سے لانچ ڈوب جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔

یہ ایشیائی علاقہ ہے اور انسانی جان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ یہاں یورپ کی طرح کوئی ریسکیو کرنے والا نہیں ہوتا۔اگر کوئی لانچ ڈوب گئی تو پھر موت ہی مقدر ہوتی ہے اور اگر قسمت نے ساتھ دے دیا اور مسقط پہنچ گئے تو آدمی

پیچھے گھر والوں کی تقدیر بدل دیتا ہے۔غربت اور افلاس کی زندگی سے باہر نکل جاتا ہے۔نوید بھی مسقط جانا چاہتا تھا لیکن اس کی زندگی نے وفا نہ کی اور بارڈر پر ہی مارا گیا۔اس کی قسمت میں پاکستان میں ہی مرنا لکھا تھا اور وہ مر گیا۔ چار بہنوں اور بوڑھے ماں باپ کو اس دنیا میں چھوڑ کر چلا گیا۔آج دس سال بعد جب میں یہ تحریر لکھ رہا ہوں تو نرما بہت یاد آ رہی ہے۔

وہ پاگل سی خوبصورت لڑکی پتہ نہیں کس حال میں ہوگی۔اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔سارے زمانے کی شرارتیں اس معصوم سی لڑکی کی آنکھوں میں رہتی تھیں۔پتہ نہیں اتنے سالوں بعد اب وہ کیسی ہوگی۔کون کون سے درد کی داستانیں اس کی آنکھیں کہتی ہوں گی۔میں نے یونان پہنچ کر کراچی میں پتہ کروایا تھا لیکن وہ لوگ وہاں سے گھر چھوڑ کر پتہ نہیں کہاں چلے گئے تھے۔بعد میں بھی ایک دو بار میں نے کوشش کی لیکن نرما اور اس کے گھر والوں سے کبھی رابطہ نہیں ہوا۔دل ایک بار نرما سے ملنے کو تڑپتا ہے لیکن کراچی کی دو کروڑ کی آبادی نرما کو کھا گئی۔اسے کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔شاید میری تحریر بھی اس تک پہنچ جائے۔

ہم ایک سو بیس کے قریب لڑکے راسک کے اس احاطے میں رہ گئے تھے۔یہاں پر احاطہ بڑا تھا اس لیے یہاں رہنے کی آسانی تھی۔رات کو ڈنکی تو صرف تین گھنٹے کی لگائی تھی لیکن اس ڈنکی نے تمام لڑکوں کو رقم سے محروم کر دیا تھا اور اب لڑکے خالی ہاتھ رہ گئے تھے۔ابھی یونان کا سفر بہت لمبا تھا۔پاکستان سے یونان تک کے سفر میں پیسوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔کراچی سے باہر نکلتے ہی ہم ایجنٹوں کی ذمہ داری بن جاتے ہیں اور وہی ہمارے کھانے پینے کا انتظام بھی کرتا ہے۔

پیسے اگر ہمارے پاس ہوں بھی تو وہ زیادہ سے زیادہ سگریٹ خریدنے کے کام آتے ہیں اور سگریٹ پانچ ڈالر کا ایک پیکٹ ہاؤس انچارج بیچتے ہیں۔چونکہ ہم لڑکے تو بازار جا نہیں سکتے اس لیے ہر ہاؤس انچارج کے پاس سگریٹوں کے پیکٹوں کے پیکٹ ہوتے ہیں۔یہ پیکٹ بازار سے آدھے ڈالر سے بھی کم کا ہوتا ہے لیکن وہاں پر پانچ ڈالر سے کم کا نہیں ملتا۔جو لڑکے لوٹنے سے بچ جاتے ہیں یا جن لڑکوں کی ایجنٹ پیچھے سے بہت تگڑے ہوتے ہیں وہ ان کو ہاؤس انچارج سے پیسے دلوا دیتے ہیں اور پھر ان کے گھر والوں سے پیسے لے لیتے ہیں۔

کمائی یہاں پر بھی ہوتی ہے۔ایجنٹ ایک ڈالر سو روپے سے بھی زیادہ کا دیتے ہیں لیکن اگر آپ کے پاس پیسے نہیں ہیں تو بھی آپ کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ایجنٹ آپ کو یونان میں آپ کے رشتہ داروں یا دوستوں کے گھر تک

چھوڑ کر آتے ہیں۔ پیسوں کی ضرورت صرف اس وقت پڑتی ہے جب آپ پکڑے جاتے ہیں اور ڈی پورٹ ہوتے ہیں۔ کوئٹہ ڈی پورٹ ہونے کی صورت میں اگر آپ کے پاس پیسے ہیں تو پھر ہی آپ کھانا خرید سکتے ہو یا اپنے گھر والوں سے فون پر رابطہ کر سکتے ہو۔ بعض اوقات پولیس کے چھاپے کی صورت میں لڑکے بھاگ جاتے ہیں۔ کیونکہ ایک سو پچاس لڑکوں کے گروپ کو ایک دم پولیس والے نہیں پکڑ سکتے۔ بعض اوقات ان میں سے کچھ لڑکے بھاگ جاتے ہیں تو پھر ان لڑکوں کو بھی ایجنٹ سے دوبارہ رابطہ کرنے کے لئے پیسوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

اگلا پورا دن ہم نے راسک میں ہی سوتے ہوئے گزارا۔ اگلی رات کو ہمیں کاروں میں ڈال کر بزمان لے جایا گیا اور دو تین دن ادھر بزمان میں ہی رہے کیونکہ بزمان سے آگے بم شہر تھا اور بم پولیس پورے ایران میں مشہور تھی۔ ڈنکروں کے لئے بم چوکی کسی بہت بڑے عفریت کی مانند تھی۔ یہاں پر پولیس کی بہت سختی تھی۔ یہاں کی پولیس پکڑ کر صرف ڈی پورٹ ہی نہیں کرتی تھی بلکہ مارتی بھی بہت زیادہ تھی۔ وہ ہر ایک لڑکے کو دہشت گرد کی نظر سے دیکھتے تھے اور مار مار کر ایک ایک ایجنٹ کی ساری تفصیل معلوم کرتے تھے۔

یہ بہت پرانا اور تاریخی شہر ہے۔ یہ شین ایمپائر کے دور میں اس شہر کی بنیاد رکھی گئی۔ 2003ء کے زلزلے میں یہ شہر تباہ ہو گیا تھا۔ قریباً پچیس ہزار سے زائد لوگ اس زلزلے میں مارے گئے تھے۔ یہاں پر کپڑے کی بہت بڑی بڑی انڈسٹریاں ہیں۔ ایجنٹ کبھی بھی یہاں پر رسک نہیں لیتے ہیں۔ بزمان سے بم 240 کلومیٹر دور ہے۔ بزمان میں ہم صرف تیس لڑکے ہی رہ گئے تھے۔ باقی لڑکے کسی اور گھر میں چلے گئے تھے۔ ہم یہاں پر صرف تیس لڑکے تھے اور کھانے کے نام پر روزانہ ٹماٹروں والے نمکین چاول ملتے تھے اور وہ بھی دن میں صرف ایک بار۔

میں یہاں پر تین دن رہا اور اس کے بعد رات کو تین کاریں آ گئی اور انہوں نے دس دس لڑکوں کو کاروں میں بٹھایا اور مین روڈ سے ہٹ کر کچی سڑکوں پر چلنے لگے۔ اس بار میں ڈگی میں چلا گیا تھا۔ کچے روڈ پر لگنے والے دھچکوں سے ہی مجھے پتہ چل رہا تھا کہ ہم لوگ مین سڑک پر نہیں ہیں ورنہ ایران کی ساری سڑکیں بڑی کشادہ اور صاف ستھری ہیں۔ یہاں پر کاریں دو سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے بھی بھاگتی ہیں۔ ہم دو لڑکے ڈگی میں بند تھے۔ ڈگی کے اندر دروازوں کے پاس جوڑ ہوتی ہے وہ نکالی ہوئی تھی اور اندر ہوا آ رہی تھی، کم تھی لیکن سانس نہیں گھٹ رہا تھا۔ تین گھنٹے تک ہم لڑکے ایسے ہی کار میں سفر کرتے رہے۔ اس کے بعد ڈرائیور نے ہم کو ایک درختوں کے جھنڈ میں اتار دیا اور وہیں انتظار کرنے کا کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

ہم لڑکے اندھیرے میں درختوں کے نیچے جا کر اکٹھے بیٹھ گئے۔ ابھی ہمارے ساتھ کوئی بھی ایجنٹ یا ڈنکر نہیں تھا۔ ہم گھبرا رہے تھے کہ شاید ایجنٹ ہمیں اکیلا چھوڑ کر بھاگ گیا ہے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور گاڑی مزید لڑکوں کو لے کر آ گئی اور اس کے بعد تیسری گاڑی بھی آ گئی۔ ڈنکر بھی آ گئے تھے اور انہوں نے ہم لڑکوں کو اٹھایا اور سفر کرنا شروع کر دیا۔

رات کے دس بج گئے تھے۔ وہ ڈنکر ہمیں صبح چھ بجے تک مسلسل سفر کرواتے رہے۔ آٹھ گھنٹے کا یہ پہاڑی سفر تھا۔ لڑکے تھکاوٹ سے مرنے کے قریب ہو گئے تھے۔ جو سامان ایران کے بارڈر پر رہ گیا تھا وہ اب یہاں پر پھینکنا شروع ہو گئے تھے۔ کھانے کا سامان (بیگ میں بسکٹ اور بھنے ہوئے چنے ہوتے ہیں جو راستے میں کھانے کے متبادل کے طور استعمال ہوتے ہیں) بھی پھینکنا شروع ہو گئے تھے۔

مجھ میں بھی اب سامان اٹھانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ میر ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ میں نے رستے میں گرا ہوا بسکٹ کا ایک پیکٹ اٹھایا اور اسے کھول کر کھانے لگا۔ یہی میری غلطی تھی کیونکہ میرے پاس پانی کی بوتل نہیں تھی اور خالی پیٹ جب سات آٹھ بسکٹ میں نے کھا لیے تو اب پیاس محسوس ہونے لگی۔ ٹانگیں تو پہلے ہی چلتے چلتے جواب دے چکی تھیں اور اب حلق خشک ہوا تو میرا سر چکرانا شروع ہو گیا۔ قریباً پانچ منٹ تک میں ایسے ہی برداشت کر کے چلتا رہا۔ میری برداشت ختم ہو گئی تو میں نیچے زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

''ہے کس کش کس کش نوبشی ایستا شوا ایسا دشو!'' ڈنکر نے تین چار ٹھڈے میری کمر میں مارے اور میرا بازو پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

''پولیس پولیس!'' وہ آہستہ آہستہ میرے اوپر چلا رہا تھا۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور ڈنکر کی طرف پانی کا اشارہ کیا۔

''آب آب!'' میں آہستہ آواز میں پکار رہا تھا۔ ڈنکر کو میری بات کی سمجھ آ گئی اور اس نے اپنے بیگ سے پانی کی ایک بوتل نکالی اور اسے میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

میں نے جلدی سے اس سے بوتل پکڑی اور ڈھکن کھول کر اسے منہ سے لگا لیا۔ صرف دو گھونٹ ہی میرے حلق سے نیچے اترے تو مجھ میں جیسے دوبارہ سے زندگی لوٹ آئی۔ ڈنکر نے زبردستی میرے ہاتھ سے بوتل چھینی اور

اسے ڈھکن سے بند کر کے دوبارہ بیگ میں ڈال لی۔

''نو آب نو پرابلم نو پرابلم!'' اس نے ہاتھ سے نفی کا اشارہ کیا اور مجھے آگے کی طرف دھکا دے دیا۔ میں جلدی سے آگے بڑھنے لگا۔لڑکے مجھ سے کچھ دور چلے گئے تھے۔

اگر بہت زیادہ پیاس لگی ہو تو ایک ساتھ ہی سارا پانی نہیں پینا چاہیے ورنہ پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے۔ یہ بات ہمیں ایران کی ڈنکی لگانے سے پہلے بتائی گئی تھی لیکن میں اسے فراموش کر گیا تھا۔ڈنکر نے مجھے بازو سے پکڑا اور بھگاتا ہوا آگے لڑکوں کے پاس لے گیا۔ میں لڑکوں کے پاس پہنچ گیا تو آہستہ آہستہ ان کو کراس کر کے آگے بڑھتا رہا اور تقریباً درمیان میں پہنچ کر نارمل رفتار سے چلنے لگا۔ اب میں ٹھیک ہو گیا تھا۔ بسکٹ دیکھ کر میں پاگل ہو گیا تھا۔ آخری بار بسکٹ میں نے بہاولپور میں کھایا تھا اور آج جب بسکٹ کا پیکٹ گرا ہوا دیکھا تو میں سب کچھ بھول گیا تھا۔

صبح چھ بجے کے قریب ڈنکر ہمیں لے کر ایک نالے کے قریب پرانے پل کے نیچے لے آئے۔ یہ پل اب ناقابلِ استعمال تھا جو کہ آدھے سے زیادہ ٹوٹ گیا تھا اور نیچے لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی تھی۔ڈنکر ہمیں اس پل کے نیچے لے آئے اور ہمیں ادھر لیٹنے کا کہہ دیا۔ وہ سارے کے سارے فارسی بول رہے تھے اور ہم میں سے کسی کو بھی فارسی نہیں آتی تھی۔بس اشاروں سے ہی ہمیں پتہ چلا کہ وہ ہمیں ادھر سونے کا کہہ رہے تھے اور پل سے باہر نہ نکلنے کا کہہ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر تک ادھر ہی کھڑے رہے اور پھر سارے ڈنکر ہمیں وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔

لڑکے پوری رات چلتے چلتے تھک کر چور ہو گئے تھے اس لئے وہیں پڑے پڑے سو گئے۔ مجھے بھی کچھ دیر میں نیند آ گئی اور میں دوپہر تک ایسے ہی سوتا رہا۔دوپہر کو دو بجے کے قریب لڑکوں کے آہستہ آہستہ بولنے کی آوازوں سے میری آنکھ کھل گئی اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔آدھے سے زیادہ لڑکے ابھی تک سو رہے تھے اور باقی جو لڑکے اٹھ گئے تھے وہ آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔

زیادہ تر لڑکے جوڑوں کی شکل میں اپنے گھروں سے یونان جانے کے لئے نکلتے ہیں۔لڑکے اپنے کزن یا دوست وغیرہ کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔اس سے لڑکے کا ساتھ بھی ہو جاتا ہے اور ایک دوسرے کا سہارا بھی بن جاتے ہیں۔باقی یہاں پر بھی دوستیاں بن جاتی ہیں۔یہی لڑکے ایک دوسرے کا سہارا بنتے ہیں اور یہی دوستیاں بعد میں یونان میں بھی ساتھ دیتی ہیں۔کام وغیرہ تلاش کرنے کے لئے اجنبی ملک میں اجنبی زبان ہوتی ہے اور پنجاب سے آئے ہوئے ان لڑکوں کو کرکٹ کے علاوہ کچھ بھی نہیں آتا ہے تو پھر یہی واقفیت ہی کام آتی ہے۔

اگلے ایک گھنٹے تک قریباً سارے ہی لڑکے اٹھ گئے تھے اور اب آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ ان میں کچھ لڑکے تو یونان جانے والے تھے اور کچھ دوبئی کے لئے بھی تھے۔ مسقط جانے والے لڑکے ہم سے ادھر ہی علیحدہ ہو گئے تھے۔

ہمیں اب بھوک لگنے لگی تھی اور ہم ڈنکروں کا انتظار کرنے لگے۔ وہ آتے تو ان کو کھانے کا بولتے لیکن ڈنکروں نے سارا دن ہمیں اپنی صورت نہیں دکھائی۔ وہ رات کو دس بجے کے قریب ہی آئے اور آتے ہی ہمیں چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم میں سے کچھ لڑکے بہت زیادہ تیز تھے۔ انہوں نے احتجاج کیا کہ وہ بھوکے ہیں اور ہم کو کھانا چاہیے۔ یہ سن کر ڈنکروں نے آگے سے گالیاں نکالیں اور مارنا شروع کر دیا۔ ان کے پاس پلاسٹک کی موٹی تاریں تھیں۔ وہ اس سے مارتے تھے اور پورے زور سے مارتے تھے۔ یہ تار جسم پر جہاں بھی ایک بار پڑ جاتی تھی تو اس کا نشان باقی رہ جاتا تھا اور اگلے دو تین گھنٹوں تک اس کی جلن رہتی تھی۔

دو منٹ میں ہی ڈنکروں نے تمام لڑکوں کو سیدھا کر دیا اور ایک بار پھر ہم لڑکے قطار بنا کر آگے کی طرف پیدل بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ اس رات بھی ہم لڑکے صبح چار بجے تک بھوکے پیاسے سفر کرتے رہے اور آخر کار ہم نے بھم شہر کو کراس کر لیا۔ ہم خیریت سے بھم کو چھوڑ کر آگے آ گئے تھے۔ صبح چار بجے کے قریب ایک ٹرک آیا اور ہم سب لڑکوں کو لے کر روڈ پر آ گیا۔ ہم اب کرمان کی طرف بڑھ رہے تھے۔

آدھے گھنٹے تک سفر کرنے کے بعد ٹرک ہمیں ایک بہت بڑے احاطے میں لے کر آ گیا۔ یہاں پر لڑکے بھی بہت زیادہ تھے۔ ڈرائیور نے ہمیں جلدی جلدی نیچے اتارا۔ کچھ لڑکے پہلے ہی وہاں بیگوں سمیت تیار بیٹھے ہوئے تھے۔ ہاؤس انچارج نے ہمیں نیچے اتارا اور دوسرے لڑکوں کو ٹرک میں سوار کروا دیا۔

''تم میں سے دوبئی جانے والے کون کون سے لڑکے ہیں؟'' ہاؤس انچارج نے ہم میں سے لڑکوں سے پوچھا تو ہم میں سے بارہ کے قریب لڑکے آگے آ گئے۔

ہاؤس انچارج نے ان لڑکوں کے ایجنٹوں کے نام لکھے اور انہیں بھی ٹرک میں دوبارا سوار کر دیا۔ ٹرک ان لڑکوں کو لے کر جیروفٹ چلا جاتا۔ وہ لڑکے جیروفٹ میں ہی قیام کرتے اور پھر وہاں سے رات کو بندر عباس کی طرف چلے جاتے۔ بندر عباس سے ایک رات کی مزید ڈنکی لگتی تھی۔ ایک پولیس چوکی کو پیدل کراس کیا جاتا اور پھر لڑکے وہاں سے بندر لینگر پہنچائے جاتے۔ جہاں سے آگے سید بوٹ اور لانچوں کی مدد سے دوبئی پہنچایا جاتا۔

بندر لینگر سے دوبئی صرف ایک سو پچاس کلومیٹر کا سمندر پڑتا ہے اور سید بوٹ تین چار گھنٹے میں کراس کر جاتی ہے۔ یہاں پر لڑکوں سے پیمنٹ بندر لینگر سے ہی کلیئر کروا دی جاتی ہے۔ دوبئی کے اندر کوئی ایجنٹ نہیں ہوتا۔ سید بوٹ بھی ایران کی ہی ہوتی ہے اور یہ لڑکوں کو دوبئی کے کسی ویران سے ساحل پر اتار کر واپس آ جاتی ہے۔ لڑکے اس سے آگے خود ہی ہمت کرتے ہیں اور ساحل پر اترتے ہی غائب ہو جاتے ہیں۔

دوبئی میں پاکستانی، انڈین اور بنگلہ دیشی بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ آپ کو ہر جگہ ہر وقت کوئی نہ کوئی ہندی یا پنجابی بولنے والا مل جاتا ہے۔ لڑکے رات ایسے ہی کسی کونے میں چھپ کر گزارتے ہیں اور صبح کو جو بھی آدمی مل جاتا ہے اس سے فون کروا کر اپنے کسی جاننے والے کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں کے ہندی یا پاکستانی بھائی آپ کا فون بھی کروا دیتے ہیں بلکہ اگر کہیں نزدیک ہی رہتے ہوں تو آپ کے عزیز کے گھر بھی چھوڑ آتے ہیں۔

چھوٹا سا ملک ہے لیکن بہت پیارا ملک ہے۔ لاکھوں لوگوں کے گھروں میں روزگار فراہم کرتا ہے۔ یہ ملک تیل کی دولت سے مالا مال تو ہے ہی لیکن فری ٹریڈ کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔ دوبئی کے اندر پوری دنیا کی مشہور ترین کمپنیوں کے ہیڈ آفس یا پھر برانچ آفس ہوتے ہیں۔ دوبئی سونے کی بین الاقوامی خرید و فروخت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔

لڑکے اپنے عزیزوں اور دوستوں کے گھر میں پہنچ کر آرام کرتے ہیں اور پھر اپنا کوئی نہ کوئی کام وغیرہ ڈھونڈ کر زندگی کا پہیہ چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

پیچھے رہ جانے والے ہم سب لڑکے یونان والے ہی تھے۔ کچھ لڑکے ترکی والے بھی تھے لیکن ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ ترکی میں اس وقت تک زیادہ پاکستانی نہیں رہتے تھے۔ ترکی نے اس وقت نئی نئی ترقی کرنا شروع کی تھی۔ اس دور میں وہاں پر مزدوری تھوڑی مشکل سے ملتی تھی اور زیادہ پیسے بھی نہیں بنتے تھے۔ ترکی والے بھی وہ لڑکے تھے جنہوں نے آگے یونان کیلئے علیحدہ ایجنٹ کرنا تھا اس سے تھوڑے پیسوں کی بچت ہو جاتی تھی۔ ترکی میں 2013ء کے بعد لڑکے رکنا شروع ہو گئے تھے۔ وہاں پر چالیس ہزار کے قریب ماہانہ بچ جاتے تھے اور کام بھی نکل آیا تھا۔

یہ طیب اردگان کی محنت تھی جس نے ترکی کو اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا تھا اور اب ترکی میں کام اور پیسے کی فراوانی ہو گئی ہے۔ اب تو ترکی لڑکوں کو سٹے بھی دیتا ہے اور لڑکے ترکی میں کام کر کے اچھے خاصے پیسے بچا کر پاکستان

بھجوا دیتے ہیں۔

ہم اس دن اسی احاطے میں رکے رہے اور رات کو ایک بار پھر ٹرک میں بیٹھے اور وہ ہم کو کرمان لے آیا۔ یہاں پر ہم نے کوئی ڈنکی نہیں لگائی بلکہ سیدھا ہی کرمان پہنچ گئے۔ کرمان ایران کے چند بڑے اور صاف ستھرے شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ شہر بہت خوبصورت ہے۔ دس لاکھ کی آبادی والا یہ شہر اپنی ایرانی تاریخ اور تاریخی مسجدوں اور عمارتوں کی وجہ سے کافی شہرت کا حامل ہے۔ یہاں پر ہم کو صرف ایک دن ہی رکھا گیا اس کے بعد ہم یزد چلے گئے۔

یزد میں البتہ ہم نے دو دن گزارے اور یہ دو دن ہم نے جنگل میں ہی گزارے۔ یہ چھوٹا سا ایک جنگل تھا جو مین روڈ سے کافی ہٹ کر تھا۔ ڈرائیور ہم پچاس کے قریب لڑکوں کو یہاں پر اتار کر گیا اور پھر اس کے بعد آنا ہی بھول گیا۔ پوری رات اور اگلا پورا دن ہم نے ادھر ہی انتظار کرتے ہوئے گزارا۔

دوسرے دن لڑکوں میں بغاوت آنا شروع ہو گئی۔ لڑکے جنگل کراس کر کے نیچے گاؤں جانا چاہتے تھے لیکن باقی لڑکے ان کو منع کر دیتے۔ ڈر بھی تھا کہ اگر پکڑے جاتے تو اب تک کی ہماری محنت ضائع ہو جاتی۔ ایران والے ڈی پورٹ کر دیتے تھے۔ پاکستان والے لڑکوں کو قبول نہیں کرتے تھے تو ایرانی آرمی لڑکوں کو بارڈر کے اوپر لا کر چھوڑ دیتے اور دوسری طرف کھڑے ہو جاتے تھے۔ لڑکے خود ہی بارڈر کراس کر کے پاکستان چلے جاتے کیونکہ اس طرف ایرانی آرمی والے کھڑے ہوئے ہوتے تھے۔ وہاں سے پاکستانی فورسز پکڑ کر لے جاتی تھیں۔ اس لیے ہمیں اس جنگل میں باہر جانے سے ڈر لگ رہا تھا۔

ایجنٹ کی واپسی دوسرے دن کھانے کے ساتھ ہوئی۔ یہ پتلی پتلی روٹیوں کے بنڈل تھے۔ بالکل کاغذ کی طرح اور ایک پیکٹ میں سو کے قریب روٹیاں تھیں۔ ایجنٹ کے پاس ان روٹیوں کے تین بنڈل تھے اور ساتھ میں کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔

''ادھر یہی کچھ ملتا ہے۔ بچہ لوگ شکر کرو! خدا کھانے کے لئے کچھ تو دے رہا ہے۔'' ایجنٹ نے ہم لڑکوں کی سات پشتوں پر احسان کرتے ہوئے کہا۔

ہم نے خاموشی سے روٹیاں پکڑی اور ان خشک روٹیوں کو پانی کے ساتھ نگلنے لگے۔ پانی نزدیک ہی جنگل میں ایک نالہ بہتا تھا وہاں سے ہم لے آتے تھے اس لئے پانی کی کوئی کمی نہیں تھی۔ خوراک کی کمی ضرور تھی لیکن وہ بھی اب

مل رہی تھی۔ دو دن سے ہم لڑکے بھوک سے مر رہے تھے اس لئے اب یہی خشک اور پتلی روٹیاں ہی ہمارے لئے شامی کباب کی مانند لگ رہی تھیں۔

''ادھر ہی بیٹھو! کہیں دائیں بائیں نہیں جانا ہے۔ کھانا کھاؤ اور سو جاؤ! آگے بہت سختی ہے۔ کوئی بھی ڈنکی نہیں پہنچ رہی ہے، سب پکڑی جا رہی ہیں اس لئے انتظار کرو۔ آج رات کو نکلنے کی کوشش کریں گے۔'' ایجنٹ ہمیں کھانا دے کر واپس چلا گیا اور ہم لڑکے رات کا انتظار کرنے لگے۔ اس رات کوئی ڈنکی نہیں لگی اور ادھر ہی ہم لوگوں کی دوسری رات بھی گزر گئی۔ دن کو ہم کھانے کا انتظار ہی کرتے رہے لیکن کوئی کھانا نہیں آیا۔

رات کو دس بجے کے قریب ایک ڈنکر آیا اور ہمیں لیکر چلنے لگا۔ ہم لڑکے جنگل سے باہر نکلے تو کچے روڈ پر ایک آئل ٹینکر کھڑا تھا۔ یہ گول ٹینکی نما ٹینکر تھا۔ پاکستان میں اکثر آپ نے آئل ٹینکر دیکھے ہوں گے جن کے اوپر ڈھکن لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس وقت وہ ڈھکن اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ ڈرائیور نے ہم لڑکوں کو ٹینکر کے اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ہم لڑکے جلدی جلدی ٹینکر کے اوپر چڑھ کر اندر بیٹھنے لگے۔

وہ بڑا ٹینکر تھا لیکن پچاس لڑکوں کے لئے چھوٹا تھا۔ ہم سب لڑکے اندر ایک دوسرے کے ساتھ پھنس کر بیٹھ گئے اور ڈرائیور نے ڈھکن بند کر دیا۔ اندر گھپ اندھیرا ہو گیا اور یہاں سے ہم لڑکوں کی زندگی کا خوفناک ترین سفر شروع ہوا۔ دس منٹ میں ہی ٹینکر کی آکسیجن کم ہو گئی اور سانس لینا بھی بھاری ہو گیا۔ ٹینکر کے نیچے سوراخ کر کے ہوا کے گزرنے کا راستہ بنایا گیا تھا۔ یہ پیندے کی طرف چار سوراخ تھے لیکن پچاس لڑکوں کے لئے ناکافی تھے۔ گول پیندا ہونے کی وجہ سے ہم لڑکے ایک دوسرے کے اوپر بیٹھے ہوئے تھے۔

یزد سے کاشان قریباً 360 کلومیٹر کا سفر ہے۔ ایک عام بس یا گاڑی تین سے چار گھنٹوں میں یزد سے کاشان پہنچا دیتی ہے۔ یہ سیدھا راستہ جونائیں سے ہو کر گزرتا ہے لیکن یہاں پر پولیس کی بہت زیادہ چیکنگ ہے۔ کچھ چیک پوسٹوں میں تو پولیس والے بڑے بڑے ٹرکوں اور ٹینکروں کو بجلی کی تاریں لگا کر دیکھتے ہیں۔ بندے اگر کہیں چھپے ہوتے ہیں تو کرنٹ سے چیخنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ راستہ آگے ایرانی دارالحکومت تہران کو جاتا ہے اسی لئے ادھر کیلئے تھوڑی سختی بھی زیادہ ہوتی ہے۔ یہ ٹینکر ہمیں اصفہان کے راستے لے کر گیا اور وہاں سے پھر کاشان لے کر گیا۔

اصفہان کی طرف سے راستہ 580 کلومیٹر ہو جاتا ہے اور ٹینکر مین روڈ سے ہٹ کر کچے پکے راستوں پر چلتا رہا اور سات گھنٹوں میں کاشان پہنچا۔ یہ سات گھنٹے ہماری زندگی کے طویل ترین گھنٹے تھے۔ آکسیجن ختم ہو جائے تو

انسان مر جاتا ہے لیکن اگر آکسیجن کم ہو جائے تو آدمی مرتا نہیں ہے لیکن اس کی زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ صرف ایک گھنٹے میں ہی ٹینکر کسی تندور کی طرح جلنے لگا۔ گرمی حد سے زیادہ بڑھ گئی۔ جسم کے اندر موجود سارا پانی ختم ہو گیا۔ سانس سینے میں اٹک اٹک کر چلنے لگی۔ شاید میرے پاس وہ الفاظ ہی نہیں ہیں جن میں یہ قصہ بیان کر سکوں۔

یونان کے اس سفر میں سب سے زیادہ ڈر پکڑے جانے کا ہوتا ہے۔ آپ یونان کی نہر کراس کرتے ہوئے بھی پکڑے جائیں جو یونان اور ترکی کا بارڈر ہے۔ تو بھی وہاں سے سیدھا ایران اور پھر پاکستان ڈی پورٹ ہو جاتے ہیں۔ دو تین مہینے کی یہ محنت ایک منٹ میں ہی زیرو ہو جاتی ہے۔ سب سے زیادہ خوف پکڑے جانے کا ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر پکڑے گئے تو پھر اسی غربت اور افلاس کی زندگی میں دوبارہ دھکیل دیا جاتا ہے۔ سب سے بڑا یہی خوف ہوتا ہے اور انسان کے باقی سارے خوف ثانوی ہو جاتے ہیں۔ صرف بقا کی کوشش ہی ہوتی ہے اور یہی کوشش انسان کو ہر ڈر اور خوف سے آزاد کر دیتی ہے۔

یہاں پر بھی جب لڑکے آکسیجن کی کمی سے بے ہوش ہونا شروع ہوئے تو لڑکوں نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ وہ پوری طاقت سے کنٹینر کو کھٹکھٹا رہے تھے۔ کچھ لڑکے ڈھکن کو کھولنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ڈھکن اوپر سے بند تھے اور کسی بھی کوشش سے اندر سے نہیں کھل سکتے تھے۔ ٹینکر چاروں طرف سے مکمل بند اور قریباً بیضوی شکل کی طرح گول تھا۔ جب لڑکوں نے ٹینکر کو اندر سے کھٹکھٹانا اور چلانا شروع کیا تو اس سے باہر تو نارمل آواز ہی جاتی لیکن چونکہ ٹینکر بند تھا اس لئے آواز کی شدت نے کانوں کے پردے پھاڑنا شروع کر دیئے۔

میں بڑی دیر سے برداشت کر کے بیٹھا ہوا تھا لیکن اس قدر زور دار آواز نے میرے کانوں کے سات پردوں کو بھی کھول دیا تھا۔ میں نے بے اختیار اپنے دونوں ہاتھوں کو کانوں پر رکھا اور دباتا چلا گیا۔ لیکن آوازیں پھر بھی میرے کانوں کو پھاڑ رہی تھیں۔ گرمی، حبس، آکسیجن کی کمی اور شور نے ہم کو مرنے کے قریب پہنچا دیا تھا۔ ہم سب لڑکے بے ہوش ہونے کے قریب پہنچ گئے تھے لیکن ان آوازوں نے ہمیں پھر عذاب کی زندگی میں ہوش دلا دی۔ میں نے اپنے سر کو گھٹنوں میں دبایا تاکہ آواز کی شدت کم سے کم ہو۔ اس سے مجھے کچھ سکون ملا لیکن لڑکے بدستور چیخیں مارتے رہے۔

باہر ٹینکر کچے راستوں پر تھا اور ڈرائیور کو پتہ تھا۔ لڑکے جب گرمی اور حبس میں تنگ ہوں گے تو چلائیں گے۔ اس لئے اس نے ان باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا اور خاموشی سے ٹینکر بھگاتا رہا۔ لڑکے ایسے ہی مزید آدھے گھنٹے

تک چلاتے رہے۔اسکے بعدان کی ہمت جواب دے گئی اور وہ دوبارہ بیٹھ گئے اور زندگی کی تگ ودو کرنے لگے۔

زندگی اور موت کی اس کشمکش کا سلسلہ مزید ایک گھنٹے تک جاری رہا اور پھر اس کے بعد سب لڑکے آزاد ہو گئے۔انہیں اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا۔دعائیں جتنی بھی تھیں سب ختم ہو گئیں اور ہم سب اپنے مرنے کا انتظار کرنے لگے۔ہمیں اس ٹینکر میں سفر کرتے ہوئے قریباً تین گھنٹے ہو گئے تھےلیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے ساری زندگی اسی ٹینکر میں گزر گئی ہو۔ہم لڑکے زمان ومکان کی قید سے آزاد ہو گئے تھے۔

ایک منٹ میں ایک صدی کا سفر کیسے کیا جاتا ہے اس کا اندازہ اس دن ہم سب لڑکوں کو ہو گیا تھا۔آئین سٹائین کے نظریہ انسانیت کو میں جان گیا تھا۔انسان ایک پل میں کئی صدیوں کا سفر کرسکتا ہے۔وقت مستقل نہیں ہوتا۔ہم میں سے آدھے لڑکے بے ہوش ہو گئے تھے اور جو ہوش میں تھے وہ اتنے ادھ مرے ہو گئے تھے کہ اپنی مرضی سے ایک انگلی بھی نہیں ہلا سکتے تھے۔

میں اپنی آنکھیں بند کئے مسلسل ایمان کو یاد کررہا تھا۔ایک ایمان کا چہرہ ہی تھا جو مجھے اس درد سے نجات دلا سکتا تھا۔لیکن یہاں پر ایمان بھی نہیں پہنچ پا رہی تھی۔شاید وہ مجھے دیکھ رہی تھی، مجھے محسوس کررہی تھی۔لیکن میرے پاس نہیں آرہی تھی۔میری محبت کی آزمائش کررہی تھی۔

شاید میں مر رہا تھا،میرا جسم ڈھیلا پڑنا شروع ہو گیا اور آہستہ آہستہ جیسے بالکل جان ختم ہو گئی۔میرے اوپر اس وقت تین اور لڑکے تھے جو میری ٹانگوں اور میرے ہاتھ پر اپنا پورا وزن ڈالے بیٹھے تھے۔مجھے پہلے ان کا وزن محسوس ہورہا تھالیکن پھر پورا جسم جیسے سن ہو گیا اور کچھ بھی محسوس نہیں ہورہا تھا۔شاید میں زیرو ہو گیا تھا۔صرف دماغ کام کررہا تھا اور سانس چل رہی تھی وہ بھی بہت اٹک اٹک کر چل رہی تھی۔ہر سانس درد کے ایک نئے ذائقے سے روشناس کروا رہی تھی۔

یہ بے بسی کی انتہا تھی جو مجھے اس اندھیرے کنٹینر میں موت کی طرف کھینچ رہی تھی اور میں مر رہا تھا۔میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا اور میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ایمان کو یاد کررہا تھا۔آج محبت کے لئے جان دینے لگا تھا۔اپنے ملک،اپنے ماں باپ،بہن بھائیوں سے دور۔۔۔اپنی ایمان سے دور ایرانی روڈ پر چلنے والے اس ٹینکر میں جان دے رہا تھا۔آخر ایمان کو میری حالت پر ترس آ گیا اور وہ میرے خیالوں میں اتر آئی۔شاید یہ مرنے سے پہلے میری موت کو آسان کرنے کیلئے اپنا دیدار کروا رہی تھی۔

''ایمان!'' میں نے کمزور سی آواز میں اسے پکارا تو اس نے میرے گالوں پر آئے ہوئے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے صاف کرنا شروع کر دیا۔

''ایمان! مجھے معاف کر دینا، میں تمہارے خواب کو حقیقت میں نہ بدل سکا۔ مجھے معاف کر دو، میں رانجھا نہ بن سکا۔ محبت تو بہت کی تھی اور اس محبت کے لئے جان بھی دے رہا ہوں لیکن اس دوسرے خدا کو نہ مل سکا۔'' میرے منہ سے سسکیاں نکل رہی تھیں۔

''ایمان مجھے معاف کر دینا! میں مر رہا ہوں۔ زندگی نے اتنا موقع ہی نہیں دیا ورنہ میں اس مجسمے کو جسے تم دوسرا خدا کہتی ہو لا کر تمہارے قدموں میں رکھ دیتا۔'' میں نے ایمان کے پاؤں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''راضی! محبت اتنی بھی کم تر نہیں ہے ہماری۔'' میری آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے اور میں بے بسی سے ایمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ ایک پل کے لئے مسکرائی اور پھر آگے ہو کر اس نے ان آنسوؤں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ وہ اپنے ہونٹوں کو میرے آنسوؤں سے سیراب کر رہی تھی۔ صرف چند لمحے پہلے آنے والی زندگی اور موت کی کشمکش ختم ہو گئی اور میری رگوں میں دوبارہ سے زندگی دوڑنے لگی۔ وہ اگلے کئی پل تک میرے آنسوؤں کو چومتی رہی۔ آخر میری آنکھوں نے آنسو بہانا بند کر دیئے اور اس کے ہونٹ میرے گالوں سے الگ ہو گئے۔ زندگی میں پہلی بار مجھے اپنی آنکھوں پر غصہ آنے لگا۔ جنہوں نے اتنی جلدی ہی کام کرنا بند کر دیا تھا۔

''راضی! تجھے لال سرخی بہت اچھی لگتی ہے نا؟'' ایمان نے مجھ سے پوچھا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ہاں ایمان! سرخ ہونٹ زندگی کی علامت ہوتے ہیں اور جب تم اپنے ہونٹوں پر سرخ لپ اسٹک لگاتی ہو تو ساری دنیا تمہارے قدموں میں رکھ دینے کو جی چاہتا ہے۔ پوری دنیا کی خوبصورتی تمہارے ان سرخ ہونٹوں کے آگے کچھ بھی نہیں ہے۔'' میرے ہاتھ اب بھی ایمان کے پیروں کو چھو رہے تھے۔

''راضی! تمہارے آنسوؤں کو پینے سے ہونٹ بڑی جلدی سرخ ہوتے ہیں۔ کسی دن خون بھی پی کر دیکھوں گی۔ میرے خیال میں اس کے بعد مجھے دنیا کی کسی لپ اسٹک کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہی لال ہو جائیں گے۔'' اس نے شرارت سے مجھے آنکھ ماری اور میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

مجھے تیل کے ٹینکر کی گرمی اور حبس پھر محسوس ہونے لگی۔ میں نے دائیں بائیں موجود لڑکوں کو ہاتھ سے ٹٹولا۔ جان سب کے اندر ہی تھی لیکن ہلنے جلنے اور چیخنے کی سکت جیسے ختم ہو گئی تھی۔ سب کچھ ہی ختم ہو گیا تھا۔ صرف زندگی کی ایک ہلکی سی ڈور رہ گئی اور وہ بھی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔

ٹینکر پوری رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا اور اندر زندگی اپنی آخری کوششوں میں لگی ہوئی تھی۔ درود شریف کا ورد اور خدا کا ذکر بھی اب ختم ہو گیا تھا کیونکہ اب کچھ بھی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ جب زندگی کی آس ہی ختم ہو جاتی ہے تو پیچھے کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔ یہ وہ بلیک ہول ہوتا ہے جس میں ہر چیز جا کر ختم ہو جاتی ہے۔

میں بھی زندگی اور موت کی اس دوڑ میں زندہ رہنے کی کوشش کرتے کرتے آخر کار تھک کر نیم بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد کچھ بھی یاد نہیں، پتہ نہیں ٹینکر مزید کتنی دیر تک چلتا رہا۔ وہی کہیں کھڑا ہوا، آہستہ ہوا، تیز ہوا یا دھچکے لگے کسی بھی چیز کا کوئی احساس نہیں تھا۔ زندگی کی جدوجہد ہی جیسے ختم ہو گئی تھی۔

آخر کار ٹینکر کا شان پہنچ گیا۔ ڈرائیور نے ٹینکر کو ایک جنگل میں کھڑا کیا اور اس کے ڈھکن کھول دیئے۔ تازا ہوا کے جھونکے ٹینکر کے اندر آئے تو سانسیں بحال ہونا شروع ہوئیں۔ جسم زندگی کی طرف دوبارہ لوٹنا شروع ہوا تو درد کی تیز لہریں پورے جسم میں دوڑنے لگیں۔ موت سے بچ جانے کا احساس سب تکلیفوں کو ختم کر رہا تھا اور لڑکے زور زور سے چلا رہے تھے۔ لیکن اٹھنے کی سکت ابھی تک کسی میں بھی نہیں تھی۔

ٹینکر کے باہر ڈرائیور اور دو ایجنٹ کھڑے تھے۔ انہوں نے لڑکوں کو آوازیں دیں لیکن کوئی بھی لڑکا اٹھ کر باہر نہیں آ رہا تھا۔ آخر وہ ڈرائیور ٹینکر کے اندر آ گیا اور اس نے لڑکوں کو اٹھا اٹھا کر اوپر سوراخ کے سامنے کرنا شروع کر دیا۔ وہاں سے ایجنٹ اس کو پکڑ کر اوپر اٹھا لیتے۔ لڑکے دوسرے لڑکوں کے اوپر سے گزر رہے تھے لیکن کسی بھی لڑکے کو کچھ نہیں محسوس ہو رہا تھا۔ سات آٹھ لڑکوں کو ہلانے جلانے اور اوپر اٹھانے کے بعد باقی لڑکے اب ٹھیک ہونا شروع ہو گئے تھے اور وہ خود سوراخ کے پاس جاتے اور وہاں سے ایجنٹ ان کو اوپر اٹھا لیتے۔

میں ایسے ہی ٹیک لگائے ٹینکر سے باہر جاتے ہوئے لڑکوں کو دیکھ رہا تھا۔ اب سب لڑکے کھڑے ہو گئے تھے اور سوراخ سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ایک لڑکا ابھی تک لیٹا ہوا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کو ہلایا تو اس میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ میں نے اس کا بازو پکڑا تو مجھے برف کی طرح ٹھنڈک محسوس ہوئی اور میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس کا ہاتھ نیچے گر گیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس کے منہ اور ناک

پر ہاتھ رکھا۔ سانسوں کی آمد و رفت ٹوٹ چکی تھی۔ زندگی اور موت سے لڑتے لڑتے وہ اس اندھیرے ٹینکر میں زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔

مجھے اس سے کچھ فاصلے پر ایک اور لڑکا پڑا ہوا نظر آیا اور میں لڑکوں کی ٹانگوں کے درمیان سے رینگتے ہوئے اس لڑکے تک پہنچ گیا۔ وہ بھی مر چکا تھا۔ اس ٹینکر میں دو لڑکے آج یونان کا خواب اپنی آنکھوں میں لئے زندگی کی بازی ہار گئے تھے۔ ڈرائیور کو ان دونوں لڑکوں کی موت کا پتہ چل گیا تھا۔ میں سب سے آخر میں ٹینکر سے باہر نکلا۔ میرے بعد ڈرائیور بھی باہر نکل گیا۔

اندر اب صرف ان دونوں لڑکوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک ایجنٹ سب لڑکوں کے نکلنے کے بعد اندر آ گیا اور کچھ دیر بعد باہر آ گیا۔ وہ بھی ان لڑکوں کی موت کی تصدیق کرنے گیا تھا۔ باہر میرے علاوہ صرف ایک دو مزید لڑکوں کو پتہ تھا لیکن ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ان ایجنٹوں سے کچھ کہہ سکتے۔ ڈرائیور ان ایجنٹوں کے ساتھ کچھ دیر مزید بات کرتا رہا۔ اس کے بعد ایک ایجنٹ ہمارے پاس رک گیا اور دوسرا ایجنٹ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ وہ ان دونوں لڑکوں کی لاشوں کو کہیں پھینکنے گئے تھے۔

جنگل میں لاشوں کو پھینکنے سے پہلے ان کے کپڑوں سے سب کچھ نکال لیتے تھے۔ ویسے بھی ہم لڑکوں کے پاس اپنے ملک کی کوئی چیز بھی شناخت نہیں ہوتی۔ ایرانی پولیس ان لڑکوں کو وہاں سے اٹھاتی ہے اور دو تین دن بعد لاشیں سرد خانے میں رہتی ہیں اس کے بعد لاوارث دفنا دی جاتی ہیں۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں چلتا۔ پیچھے اس لڑکوں کے گھر والے کئی کئی سال تک اپنے بیٹوں کی کسی خبر کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور ان کے بیٹے ایران یا ترکی کی مٹی میں مٹی ہو کر ختم ہو جاتے ہیں۔ مائیں اپنے بیٹوں کی تصویریں یونان سے آنے والے ایک ایک شخص کو دکھاتی رہتی ہیں کہ میرے بیٹے کی کوئی خبر ہو تو بتاؤ! لیکن رات کے اندھیرے میں کسی کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کون ساتھ چلتے چلتے اچانک چھوڑ کر چلا گیا۔

ہمارے ساتھ رہ جانے والے ڈنکر نے ہم سب لڑکوں کو ساتھ لیا اور جنگل میں اندر ہی اندر چلنا شروع ہو گیا۔ یہاں پر جنگل کے اندر ایک جھونپڑی بنی ہوئی تھی۔ ایجنٹ جھونپڑی کے اندر چلا گیا اور اندر سے روٹیوں کے پیکٹ نکال کر باہر لے آیا۔ ہمارے پاس پانی بھی ختم ہو گیا تھا۔ اس نے روٹیوں کے بنڈل ہماری طرف بڑھائے تو ہم نے پانی کا اشارہ کیا۔ اسے ہماری بات کی سمجھ آ گئی۔ اس نے ہم لڑکوں سے پانی کی خالی بوتلیں اکٹھی کر لیں۔

پانی ختم ہونے کی صورت میں ہم خالی بوتل کبھی بھی نہیں پھینکتے تھے کیونکہ راستے میں چلتے چلتے کہیں سے بھی پانی مل جاتا تھا تو ہم پہلے پانی کو چکھ کر چیک کرتے اوراس کے بعد نئے سرے سے بوتل بھر لیتے تھے۔چکھنے کی بات اس لئے کی کیونکہ ایران میں کئی جگہوں پر پانی کڑوا ہوتا ہے یا پھر گندہ ہوتا ہے۔اس کے اندر سے بدبو آتی ہے۔ ایجنٹ نے پانچ لڑکوں کے بیگوں میں پانی کی خالی بوتلیں رکھیں اور ہمیں وہیں بیٹھنے کا اشارہ کر کے ان لڑکوں کو لے کر چلا گیا۔

اس کی واپسی ایک گھنٹے تک ہوئی۔اس وقت تک صبح کی ہلکی ہلکی روشنی بھی آنا شروع ہوگئی تھی۔جنگل میں ایک چھوٹی سی پگڈنڈی کے کنارے پر ایک ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا۔وہ ایجنٹ وہیں سے پانی لے کر آیا تھا اور اس نے ہاتھوں کے اشاروں سے بتا دیا تھا کہ کوئی لڑکا دن کو اس طرف نہیں جائے گا۔وہ پگڈنڈی تھی اور وہاں پر کسی کے دیکھ لئے جانے کا ڈر تھا۔ہمیں وہ سارا دن ادھر ہی گزارنا تھا۔

رات کو آٹھ بجے کے قریب ہی دو ڈنکر آ گئے اور وہ ہمیں جنگل میں مزید آگے کی طرف لے جانے لگے۔دن والے ہینڈ پمپ کے پاس سے ہم گزرے تو انہوں نے ہمیں دوبارہ پانی بھرنے کا کہا۔ہم لڑکوں نے تازہ پانی ادھر سے بھر لیا اور ہمارا سفر جاری رہا۔چھوٹی سے پگڈنڈی پر ہمارا یہ سفر صرف ایک گھنٹے کا ہی تھا۔اس کے بعد ایک چھوٹی سی سڑک کے کنارے پر ایک ڈالا لگا ہوا تھا۔انہوں نے ہمیں ڈالے میں بٹھایا اور ڈالا ہمیں چھوٹی چھوٹی سڑکوں پر لے جاتے ہوئے قم پہنچ گیا۔

یہ ایران کا آٹھواں بڑا شہر ہے اور مرکزی دارالحکومت تہران سے صرف ایک سو پچیس کلومیٹر دور ہے۔مذہبی، سائنسی اور کتابی شہر۔اس کی آبادی بارہ لاکھ کے قریب ہے اور یہ دریائے قم کے کنارے پر واقع ہے۔قم شہر ہمارے اہل تشیع بھائیوں کے لئے انتہائی مذہبی اہمیت کا حامل ہے۔

ڈالے نے ہمیں صرف تین گھنٹے میں ہی قم پہنچا دیا تھا۔یہاں پر ہمیں ایک چھوٹے سے گھر میں جگہ ملی۔یہ شہر کی بیرونی طرف ایک کالونی میں واقع تھا۔ہاؤس انچارج بھی اچھا تھا اور اس نے آتے ہی ہم لڑکوں کو گرم گرم قہوہ بنا کر دیا اور ساتھ میں چینی کی چھوٹی چھوٹی ڈلیاں تھیں۔یہ ڈلیاں ہم لڑکوں نے پہلی بار دیکھی تھیں اور اسے ایرانی سویٹ سمجھ کر پھیکے قہوے کے ساتھ کھاتے رہے اور عجیب سے ذائقے سے روشناس ہوتے رہے۔

آخر ہاؤس انچارج کو سمجھ آ گئی کہ ہم ان ڈلیوں کو قہوے میں ڈالنے کی بجائے سوکھا کیوں کھا رہے ہیں۔ہاؤس

انچارج ایرانی تھا۔اس کے گھر میں ہم پہلے پاکستانی لڑکے آئے تھےاور وہ ایرانی پاکستان سے بہت محبت کرتا تھا۔ بلکہ اس زمانے میں پورا ایران ہی پاکستان سے محبت کرتا تھا۔ یہ لوگ پاکستان کا نام سنتے ہی عقیدت سے جھک جھک کر ملتے تھے۔ پولیس اور دوسرے سیکورٹی ادارے صرف غیر قانونی انسانی سمگلنگ کی وجہ سے سختی کرتے تھے کیونکہ اس انسانی سمگلنگ کی آڑ میں منشیات وغیرہ کی سمگلنگ ہوتی تھی اور بہت سے لڑکے مارے بھی جاتے تھے۔ باقی پورا ایران ہی پاکستان اور پاکستان کے ایک ایک فرد سے محبت کرتا تھا۔

ہاؤس انچارج پہلے یہی سمجھا کہ شاید ہم قہوے کے ساتھ چینی کھاتے ہیں لیکن پھر اسے سمجھ آ گئی کہ ہم اس چینی کو کوئی مٹھائی سمجھ رہے ہیں۔اس نے ایک ڈلی کو کپ کے اندر ڈالا اور اسے ایک چمچ کے ساتھ ہلایا اور پھر لڑکے کو پینے کے لئے دی تو تب ہمیں پتہ چلا کہ یہ چینی ہے۔

ایران ترکی اور اس کے بعد پورے یورپ میں ایسی ہی باریک چینی یا چینی کی ڈلیاں ہی استعمال ہوتی ہیں۔ ان دو ملکوں میں گیس کے پریشر سے موٹی چینی نہیں بنائی جاتی۔ جو پاکستان میں گنے کے رس سے بنتی ہے اور بہت موٹے دانے کی ہوتی ہے۔ یہ چینی بہت زیادہ میٹھی بنتی ہے لیکن یہاں پر استعمال ہونے والی باریک چینی زیادہ میٹھی نہیں ہوتی اور اس کے استعمال سے شوگر کا خطرہ بھی کم ہو جاتا ہے۔

ہم لڑکے تھوڑا شرمندہ ہوئے اور چینی کی ڈلیوں کو کپ میں ڈال کر ہلانے لگے۔اندر تین کمرے تھے اور تینوں کمروں میں قالین بچھے ہوئے تھے۔ وہ اڑتالیس لڑکوں کے لئے جگہ کم تھی لیکن پھر بھی اتنی ضرور تھی کہ ہم لڑکے لیٹ سکتے تھے اور اگر آپ کو کمرے میں لیٹنے کی جگہ مل جائے تو اس سے بڑی عیاشی اور کیا ہو سکتی ہے؟ روٹی ہم جنگل میں کھا کر آئے تھے۔ یہاں پر ہم کو دوسرے دن بارہ بجے کے قریب کھانا ملا۔ ٹماٹروں والے موٹے چاول بنے ہوئے تھے۔اس کے ساتھ ہاؤس انچارج پنیر بھی لے کر آیا تھا۔

پنیر میرے خیال میں پاکستان کے دیہی علاقوں کے علاوہ پوری دنیا میں شوق سے کھایا جاتا ہے۔ زیتون اور پنیر دونوں پہلی بار کھانے میں کڑوے لگتے ہیں اور لڑکے کھانا چھوڑ دیتے ہیں۔ کافی کی بھی یہی حالت ہوتی ہے۔ کافی بھی پہلی بار کڑوی لگتی ہے۔ یہاں پر بھی لڑکوں نے صرف ایک ایک ڈلی پنیر کی کھائی اور دوسرے کھانے کی کسی کو بھی ہمت نہ ہوئی۔ اڑتالیس لڑکوں کے لئے وہ کوئی دو کلو کے قریب پنیر لایا تھا لیکن لڑکوں نے آدھا کلو بھی نہیں کھایا تھا۔ چاول موٹے تھے لیکن بہت اچھے اور مزیدار بنے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ہاؤس انچارج کولا اور فانٹا کی

بوتلیں بھی لے کر آیا ہوا تھا۔

ایران پر معاشی پابندیوں کی وجہ سے آپ کو کوکا کولا یا پیپسی کے برانڈ نہیں ملیں گے۔ بلکہ یہاں کے لوکل برانڈ ہوتے ہیں۔ یہی حالت سگریٹ اور دوسری انٹرنیشنل چیزوں کی بھی ہے۔ کولا اور فانٹا دونوں بہت اچھی تھیں۔ انٹرنیشنل برانڈ کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ دو دو لیٹر کی دس بارہ بوتلیں تھیں اور ہم چار چار لڑکوں کے حصے میں ایک ایک بوتل آئی تھی۔ ایک فانٹا کا گلاس اور ایک کولا کا گلاس۔ ہم کافی عرصے بعد عیاشی کر رہے تھے۔ ہم لڑکے سارے دکھ بھلا کر کھانا کھانے لگے۔

یہاں سے تہران شہر ایک سو پچیس کلومیٹر دور تھا۔ زیادہ سختی نہیں تھی کیونکہ دارالحکومت تھا اور یہاں روزانہ ہزاروں کی تعداد میں گاڑیاں داخل ہوتی تھیں۔ ہر پانچ منٹ بعد تو بس شہر میں داخل ہوتی تھی یا باہر نکلتی تھی۔ پولیس والے ان ساری گاڑیوں کی تلاشی نہیں لے سکتے تھے۔ رات کو گاڑیوں کی تعداد کم ہو جاتی تھی اور پولیس کی سختی بھی ہو جاتی تھی۔ اس لئے یہاں پر ڈنکی دن کو ہی نکالتے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد سب سے پہلے ایک کار آئی۔ ڈرائیور نے چھ لڑکوں کو گاڑی میں بٹھایا اور چلا گیا۔ دو ڈگی میں تین پیچھے اور ایک آگے فرنٹ پر۔ یہاں زیادہ لڑکے نہیں بٹھاتے تھے۔ لڑکوں کا اچھی طرح منہ دھلا کر کار میں بٹھایا جاتا تاکہ اگر پولیس والی گاڑی کراس بھی کرے تو ان کو شک نہ ہو۔ ہم پاکستانی لڑکوں کے رنگ ایرانیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ ایران سے آگے ترکی اور اس کے بعد پورے یورپ میں سفید رنگ ہے اور ہم گندمی رنگ والے دور سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ یورپی اور ایشیائی رنگ میں بہت فرق ہے۔ اس کے بعد آدھے گھنٹے بعد کوئی کار آتی اور لڑکوں کو بٹھا کر لے جاتی۔ یہ سلسلہ شام تک جاری رہا۔ سب سے آخر میں ادھر میری باری آئی۔

''طافو کا لڑکا کون ہے؟'' ہاؤس انچارج نے اندر آ کر آواز لگائی۔ ادھر اب صرف چھ لڑکے ہی رہ گئے تھے۔

''جی! میں طافو کا لڑکا ہوں۔'' میرے ایجنٹ کا نام طافو تھا۔ وہی بلوچی جس نے ایران بارڈر پر مجھے دو سو ڈالر دیئے تھے۔ پاکستان سے لے کر تہران تک اسی بلوچی کی مہربانی سے میں آیا تھا۔

''آپ صرف تہران تک ہی جاؤ گے؟'' میں نے سر ہلا دیا تو وہ مجھ سے تہران کا پتہ پوچھنے لگا جس کے پاس میں نے جانا تھا۔

میرا تو یہاں پر کوئی بھی نہیں تھا اور مجھے تو تہران میں ہی کہیں کام وغیرہ تلاش کرنا تھا تا کہ آگے ترکی کیلئے پیسے جمع کر سکوں۔ میرے کپڑوں میں صرف ساٹھ ڈالر ہی سلے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

ماکو یا سلماس سے ایجنٹ کم از کم بھی بارہ سو ڈالر لیتے تھے اور یہ بہت بڑی رقم تھی۔ پاکستانی روپوں میں قریباً ستر ہزار روپے بنتے تھے۔ مجھے یہ پیسے کمانے کے لئے چھ سات مہینے چاہیے تھے۔ میرے ہاتھ میں کوئی ہنر بھی نہیں تھا۔ صرف کھیتی باڑی اور سبزیوں کا کام ہی جانتا تھا۔ فارسی زبان بھی بالکل نہیں آتی تھی۔

''تہران میں کس کے پاس آپ کو جانا ہے؟'' ہاؤس انچارج مجھ سے دوبارہ پوچھنے لگا۔

''تہران میں میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ ایران میں صرف کام تلاش کرنے کے لئے آیا ہوں۔ آپ تہران میں کہیں بھی چھوڑ دیں میں اپنا کوئی آسرا ڈھونڈ لوں گا۔'' میرا جواب سن کر اس نے کچھ سوچا اور پھر ڈرائیور سے کچھ کہنے لگا۔ صرف ایک منٹ تک ہی ڈرائیور سے بات ہوتی رہی۔ اس کے بعد وہ میری طرف آ گیا۔

''بھائی! میں نے ڈرائیور کو بول دیا ہے کہ تم کو سبزی منڈی اتار دے۔ تم رات کو وہیں کہیں سونے کیلئے جگہ تلاش کر لینا! صبح چار بجے کے قریب گاڑیاں آنا شروع ہو جاتی ہیں جو مختلف دیہاتوں سے سبزیاں لے کر آتی ہیں۔ سبزیاں اتارنے کے زیادہ پیسے تو نہیں ملتے مگر پھر بھی وقتی طور پر تمہارا کچھ آسرا بن جائے گا۔ سبزی اتارنے کا کام صبح چار بجے سے شروع ہوتا ہے اور بارہ بجے تک ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد تم شہر میں کام تلاش کر سکتے ہو۔ شہر میں اتنی سختی نہیں ہے اور پولیس والے بھی تنگ نہیں کرتے۔ اگر پکڑے بھی گئے تو وہ ایک دن تھانے میں رکھتے ہیں اور پھر پرمٹ بنا کر دے دیتے ہیں۔ پرمٹ ملنے کے بعد تم آسانی سے ادھر کام کر سکتے ہو۔'' ہاؤس انچارج نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

میں ڈرائیور کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔ گاڑی سٹارٹ ہوئی اور مین روڈ پر چلتی ہوئی صرف دو گھنٹے میں ہی تہران پہنچ گئی۔ سبزی منڈی اس وقت شہر کے قریباً بیچوں بیچ ہی تھی۔ تہران میں اسٹیشن بھی ادھر سے نزدیک ہی پڑتا تھا۔ میں سبزی منڈی سے پیدل چالیس منٹ میں ادھر پہنچ سکتا تھا۔ ڈرائیور نے مجھے سبزی منڈی اتارا اور خود کار لے کر آگے بڑھ گیا۔

میرا ایجنٹوں سے رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ یہاں سے اب آگے میں نے خود ہی جانا تھا۔ تہران بہت بڑا شہر تھا اور

یہاں پر کام کے مواقع بھی زیادہ تھے۔ایران کی آبادی پاکستان کے مقابلے میں آدھی ہے اور رقبے کے لحاظ سے یہ پاکستان سے دوگنا بڑا ہے اور تیل کی دولت سے مالا مال ہے۔

اقوام متحدہ کی لگائی ہوئی معاشی پابندیوں نے اس ملک کا کچھ بھی نہیں بگاڑا تھا۔اس دور میں ایران میں کام کی بجائے مزدور مشکل سے ملتے تھے۔افغانستان، ترکمانستان اور پاکستانی صوبے بلوچستان کے لوگ یہاں مزدوری کرنے کے لئے آتے تھے۔ایرانی گورنمنٹ ان مزدوروں کو پرمٹ جاری کردیتی تھی اور وہ لوگ یہاں مزدوری کرتے رہتے تھے۔

رات کے سات بجے تھے لیکن سبزی منڈی بند ہو چکی تھی۔رات کا اندھیرا چھا گیا۔مجھے یہاں کی زبان بھی نہیں آتی تھی اور میرے پاس کسی بھی قسم کا کوئی ویزہ یا پرمٹ وغیرہ بھی نہیں تھا۔آج پہلا دن تھا اور میں دل میں ڈر رہا تھا۔میں اس شہر میں صرف ایک یا دو دن ہی رہنا چاہتا تھا۔مجھے آگے تبریز تک جانا تھا۔تبریز تہران سے قریباً پانچ سو کلومیٹر آگے تھا۔یہ ایران کا آخری بڑا شہر ہے۔تہران ایران کا دارالحکومت اور سب سے بڑا شہر تھا لیکن ایجنٹ تبریز شہر میں تھے۔تہران میں صرف ایک رات ہی لڑکوں کو رکھا جاتا تھا اس کے بعد وہ سارے لڑکے تبریز چلے جاتے تھے۔

تبریز شہر ایجنٹوں کا گڑھ تھا۔اس ایک شہر میں کوئی تیس چالیس کے قریب سیف ہاؤس ہوں گے اور ایجنٹوں کی تعداد تو بہت زیادہ تھی۔پورے ایران کی ڈنکیوں کو تبریز شہر سے ہی کنٹرول کیا جاتا تھا۔مجھے تبریز جانا تھا کیونکہ آگے کے لئے مجھے تبریز سے ہی کوئی مل جاتا۔یہاں تہران میں اگر میں دو تین دن کام کرتا تو تبریز جانے کے لئے کرایہ بن جاتا اور میں آسانی سے تبریز کے لئے بس پکڑ سکتا تھا۔تہران سے آگے ایک لڑکے کا سفر کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔پولیس والے ہر بس کو روک کر تلاشی نہیں لے سکتے تھے اور ویسے بھی ایجنٹ لڑکوں کو پرائیویٹ گاڑیوں میں سفر کرواتے تھے، پبلک ٹرانسپورٹ میں نہیں۔

مجھے رات گزارنے کے لئے کسی محفوظ کونے کی تلاش تھی۔ابھی تو لوگوں کی ہلکی پھلکی آمدورفت جاری تھی لیکن مزید دو تین گھنٹوں کے بعد مکمل خاموشی ہو جاتی اور اس کے بعد میرا باہر گھومنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔پولیس والے ایسے آوارہ گھومتے ہوئے دیکھ لیتے تو روک سکتے تھے اس لئے مجھے جلدی سے جلدی کوئی محفوظ جگہ دیکھنی تھی تاکہ میں رات گزار سکوں اور صبح چار بجے سبزی منڈی میں کام تلاش کرسکوں۔میں سبزی منڈی میں دائیں سے

بائیں گھومنے لگا۔ دوکانوں کے آگے تھڑے بنے ہوئے تھے لیکن وہ بالکل سامنے تھے۔ ہر آنے جانے والے کی یہاں پر نظر پڑھتی تھی اور پاکستان جیسے حالات نہیں تھے جہاں کسی بھی دوکان کے آگے آپ سو سکتے ہو۔ یہاں پر اگر کسی دکان کے تھڑے پر سورہے ہوں تو پولیس پکڑ لیتی ہے۔ مجھے کوئی بھی کونہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں یہاں سے مایوس ہو گیا۔ مجھے باہر ہی کوئی اور جگہ تلاش کرنی ہوگی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا اور باہر کی طرف جانے لگا۔

سبزی منڈی کی بیرونی دیوار کے اندر کی طرف ایک بہت بڑا کوڑا دان رکھا ہوا تھا۔ میری اس پر نظر پڑ گئی۔ یہ بہت بڑا کوڑا دان تھا۔ جسے چھوٹی کرین کی مدد سے اٹھایا جاتا تھا۔ جو بھی سبزی گل سڑ جاتی تھی اسے اس کوڑے دان میں ڈال دیا جاتا۔ روزانہ شام کو بلدیہ کی گاڑی آتی اور وہ بھرے ہوئے کوڑے دان کو لے جاتی اور خالی رکھ جاتی۔ یہ بھی خالی کوڑا دان تھا لیکن اندر سے گیلا تھا۔

بلدیہ والے کوڑے دان کو خالی کرتے تھے لیکن پھر گلی ہوئی سبزی پیندے میں چپکی رہتی تھیں جو بعد میں بدبو کا باعث بنتی تھیں۔ وہ خالی کرنے کے بعد پائپ کے پریشر سے پانی مارتے تھے اور تھوڑا پانی اندر بھی رہنے دیتے تھے تاکہ دوسرے دن سبزی پیندے کے ساتھ چپکے نا۔ پتہ نہیں اس پانی رکھنے کا واقعی کوئی فائدہ ہوتا تھا یا نہیں لیکن اس وقت میرا نقصان ہوا تھا۔ اگر اندر پانی نہ ہوتا تو میں آسانی سے اندر لیٹ سکتا تھا لیکن پانی کی وجہ سے میں اندر لیٹ نہیں سکتا تھا۔

کوڑے دان کو دیوار سے تھوڑا ہٹا کر رکھا گیا تھا۔ شاید کوئی اناڑی ڈرائیور تھا۔ اتنا بھاری کوڑے دان اگر دیوار سے ٹکرا جائے تو دیوار آسانی سے گر سکتی تھی یا اس کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اس لئے ڈرائیور کوڑے دان کو بالکل دیوار سے ملا کر نہیں رکھتے تھے بلکہ کچھ فاصلے پر رکھتے تھے۔ اس دن یہ فاصلہ ایک فٹ سے تھوڑا زیادہ تھا۔ یہ صرف اوپر سے ایک فٹ تک تھا۔ نیچے جا کر یہ فاصلہ دو فٹ ہو گیا تھا کیونکہ کوڑے دان نیچے سے چھوٹا اور اس کا منہ کھلا تھا تاکہ کوڑا پھینکنے میں آسانی ہو۔

مجھے رات گزارنے کے لئے جگہ مل گئی تھی۔ میں زمین پر بیٹھتا اور رینگتا ہوا اندر چلا گیا۔ پکا فرش تھا اور بہت زیادہ ٹھنڈا تھا۔ میں نے ٹانگیں سیدھی کیں اور ننگے فرش پر سیدھا لیٹ گیا۔ سردی کی ایک تیز لہر نے مجھے اپنے وجود کا احساس دلایا تو بے اختیار میرے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ میں آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ بے شمار ستارے جگمگا رہے تھے۔ میری ہنسی مزید گہری ہوئی اور میں بڑی دیر تک مسکراتا رہا۔

''واہ رے میرے مالک! تیری آزمائشیں بھی کبھی کبھی مسکرانے پر مجبور کر دیتی ہیں۔'' صرف ایک دن پہلے ہی میں آئل ٹینکر میں گرمی سے مر رہا تھا۔ اس ٹینکر میں صرف ایک دن پہلے دولڑکے گرمی سے مر گئے تھے اور آج سردی لگ رہی تھی۔

''واہ رے میرے مالک۔ محبت کرنے کی اور کتنی سزا دے گا؟ کبھی گرمی سے مارتے ہو کبھی سردی سے۔۔۔'' میں نے کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کر لیں۔

اگلے ایک گھنٹے تک میں مسلسل سردی سے لڑتا رہا۔ آہستہ آہستہ میرے جسم نے سردی قبول کرنا شروع کر دی اور مزید ایک گھنٹے کے بعد میں آرام سے اس ننگے فرش پر سو رہا تھا۔ مجھے ایک بار نیند آ گئی تو اس کے بعد میں صبح چار بجے تک آرام سے سوتا رہا۔ صبح منڈی میں گاڑیاں آنا شروع ہوئیں تو ان کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور میں جلدی سے رینگتا ہوا ادھر سے باہر آ گیا۔

ابھی صرف دوکان داروں کی گاڑیاں ہی تھیں۔ میں چلتا ہوا ایک بند دکان کے چبوترے پر جا کر بیٹھ گیا۔ دس منٹ تک اس دوکان کا مالک بھی آ گیا تو میں اٹھ کھڑا ہوا اور اسے ہاتھ سے سلام کرنے لگا۔ اس نے میرے سلام کا جواب دیا اور فارسی میں مجھ سے کچھ پوچھنے لگا۔ مجھے فارسی نہیں آتی تھی اس لئے میں ہاتھ سے اپنی زبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ناں کہا۔

''کارضرورت، کارضرورت۔'' میں اس دوکان دار سے فارسی میں کام مانگنے لگا۔ میں نے کچھ فارسی الفاظ راستے میں سیکھ رکھے تھے۔

پچاس پچپن سال کا وہ دوکاندار کچھ پل کے لئے مجھے دیکھتا رہا اس کے بعد اس نے نفی میں سر ہلا دیا اور مجھے ایک انگلی کھڑی کر کے ایک گھنٹے کا اشارہ کیا۔ مجھے سمجھ نہ آئی تو اس نے میرا بازو پکڑا اور میرے بازو پر گھڑی سے پانچ بجے کا ٹائم بنایا اور اس وقت آنے کو کہا۔ میں سمجھ گیا۔ میں نے ہاں میں سر ہلایا اور شکراً شکراً بولنے لگا۔

''افغانستان؟ پاکستان؟'' وہ میرے سینے کی طرف اشارہ کر کے پوچھنے لگا۔

''پاکستان، آئی ایم فرام پاکستان۔'' میں نے سرکوخم دیتے ہوئے کہا تو وہ خوش ہو گیا۔ اس نے ہاتھ سے پانچ کا اشارہ کرتے ہوئے مجھے آنے کا اشارہ کیا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور دوسری دوکانوں کی طرف بڑھ گیا۔

مجھے پہلا کام دس منٹ بعد ہی مل گیا۔ یہ ٹماٹروں کے پچاس کے قریب کریٹ تھے۔ ڈرائیور بوڑھا آدمی تھا۔ وہ اکیلا پچاس کریٹ نہیں اتار سکتا تھا۔ اس لئے اس نے مجھے بلا لیا۔ یہ ٹوٹل پندرہ منٹ کا کام تھا۔ کریٹوں کو گاڑی سے اتارنا تھا اور پھر دوکان کے اندر رکھ دینا تھا۔ اس نے ہاتھ سے پیسوں کا پوچھا لیکن مجھے کونسا زبان آتی تھی جو میں اس سے بارگیننگ کرتا۔ اس نے دس دس ہزار کے دو نوٹ میرے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

بیس ہزار ایرانی تمن میری ایران میں پہلی کمائی تھی۔ یہ پاکستانی روپے میں قریباً پندرہ روپے بنتی تھی۔ بہت تھی۔۔۔ کام ملنا شروع ہو گیا تھا۔ میں ہر آنے والی گاڑی کے پاس بھاگ کر چلا جاتا اور'' کار ضرورت، کار ضرورت'' بولنے لگتا۔ لیکن زیادہ تر گاڑیاں چھوٹی تھیں اور ڈرائیور کے ساتھ کوئی ہیلپر وغیرہ بھی ہوتا تھا۔ دو آدمی آرام سے گاڑی سے سبزیاں اتار لیتے تھے۔ باقی بڑی گاڑیوں والوں کے پاس پکے لڑکے ہوتے تھے۔ یہاں پر اب میں اکیلا مزدور نہیں تھا بلکہ مزید دس بارہ اور لڑکے بھی آ گئے تھے۔ یہ سارے کے سارے افغانی لڑکے تھے۔ مزید آدھے گھنٹے تک میں کام تلاش کرتا رہا لیکن مجھے کام نہیں ملا۔

پانچ بجنے والے تھے۔ میں واپس اسی دوکان دار کے پاس آ گیا جس نے مجھے پانچ بجے آنے کا کہا تھا۔ دوکان دار مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اس نے مجھے دوکان کے باہر رکھے ہوئے ایک سٹول پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اسی سٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اشارے سے منع کیا اور وہیں تھڑے پر دوکان کی دیوار سے ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ دوکان دار مجھے منع کرتا رہا لیکن میں پرسکون تھا اس لئے خاموشی سے بیٹھا رہا۔

تھوڑی دیر بعد اس دوکان دار کے لئے بھی سبزی والی گاڑی آ گئی۔ یہ کالی توریوں کے کریٹ تھے۔ اس کے علاوہ پالک کے بھی کریٹ تھے۔ پالک ایران میں تقریباً آٹھ مہینے تک ہوتی ہے۔ صرف چار مہینے جب بہت زیادہ گرمی ہوتی ہے تب نہیں ہوتی کیونکہ گرمی سے پالک کے پتے پیلے ہو جاتے ہیں۔ باقی سارا سال چلتی رہتی ہے۔ یہ صرف برائلر چوزوں کی طرح پینتالیس دن میں پک کر تیار ہو جاتی ہے اور اسے اوپر سے کاٹنے کی بجائے زمین کے اندر سے جڑوں سمیت نکالا جاتا ہے۔ کسان جب ایک کھیت سے نکال لیتے ہیں اور دوسرے کھیت سے پالک توڑنا شروع کرتے ہیں تو پہلا کھیت پھر بیج دیتے ہیں۔ یورپ میں تو یہی پالک دس دس مہینوں تک بیجی اور نکالی جاتی ہے کیونکہ وہاں پر گرمی نہیں ہوتی اور اسے بہت شوق سے کھایا جاتا ہے۔

میں پالک اور توری کے کریٹ گاڑی سے نکال نکال کر دوکان کے اندر لگانے لگا۔ یہ بہت بڑا ٹرک تھا اور مجھے

خالی کرنے میں دو گھنٹے لگ گئے۔ دوکان دار مجھے سانس لینے کا بولتا رہا لیکن میں مسلسل کام میں لگا رہا۔ جب آخری کریٹ بھی میں نے گاڑی سے اتار دیا تو میں دوکان کے سامنے کھڑا ہو کر شرٹ کی آستین سے پسینہ صاف کرنے لگا۔

''آب آب'' دوکان دار نے مجھے پانی کی چھوٹی بوتل پکڑاتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کے ہاتھ سے پانی کی بوتل پکڑی اور زمین پر بیٹھ کر پینے لگا۔ اس نے اشارے سے مجھے پیسوں کا پوچھا کہ کتنے پیسے چاہئیں؟ تو میں نے بھی اسے اشارے سے بتایا کہ آپ جتنے مرضی دے دو۔ وہ مسکرانے لگا اور اندر سے دو لاکھ تمن لا کر مجھے دے دیئے۔ میں نے اتنے پیسوں کو گنے بغیر ہی جیب میں ڈال لیا۔

''شکراً شکراً'' میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دوسری کونے والی گاڑیوں کے پیچھے جانے لگا۔

دن کو بارہ بجے تک مجھے مزید دو چھوٹے چھوٹے کام ملے۔ یہ چھوٹے چھوٹے کام تھے اور مجھے ان سے ٹوٹل پینتالیس ہزار تمن مزید مل گئے۔ اب میرے پاس سب ملا کر دو لاکھ پینسٹھ ہزار تمن آ گئے تھے۔ پاکستانی ایک سو اسی روپے۔۔۔ یہ اس پہلے فارسی دوکاندار کی مہربانی تھی۔ جس نے صرف دو گھنٹے کام کے دو لاکھ تمن دے دیئے۔ مجھے دس لاکھ تمن اکٹھے کرنے تھے تاکہ میں آسانی سے تبریز جا سکوں۔ میں تبریز میں ہی جا کر کام کرنا چاہتا تھا۔ وہاں پر مجھے ترکی جانے والے ایجنٹ آسانی سے مل سکتے تھے۔ مزید تین چار دن میں تبریز جانے کا کرایہ بن جاتا۔ تبریز میں کام کرتا اور چھ سات مہینوں تک میں اتنے پیسے ضرور کمانے میں کامیاب ہو جاتا جو میں کسی ایجنٹ کو دے کر ترکی جا سکتا۔

میرا اب یہاں پر کام ختم ہو گیا تھا۔ اب مجھے باقی دن کہیں چھپ کر گزارنا تھا۔ رات کو تو پھر میں ادھر ہی رک جاتا مگر ابھی دن کے لئے مجھے جگہ چاہیے تھی۔ میں یہاں تہران میں پولیس کے ہاتھ نہیں آنا چاہتا تھا کیونکہ تہران میں پکڑے جانے کی صورت میں مجھے تہران میں کام کرنے کا پرمٹ ملتا جبکہ مجھے تبریز میں کام کرنا تھا۔ اس دور میں ایران میں فنگر پرنٹ کا رواج عام نہیں ہوا تھا لیکن تصویر ضرور کھینچی جاتی تھی جو کہ تھانے کے ریکارڈ میں ہوتی تھی۔

اگر میں تہران اور تبریز دونوں جگہ پکڑا جاتا اور پہچان لیا جاتا تو پھر میرا پرمٹ منسوخ ہو جاتا اور مجھے سزا ہو جاتی یا پھر ڈی پورٹ کر دیا جاتا۔ بس اسی چیز سے بچنا چاہتا تھا لیکن مجھے چھپنے کے لئے جگہ تو تلاش کرنی تھی۔ میں

سبزی منڈی سے باہر آ گیا اور اس کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ مجھے سبزی منڈی کی دوسری طرف گلی میں ایک درخت نظر آ گیا۔ یہ زیتون کا درخت تھا اور اس کی شاخیں سبزی منڈی کی ایک اکیلی دوکان کی چھت تک جاتی تھیں۔

میں چھلانگ لگا کر درخت پر چڑھ گیا۔ زیتون کا درخت بہت گھنا درخت ہوتا ہے۔ اس کی گھنی شاخیں دوکان کی چھت پر بھی تھیں۔ گھروں کی چھتوں وغیرہ پر تو لڑکے یا گھر والے چڑھتے اترتے رہتے ہیں لیکن دوکان چونکہ سنگل مرلہ کی ہوتی ہے اور یہاں کوئی رہائش بھی نہیں ہوتی اس لئے دوکانوں کی چھتیں کسی کام نہیں آتی ہیں۔ لیکن آج پہلی چھت میرے کام آ رہی تھی۔ اگر میں چھت پر پلین لیٹتا تو دوسرے گھروں کی چھتوں سے مجھ پر نظر پڑ سکتی تھی اور اس طرح میں پکڑا جاتا۔ اس لئے میں چھت پر درخت کی شاخوں کے نیچے لیٹ گیا۔ یہ بہت زبردست جگہ مل گئی تھی۔

چھت زمین کے مقابلے میں اتنی ٹھنڈی بھی نہیں تھی اور درخت کی ٹہنیاں اور پتے مجھے ٹھنڈی ہوا اور سردی سے بھی کسی حد تک بچا سکتے تھے۔ ابھی صرف بارہ ہی بجے تھے اس لئے نیند تو مجھے نہیں آ رہی تھی لیکن یہاں پر اور کچھ میں کر بھی نہیں سکتا تھا، سوائے ماضی اور ایمان کو یاد کرنے کے۔ ایمان کی یاد تو ہمیشہ ہی مجھے نئی زندگی اور تازگی دیتی تھی لیکن پتہ نہیں کیوں ماضی کی کچھ یادیں مجھے تڑپا کر رکھ دیتیں تھیں۔ میرا بہت پیارا سا خوبصورت سا گھر تھا۔ مجھ سے پیار کرنے والی ماں اور بہن بھائی تھے اور باپ بھی تھا۔ پیار تو وہ بھی مجھ سے بہت کرتا تھا لیکن میری نفرت اس کی محبت سے زیادہ تھی۔

میں ایمان کے شوہر اسلم سے بھی نفرت کرتا تھا اور اپنے باپ سے بھی نفرت کرتا تھا۔ نفرت تو سب سے تھی اپنے گاؤں کے نمبردار سے، ایمان کے باپ سے اور سرپنچ سے۔۔۔ لیکن محبت صرف ایمان سے تھی۔ میرے والد کہا کرتے تھے کہ ”بیٹا محبت تو جینا سکھاتی ہے۔ محبت کرنے والا انسان تو کسی سے نفرت کر ہی نہیں سکتا۔ تو کیسا محبت کرنے والا ہے جو اپنے گھر کو ہی نفرت کی آگ سے جلا جلا کر ختم کر رہا ہے؟“

یہ کیسی محبت ہے جس کی جلن میرا پورا گھرانہ اپنے دلوں میں محسوس کرتا ہے؟ پتہ نہیں یہ کیسی محبت تھی لیکن محبت تھی، عشق تھا اور میں نے اس عشق میں اپنے پورے گھر کو فنا کر دیا تھا۔ کل بارہ بجے کے قریب قم میں ایرانی ہاؤس انچارج کے گھر سے میں نے کھانا کھایا تھا اور اب کھانا کھائے ہوئے قریباً چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ بہت چھوٹے

چھوٹے کچے زیتون لگے ہوئے تھے اور میرے چہرے کے گرد لہرا رہے تھے۔ بھوک لگی ہوئی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ایک زیتون کا دانہ توڑا اور اسے منہ میں ڈال کر دانتوں سے توڑنے لگا۔ زیتون کا تھوڑا ہی رس میرے حلق میں گیا تو اسکی کڑواہٹ کا پتہ چلا۔

میرے خیال سے پاکستان میں نیم ہی سب سے زیادہ کڑوی ہوتی ہے لیکن یہ زیتون اس سے بھی کڑوا تھا۔ صرف ایک دانے نے میرے چودہ طبق روشن کر دیئے تھے اور میں اسے تھوکنے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے اس دانے کو تو باہر پھینک دیا لیکن اس کی کڑواہٹ سے بچنے کے لئے بار بار تھوکتا رہا۔ کڑواہٹ ختم ہوئی تو پیاس لگنا شروع ہو گئی۔ حلق خشک ہو گیا تھا لیکن میں نیچے اترنے اور پانی لانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا اس لئے میں ایسے ہی لیٹا رہا۔

دو تین گھنٹے تک پیاس مجھے تنگ کرتی رہی لیکن اس کے بعد شاید مجھے کچھ عقل آ گئی۔ جو مرضی ہو میں نے پانی پینے کے لئے نہیں اٹھنا ہے۔ میری پیاس بھی ختم ہو گئی اور بھوک تو ویسے ہی کڑواہٹ کی وجہ سے ختم ہو گئی تھی۔ میں رات کا اندھیرا چھانے تک ایسے ہی بیٹھا سوچتا رہا۔ ایمان اور ایمان کی یادوں کو سہارا بنا کر ٹائم گزارتا رہا۔ اس کے بعد مجھے نیند آ گئی اور میں درخت کی شاخوں کو سینے سے لگائے سوتا رہا۔

میری آنکھ رات کو بادل کے گرجنے کی آواز سے کھل گئی۔ بارش شروع ہو گئی تھی۔ درخت کی شاخیں کچھ دیر تک تو پانی کا مقابلہ کرتی رہیں مگر پھر پانی نیچے ٹپکنے لگا اور مجھے بھگونے لگا۔ میں درخت کی شاخوں سے باہر نکل کر چھت کے درمیان میں آ گیا اور دائیں بائیں کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگا۔

مجھے روڈ پر اور گلی میں کچھ جگہیں تو نظر آئیں جہاں میں بارش سے بچ کر کھڑا ہو سکتا تھا لیکن میں وہاں کھڑا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ادھر خطرہ تھا۔ اس بارش میں کوئی بھی مجھے یوں بارش میں کھڑا دیکھتا تو میری خیریت ضرور پوچھتا اور زبان کے نہ آنے کی وجہ سے اسے مجھ پر شک ہو جاتا اور بالآخر وہ پولیس کو فون کر سکتا تھا۔ اس لئے میں وہاں جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ مجھے کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش تھی۔

میرے کپڑے مسلسل بھیگ رہے تھے اور میرے پاس ٹائم نہیں تھا۔ اگر ایک بار کپڑے بھیگ جاتے تو پھر اس کے بعد میرے پاس اور کوئی کپڑے بھی نہیں تھے۔ بیگ میرا آئل ٹینکر میں ہی رہ گیا تھا۔ مجھے درخت کی شاخوں میں ایک لفافہ نظر آیا میں نے اپنے سارے کپڑے اتار کر اس میں ڈال دیئے۔ میں نے ٹراؤزر پینٹ اور تین تین شرٹیں پہنی ہوئی تھیں۔ میں نے سب اتاریں اور ایک شرٹ کو انڈر ویئر ٹائپ بنا کر پہن لیا اور باقی سارے کپڑے

لفافے میں ڈال کر اسے گانٹھ ماردی اور درخت کی ٹہنیوں کے اندر قدرے محفوظ جگہ پر رکھ دیا۔

اب میں ایک شرٹ پہنے بارش میں بھیگ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی سردی آنا شروع ہو گئی تھی اور بارش کے ساتھ مل کر اچھی خاصی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے دانت سردی سے بجنا شروع ہو گئے اور میں سردی سے کانپنا شروع ہو گیا۔ بارش اب پورے زور وشور سے برس رہی تھی اور میں نیچے سردی سے کانپتا ہوا خدا کی خدائی کے انداز دیکھ رہا تھا۔

واقعی خدا کا ہر انداز نرالا ہوتا ہے۔ انسان کی سب تدبیریں اور کام ایک سیکنڈ میں زیر و ہو جاتے ہیں۔ مجھے چھت پر آج یہ بہترین جگہ مل گئی تھی۔ سونے کے لئے بھی اور یہاں سردی بھی کوڑے دان کی نسبت کم تھی۔ میں اس جگہ کو پا کر خوشی میں خدا کو بھول گیا تھا اور اس خدا نے بارش کی صورت میں مجھ پر اپنی خدائی کا اظہار کیا تھا۔ محبت کی آزمائش ابھی بھی جاری تھی۔ بجلی کڑک رہی تھی۔ اس لئے درخت کے نیچے سونا خطرناک تھا۔ میں چھت کے درمیان میں گھٹنوں میں سر چھپا کر بیٹھ گیا اور پوری طاقت سے سر کو گھٹنوں میں دبانے لگا۔ اس سے میرا ذہن سر پر دباؤ کی طرف منتقل ہو گیا اور سردی کا احساس بتدریج کم ہونے لگا۔ بارش مسلسل دو گھنٹے تک برستی رہی اور میں کھلے آسمان کے نیچے بے یار و مددگار سردی میں بھیگتا اور ٹھٹھرتا رہا۔

آخر کار خدا کو میری حالت زار پر ترس آ گیا اور بارش کم ہوتے ہوتے رک گئی۔ جگہ بارش کے پانی سے گیلی ہو گئی تھی اور دوبارہ سونا ناممکن ہو گیا تھا۔ میں نے مزید دس منٹ تک جسم کے سوکھنے کا انتظار کیا اور اس کے بعد دوبارا کپڑے پہن لیے۔ چھت پر کھڑا ہونا اب زیادہ خطرناک ہو گیا تھا۔ کوئی باہر سے دیکھ سکتا تھا۔ میں شاخوں سے ہوتا ہوا درخت پر چڑھ گیا اور درخت کے ایک موٹے تنے پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے پیچھے کی طرف ٹیک لگائی تھی۔ یہاں پر لیٹ تو نہیں سکتا تھا نہ ہی سو سکتا تھا لیکن بیٹھ سکتا تھا۔ اس لئے میں نے بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں لیکن میں پورے ہوش میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہلکی سی اونگھ آنے کی صورت میں نیچے گر سکتا تھا۔

صبح چار بجے تک میں ایسے ہی ادھر بیٹھا رہا اس کے بعد درخت سے نیچے اترا اور سبزی منڈی آ گیا۔ دوکان دار آنا شروع ہو گئے تھے۔ میں کل جن دوکان والوں کے پاس گیا تھا وہاں جا کر ان کو سلام کیا اور منڈی کے مرکزی دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑیاں آنا شروع ہوئیں تو میں بھاگ بھاگ کر ان کے پیچھے جانے لگا۔ گاڑی کھڑی ہوتی تو میں ہر ڈرائیور سے ''کار ضرورت، کار ضرورت'' کہنے لگا۔ کل کی نسبت آج میں نے چھ گاڑیوں سے سبزی اتاری اور ایک لاکھ ستر ہزار تمن اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

2006ء میں ایرانی کرنسی کے معاملے میں ایک صفر کم پڑھتے تھے یعنی وہ دس ہزار کے نوٹ کو ہزار بولتے تھے۔دس روپے کے نوٹ میں ایک کے ساتھ دو صفر ہوتے تھے۔یعنی سو روپے کو دس روپے بولتے تھے۔اب مجھے گیارہ سال ہو گئے ہیں اب کا مجھے کوئی پتہ نہیں ہے۔شاید اب بھی ایسا ہی ہو یا پھر انہوں نے ایک صفر کو مکمل طور پر ختم کر دیا ہو۔میرے پاس ابھی بھی پیسے بہت کم تھے۔مزید دو دن تک اور کام کرتا تو میرے پاس تبریز جانے کے لئے پیسے ہو جانے تھے۔

میں سبزی منڈی سے باہر نکلنے لگا جب پہلے والے دوکان دار نے مجھے روک لیا۔یہ وہی کل والا دوکان دار تھا جس نے مجھے دو لاکھ تمن دیئے تھے۔وہ مجھے بلا کر اپنی دوکان پر لے گیا۔دوکان کے باہر سٹول پر ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور پھر میرا حال چال پوچھنے لگا۔

''نام کیا ہے بھائی صاحب آپ کا؟ اور کدھر سے آئے ہو؟'' وہ اردو میں پوچھ رہا تھا۔دوکان دار پتہ نہیں کہاں سے اسے ترجمان کے طور پر لے آیا تھا۔

''جی میرا نام راضی ہے اور میں پاکستان سے آیا ہوں۔غریب آدمی ہوں کام کی تلاش میں ادھر آیا ہوں۔'' میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

وہ فارسی دوکاندار سے بات کرنے لگا۔دو منٹ تک وہ آپس میں بات کرتے رہے اس کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہو گیا اور مجھ سے پرمٹ کا پوچھنے لگا۔میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔وہ پھر ایک بار فارسی میں گفتگو کرنے لگا۔اب کی بار کوئی پانچ منٹ بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

''بھائی جان! یہ آپ کو کام پر رکھنا چاہتا ہے، ادھر دوکان پر کھڑا ہونا ہوگا۔سامان وغیرہ گاڑیوں سے اتار کر اندر رکھنا، اس کی سبزی تول کر گاہکوں کو دینا، صفائی وغیرہ کرنا۔مہینے دو مہینے تک اس کے ساتھ کام کرو گے تو زبان بھی سیکھ لو گے۔اس کے بعد تم اکیلے ہی دکان سنبھال لو گے۔تنخواہ اچھی ہوگی اور ایک وقت کا کھانا بھی دے گا۔تم اس کو اچھے اور ایماندار لگے ہو۔پرمٹ بھی تھانے سے بنوا کر دے دے گا۔'' اس نوجوان نے مجھے تفصیل سے سمجھاتے ہوئے کہا تو میں افسردہ ہو گیا۔

وہ دوکاندار واقعی بہت اچھا تھا۔بہت مہربان اور نفیس انسان تھا۔مجھے اس کے پاس کام کر کے واقعی بہت خوشی

ہوتی لیکن تبریز میرے لئے زیادہ بہتر تھا۔ میں وہاں کام کرنا چاہتا تھا۔

''سوری بھائی جان! میں یہاں صرف مزید دو دن اور رہوں گا، مجھے آگے تبریز جانا ہے۔ تبریز میں جا کر کام کرنا چاہتا ہوں۔ پرمٹ بھی وہاں کا ہی بنواؤں گا۔ یہ بہت اچھے اور شریف انسان ہیں لیکن میں تہران میں رکنے کے لئے نہیں آیا ہوں۔'' میں نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ وہ دوبارہ فارسی میں گفتگو کرنے لگا۔

''دو دن بعد کیوں جاؤ گے تبریز؟ ابھی کیوں نہیں جاتے؟ کرایہ نہیں ہے تمہارے پاس؟'' وہ مجھ سے پوچھنے لگا۔

''جی! میرے پاس تبریز جانے کے لئے پیسے پورے نہیں ہیں۔ مزید دو دن اور کام کروں گا تو کرایہ بن جائے گا۔'' میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا تو وہ مسکرانے لگا۔ دوکاندار دوکان کے اندر گیا اور وہاں سے کچھ پیسے لا کر مجھے دینے لگا لیکن میں نے انکار کر دیا۔

''بھائی جان! میں غریب ضرور ہوں لیکن مانگنے والا نہیں ہوں۔ اگر مانگنے والا ہوتا تو تہران کی کسی سڑک پر بیٹھا مانگ رہا ہوتا۔ ایسے ایک ایک گاڑی کے پیچھے بھاگ بھاگ کر کام نہ مانگ رہا ہوتا۔ کام چاہیے پیسے نہیں۔'' میں نے پیسے لینے سے انکار کیا تو اس نے خاموشی سے واپس انہیں جیب میں ڈال لیا۔ وہ دونوں پھر ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ پھر سے مجھ سے مخاطب ہوا۔

''راضی بھائی! دو دن تک آپ اس کی دوکان پر کام کرو! بارہ بجے تک آپ باقی دوکانوں سے سبزی اتارنے کا کام کر لینا اس کے بعد اس کی دوکان پر آ جانا۔ رات کو آٹھ بجے تک دوکان کھلی رہتی ہے۔ آپ آٹھ بجے تک کام کرو اس کے بعد چلے جاؤ۔ دو دن تک اچھا پیسہ بن جائے گا تو آپ آسانی سے تبریز جا سکتے ہو۔ میں نے ہاں میں سر ہلایا تو وہ مسکرانے لگا۔

وہ مجھے لے کر دوکان کے اندر آ گیا۔ دوکان کافی گندی ہو رہی تھی اور کریٹ بھی الٹے پلٹے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے جھاڑو پکڑایا اور صفائی کرنے کا کہا۔ میں نے جھاڑو پکڑ کر ایک سائیڈ پر رکھا اور کریٹوں کو ایک سائیڈ پر کرنے لگا۔ دوکان بہت بڑی تھی اور اس میں تہہ خانہ بھی تھا۔ میں ایک سائیڈ سے شروع ہوا اور صفائی کرنے لگا۔

دو بجے کے قریب فارسی دوکاندار آیا اور مجھے باہر لے گیا۔اس کے گھر سے کھانا آ گیا تھا۔اس نے مجھے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا۔آلو پالک بنی ہوئی تھی اور ساتھ میں تندوری کی بنی ہوئی روٹی تھی۔ایران میں تندور کی روٹی بہت کم استعمال ہوتی ہے۔زیادہ تر پیکٹوں والی نیلی روٹی ہی استعمال ہوتی ہے۔یہ بازار سے بہت سستی مل جاتی ہے اس لئے پورے ایران میں زیادہ تر یہی استعمال ہوتی ہے۔اسے معلوم تھا کہ میں پاکستانی ہوں اور اس نے سپیشل افغانی تندور سے روٹی منگوائی تھی اور ساتھ میں سالن اس کے گھر سے آ گیا تھا۔

''غذا نوش'' وہ مجھے کھانا کھانے کا دوبارہ کہنے لگا۔میں نے کھانا کھانا سٹارٹ کر دیا۔دو دن بعد کھانا مل رہا تھا اور اچھا کھانا مل رہا تھا۔آلو پالک کا سالن بہت مزیدار بنا ہوا تھا۔میں خاموشی سے ایک ایک نوالہ کر کے کھانا کھاتا رہا۔فارسی مالک مجھ سے کھانے کے اچھے ہونے کا پوچھ رہا تھا اور میں سر ہلاتا رہا۔

میں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔میں نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔دور بہت دور آسمان پر کسی کے مسکرانے کا احساس ہو گیا تھا۔وہ مجھے رزق دینے والا میرا خدا ہی ہو سکتا تھا کیونکہ جب سے میں بہاولپور سے چلا تھا تب سے لے کر آج تک میں نے خرید کر کھانا نہیں کھایا تھا۔میں بھوک برداشت کر رہا تھا۔تین تین چار چار دن تک بھوکا رہتا تھا لیکن کھانے پر پیسے نہیں خرچ کر رہا تھا۔شاید میں زیادہ سے زیادہ پیسے بچا کر جلد سے جلد یونان پہنچنا چاہتا تھا۔کھانے کی ذمہ داری تو خدا کی تھی۔اگر وہ ہر کسی کو رزق دیتا ہے تو مجھے بھی دے گا۔اس پر پیسے خرچنے کی کیا ضرورت ہے اور شاید آج وہ میری اسی ادا پر مسکرا رہا تھا۔

''راضی صاحب! جو مرضی کر لو، ناراضگی اور آزمائش اپنی جگہ پر لیکن کھانا تو پھر بھی تم کو دوں گا'' اور وہ کھانا دے رہا تھا۔بے شک تین چار دن بھوکا رکھ کر دیتا تھا لیکن پھر بھی بھوک سے مرنے نہیں دیتا تھا۔

کھانا کھا کر میں دوبارہ صفائی میں مصروف ہو گیا۔رات کو آٹھ بجے سے پہلے پہلے میں نے سارا تہہ خانہ چمکا دیا تھا۔خالی کریٹوں کو ترتیب سے ایک کونے میں لگا دیا تھا اور ٹوٹے ہوئے کریٹوں کو رسی کی مدد سے دوبارہ قابلِ استعمال بنا دیا تھا۔سارا سامان ترتیب سے رکھنے کی وجہ سے اب دوکان میں بہت جگہ بن گئی تھی۔مالک نیچے آیا اور میرا کام دیکھ کر حیران رہ گیا۔اس نے مجھے شاباش دی اور میں مالک کے ساتھ اوپر آ گیا۔

ہم دونوں اب مل کر دوکان کو بند کرنے لگے۔اس نے مجھے اشارے سے سونے کا پوچھا کہ میں کہاں سوتا ہوں؟ تو میں مسکرانے لگا اور انگلی سے چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میں رات کو دوکان کی چھت پر سوتا

ہوں۔ اسے سمجھ نہیں آئی تو میں اسے تھوڑا آگے لایا اور پھر چھت کی طرف اشارہ کیا۔ اس بار میں نے زیادہ واضح اشارے کئے تو اسے میری بات کی سمجھ آ گئی اور وہ پریشانی سے اپنے سر کو کھجانے لگا۔ رات کے آٹھ بج گئے تھے۔ اس نے دوکان کو تالا لگایا اور مجھے ساتھ لے کر اپنے گھر آ گیا۔ گھر سبزی منڈی سے نزدیک ہی تھا۔ ہم پیدل پندرہ منٹ میں گھر آ گئے۔

چھوٹا سا گھر تھا۔ تین کمرے، باتھ روم اور ایک کچن تھا۔ بیٹھک وغیرہ کا رواج میرے خیال میں صرف پنجاب کے دیہی علاقوں میں ہی ہوتا ہے کیونکہ میں نے پاکستان کے باہر کسی بھی ملک میں بیٹھک نہیں دیکھی۔ ڈرائنگ روم ہوتا ہے جو گھر کے اندر ہی ہوتا ہے اور گھر کا ایک ہی مرکزی دروازہ ہوتا ہے۔ فارسی دوکان دار کے تین بچے تھے۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ بیوی اس کی پردہ کرتی تھی۔ میں نے اس کی بیوی کو نہیں دیکھا۔ بچے سارے ہی چھوٹے تھے۔ سات آٹھ سال کی عمر کے اور بہت پیارے تھے۔ اجنبیوں کا خوف ان میں ذرہ برابر بھی نہیں تھا۔ وہ ایک منٹ میں ہی مجھ سے گھل مل گئے۔ مجھے ان کی زبان کی سمجھ نہیں آتی تھی لیکن ان کی شرارتوں کی سمجھ آتی تھی۔

رات کے کھانے میں بکرے کا گوشت بنا ہوا تھا۔ شوربے والا اور ٹماٹروں سے بھرپور۔۔۔ یہ لوگ لال مرچ کی بجائے کالی مرچ استعمال کرتے ہیں اور گرم مصالحے بھی استعمال نہیں کرتے۔ کھانا صرف پاکستان اور انڈیا میں ہی بنایا جاتا ہے اس کے علاوہ پوری دنیا میں کہیں ایسا ذائقہ نہیں ہے۔ ہم لوگوں نے کسی اور چیز میں ترقی کی ہو یا نہ کی ہو کھانے اور اسلحے میں ضرور ترقی کی ہے۔

پاکستان سے باہر نکلتے ہی ہم لوگ پاکستانی یا انڈین ہوٹلوں اور دوکانوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ پاکستان سے باہر نکلتے ہی ہم ساری دشمنی بھول جاتے ہیں۔ یہ دشمنی صرف پاکستان اور انڈیا کے اندر ہی ہوتی ہے۔ شاید ایک دن یہ دشمنی بھی ختم ہو جائے اور ہم اچھے بھائیوں کی طرح محبت سے رہنا شروع ہو جائیں۔ کھانا کھانے کے بعد انہوں نے مجھے ایک کمرے میں بستر لگا کر دے دیا اور میں بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اگلے دن سے پھر وہی روٹین۔۔۔ میں مزید دو دن ان کی دوکان پر کام کرتا رہا۔

میرے پاس اب تبریز جانے کے لئے کرایہ بن گیا تھا اس لئے میں نے فارسی دوکاندار سے اجازت مانگی اور تہران بس ٹرمینل کی طرف بڑھ گیا۔ میں گھر سے نہا دھو کر صاف کپڑے پہن کر نکلا تھا اس لئے مجھے ٹکٹ لینے اور بس میں سوار ہونے میں کوئی دقت نہیں ہوئی اور میں آسانی سے تبریز والی بس میں سوار ہو گیا۔ تہران سے تبریز تقریباً

550 کلومیٹر سے زیادہ فاصلہ تھا۔تقریباً سات گھنٹے میں بس تبریز پہنچ چکی تھی۔ میں دن کو 5 بجے کے قریب تہران سے نکلا تھا اور ابھی 12 بج گئے تھے۔

میں تبریز شہر کی گلیوں میں گھومنے لگا۔ زبان نہیں آتی تھی لیکن سبزی منڈی کو فارسی میں کیا کہتے ہیں اس کا پتہ تھا۔لوگوں سے یہی پوچھتا میں اشاروں سے چلتا رہا اور آخر کار سبزی منڈی پہنچ گیا۔ یہ کام آسان تھا۔ مجھے چار دن تہران میں رہتے ہوئے اب کام کے متعلق نارمل زبان آ گئی تھی۔ میں منڈی میں سبزی اتارنے کا کام کرسکتا تھا۔ مجھے چھ مہینوں کے لئے مستقل کام اور رہائش چاہیے تھی۔ چھ سات مہینوں تک میں اتنے پیسے جمع کرسکتا تھا جس سے میں آسانی سے کسی ایجنٹ کو پیسے دے کر ترکی کا بارڈر کراس کرسکتا۔

یہاں پہ بھی میں اکیلا بارڈر کراس نہیں کرسکتا تھا کیونکہ ادھر کرد بہت زیادہ تھے۔ترکی، ایران، عراق اور شام کے بارڈر پر کرد قبائل بستے ہیں، یہ بہت جنگجو لوگ ہیں۔ ایران میں بسنے والے کرد بارڈر کراس کرنے والے لڑکوں پر حملہ کرتے تھے۔ یہ لوگ گروپوں کی صورت میں حملہ کرتے تھے اور بعض اوقات پوری کی پوری ڈنکی ہی اغوا کر کے لے جاتے تھے۔ یاد رہے کہ ڈنکی میں کم سے کم بھی پچاس سے زیادہ لڑکے ہوتے ہیں۔ یہ سارے لڑکے زیادہ تر پاکستانی اور افغانی ہوتے ہیں۔

کرد لڑکوں کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں اور پھر ان کے گھر والوں سے تاوان وصول کرتے ہیں۔تاوان کی رقم ڈالروں میں ادا کی جاتی ہے اور ایک لڑکے کا تقریباً پانچ سے چھ ہزار ڈالر وصول کرتے ہیں۔ جو ویسٹرن یونین کے ذریعے ترکی میں کہیں سے بھی جعلی آئی ڈی کارڈ کی مدد سے پیسے وصول کر لیتے ہیں۔ یہ لوکل کرائم تھا اور ترکی کی گورنمنٹ زیادہ سختی نہیں کرتی تھی۔

بعد میں طیب اردگان نے ان کردوں کے خلاف بہت بڑا آپریشن کیا تھا اور اغوا برائے تاوان کا کاروبار مکمل طور پر ختم ہو گیا تھا۔ ورنہ 2006ء میں تو پورے پورے گاؤں ہی باہر نکلتے تھے اور حملہ کرتے تھے۔جس گھر کے ہاتھ کوئی ایک بھی لڑکا لگ جاتا تو پھر ان کے پورے سال کا خرچہ بن جاتا تھا۔ یہ لڑکے کو آگے فروخت کر دیتے۔ بڑا کرد ایجنٹ لڑکوں کو خریدتا، تشدد کرتا اور اس کے گھر والوں سے پیسہ وصول کرتا تھا۔

وہی پاکستان اور ایران کے بارڈر والے حالات تھے۔ بلوچستان والے اغوا نہیں کرتے تھے بلکہ جان سے مار دیتے تھے۔ یہاں پر جان کا خطرہ تو نہیں ہوتا تھا لیکن کرد اتنا تشدد کرتے تھے کہ انسان کی روح بھی کانپ اٹھتی

تھی۔ یہ پلاس سے سارے ناخن اکھیڑ دیتے تھے۔ میں نے خود لڑکوں کی کلائیوں اور ٹانگوں میں ڈرل مشین سے پڑے نشان دیکھے تھے۔ یہ لوگ جانوروں سے بھی بدتر تھے۔ میں اکیلا بارڈر کراس نہیں کرسکتا تھا۔ یہ ناممکن تھا۔

بارڈر کراس کروانے والے ڈنکر کرد ہی ہوتے ہیں اور ان ایجنٹوں کی پوری سیکورٹی ہوتی ہے۔ ایجنٹ اسلحے سے لیس ہو کر قافلہ نکالتے ہیں اور بہت زیادہ خطرے کی صورت میں گولی مارنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ ایجنٹ صرف سیکورٹی فورسز سے ڈرتے ہیں۔ سیکورٹی فورسز کے چھاپے کی صورت میں ایجنٹ بھاگ جاتے ہیں تو پیچھے لڑکے رہ جاتے ہیں اور یہ لڑکے پولیس سے بچنے کے لئے جدھر کو منہ لگتا ہے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور پھر ان کردوں کے ہاتھ لگ جاتے ہیں۔

میں سبزی منڈی میں آ گیا تھا۔ یہ منڈی تہران شہر سے تھوڑی چھوٹی تھی لیکن پھر بھی بہت بڑی تھی۔ باہر سے سبزی لے کر آنے والی گاڑیاں تو ابھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ یہاں بھی صرف صبح کے وقت ہی آتی تھیں۔ اس وقت صرف سبزی اور فروٹ خریدنے والے تھے۔ یہ تبریز شہر اور نزدیکی چھوٹے چھوٹے دیہاتوں کے چھوٹے دوکان دار تھے جو یہاں سے سبزی اور فروٹ خرید کر اپنی دوکانوں پر کلو دو کلو کے حساب سے بیچتے تھے۔ یہاں پر سبزی اور پھل کریٹوں کے حساب سے بھیجی جاتی تھی۔

میں منڈی کے ایک سرے سے شروع ہوا اور ایک ایک کر کے پوری منڈی کی دوکانوں سے کام پوچھ لیا لیکن کسی بھی دوکان سے کام نہ ملا۔ دو تین دوکان داروں نے دوسرے دن صبح صبح آنے کا کہا۔ سبزی اتارنے کے لئے ایک دوکان دار نے کام کا بتایا۔ اس کے پاس ایک افغانی لڑکا تھا اور وہ اگلے ہفتے واپس افغانستان جا رہا تھا۔ دوکان دار نے مجھے اگلے ہفتے آنے کا کہا۔ میں نے خاموشی سے سر ہلا دیا اور دوسری دوکانوں کی طرف بڑھ گیا۔ سب دوکانوں سے پتہ کر کے میں سبزی منڈی سے باہر آ گیا۔ اب مجھے رات گزارنے کے لئے کسی جگہ کی تلاش تھی۔ کھانے کی تو خیر تھی، دو تین دن میں بغیر کھانے کے گزار سکتا تھا لیکن ساری رات روڈ کے اوپر نہیں گزار سکتا تھا۔ کھانے کی ذمہ داری تو خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے اور مجھے کسی ٹھکانے کی تلاش تھی۔

پولیس کا یہاں پر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اگر پکڑ کر لے بھی جاتی تو پرمٹ مل جاتا اور مجھے یہاں کام کرنے کا پرمٹ چاہیے تھا۔ میں ٹھکانے کی تلاش میں گھومتا گھومتا شہر سے باہر آ گیا۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا۔ میں ایک نہر کے کنارے پر آ گیا۔ یہ بہت بڑی نہر تھی۔ شہر کے ایک سرے سے شروع ہوتی تھی اور پوری تبریز شہر کے درمیان سے

گزرتی ہوئی دوسرے سرے سے نکل جاتی تھی۔ یہ تبریز شہر کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی۔ میں نے نہر کے کنارے کنارے چلنا شروع کر دیا۔

تھوڑی دور ہی مجھے ایک اچھی جگہ نظر آ گئی۔ یہ ایک کھڈا تھا۔ دو چٹانیں زمین کے اندر اس طریقے سے جڑی ہوئی تھیں کہ ایک چٹان نیچے تھی اور دوسری چٹان نے اوپر دو طرف سے اس کو گھیرا ہوا تھا۔ باقی دو سائیڈیں خالی تھیں اور ہلکی سی ڈھلان کے بعد زمین برابر ہو جاتی تھی۔ یہ رات گزارنے کے لئے بہترین جگہ تھی۔ میں نہر کے کنارے پر جا کر بیٹھ گیا اور پانی کو شہر کی طرف جاتا ہوا دیکھنے لگا۔ ابھی رات کا اندھیرا ہونے میں دو تین گھنٹے باقی تھے اور میں دن کے وقت ادھر نہیں لیٹ سکتا تھا۔ مجھے رات ہونے کا انتظار کرنا تھا تا کہ ادھر لیٹ کر آرام کر سکتا۔ میں سبزی منڈی سے بہت دور آ گیا تھا۔ مجھے صبح چار بجے اٹھنا تھا تا کہ میں ٹائم سے سبزی منڈی پہنچ سکتا۔

رات کا اندھیرا گہرا ہوا تو میں کھڈے میں سر کے نیچے ایک بڑا سا پتھر رکھ کر سو گیا۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا اور سردی پہاڑی علاقے کی وجہ سے بہت زیادہ تھی۔ اتنی زیادہ سردی میں سویا نہیں جا سکتا تھا۔ میں ساری رات سردی سے ٹھٹھرتا رہا اور ایک سیکنڈ بھی نہ سو پایا۔ پوری رات نیند سے لڑتا رہا۔ پوری رات ایمان کی یادوں کو سہارا بنا کر سردی کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا رہا اور صبح چار بجے اٹھ کر منڈی کی طرف چل پڑا۔

تبریز تہران کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا۔ مجھے کام پکڑنے میں بہت مشکل ہوئی۔ بارہ بجے تک میں صرف تین گاڑیاں ہی پکڑ سکا اور ان گاڑیوں سے بھی زیادہ پیسہ نہیں بنا۔ میرے چہرے پر ایک پل کے لئے مایوسی آئی لیکن میں سنبھل گیا۔ آج چونکہ پہلا دن تھا اس لئے اتنی جلدی کام مشکل سے ملتا ہے۔ ایک دو دن مشکل ہوں گے اس کے بعد کچھ نہ کچھ آسرا بن جائے گا۔ محبت کے سفر پر نکلا ہوں تو آزمائشیں تو آئیں گی۔

اب کی بار میں نہر کے کنارے کی طرف جانے کی بجائے شہر کے اندر گلیوں میں گھومنے لگا۔ مجھے مزید کپڑوں یا چادر کی تلاش تھی۔ اتنی سردی میں میں نہیں سو سکتا تھا اور اگر مزید ایک دو دن نہ سوتا تو بیمار پڑ سکتا تھا۔ بھوک تو انسان برداشت کر لیتا ہے لیکن نیند برداشت نہیں کر سکتا۔ بغیر سوئے دو دن بھی نہیں نکالے جا سکتے۔ مجھے دو تین مزید اور کپڑے مل جاتے تو میں سردی کا مقابلہ کر سکتا تھا اور ابھی انہی پرانے کپڑوں کی تلاش میں تبریز شہر کے ہر کوڑے دان کو کھنگال رہا تھا۔ میں تین چار گھنٹوں تک شہر کے کوڑے دانوں کو دیکھتا رہا لیکن مجھے کوئی بھی کپڑا نہ مل سکا۔

ایران میں بھی پاکستان جیسے حالات تھے۔ یہاں بھی کوئی کپڑا باہر نہیں پھینکتا تھا۔ ہم لوگ بھی کپڑا پرانا ہو جاتا

پھٹ جاتا لیکن اسے باہر نہیں پھینکتے ہیں۔فرش پر پوچا لگانے کیلیئے، دیواروں کے کونے میں مکڑے کے جالے صاف کرنے کے لئے اور صفائی کرنے کے لئے بھی پرانے کپڑے استعمال کرتے ہیں۔ یورپی ممالک میں اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہاں پر باقاعدگی سے ہر چھ مہینے کے بعد جب سیزن چینج ہوتا ہے۔

موسم بدلتا ہے تو وہ لوگ کپڑوں کی چھانٹی کرتے ہیں اور چرچ کو دے دیتے ہیں۔ چرچ والے ان کپڑوں کو سستے داموں آگے مختلف کمپنیوں کو بیچ دیتے ہیں۔ یہ کمپنیاں کپڑوں کو دھوتی ہیں اور مہنگے اور سستے کپڑوں کو علیحدہ کرتی ہیں اور پھر کنٹینر بھر کر بحری جہاز کے ذریعے پاکستان، انڈیا اور بنگلہ دیش بھیج دیتی ہیں۔ پاکستان میں کنٹینر کو کھولا جاتا ہے اور بولی لگتی ہے۔ پاکستانی اور انڈین کمپنیاں ان کنٹینروں کو خرید لیتی ہیں اور پھر یہ کمپنیاں ملک کے مختلف شہروں میں لنڈے والوں کو بیچ دیتی ہیں۔ یہ لنڈے کا کاروبار ہے۔

آپ لوگ لنڈے سے جو بھی شرٹ خریدتے ہو وہ کسی یورپی گورے کی ہوتی ہے جو وہ چھوٹی یا پرانی ہو جانے کی صورت میں چرچ کو خیرات کر دیتا ہے۔ یہ سارا لنڈے کا مال ہوتا ہے۔ یہ گوروں کی وہ خیرات ہے جسے یہ لوگ اپنے مقامی چرچ کو دے دیتے ہیں۔اس کے علاوہ گورے ہر دو تین مہینے کے بعد اپنے گھر کا فالتو سامان باہر کوڑے دان کے ساتھ رکھ دیتے ہیں۔آپ کو یورپ کی گلیوں میں کپڑے، الماریاں، گدے اور الیکٹرانک کا سارا سامان پھینکا نظر آئے گا۔ یہ لوگ نیا ٹی وی خریدتے ہیں تو پرانا باہر گلی میں رکھ دیتے ہیں۔ جہاں سے کوئی دوسرا اٹھا کر لے جاتا ہے۔

جبکہ اس کے برعکس پاکستان اور انڈیا میں لوگ بوڑھے ہو کر مر جاتے ہیں لیکن سامان نہیں پھینکتے۔ ہمارے گھر کباڑ کے سامان سے بھرے رہتے ہیں اور پڑے پڑے ان میں کیڑے اور سینک آ جاتی ہے۔صرف ہمارے مرنے کے بعد ہماری اولاد ہی ان چیزوں کو تب پھینکتی ہے جب یہ کسی بھی قسم کے استعمال کے قابل نہیں رہے۔

اس دن میں تبریز شہر کی گلیوں میں کسی چادر یا کپڑے کی تلاش میں گھومتا رہا لیکن شاید میری قسمت میں ابھی دیر تھی۔ مجھے شام تک کوئی بھی چادر نہیں ملی۔ابھی اندھیرا ہونے لگا اور میں صبح چار بجے سے اٹھا ہوا تھا اس لئے تھک گیا تھا۔میں واپس رات گزارنے کے لئے نہر کی طرف چل پڑا۔

راستے میں مجھے ایک چادر نظر آ گئی۔ یہ دھونے کے بعد باہر کسی نے سوکھنے کے لئے لٹکائی ہوئی تھی۔ میرے دل میں شیطان آ گیا۔ میں نے چادر کو ہاتھ لگایا، بہت بڑی اور گرم چادر تھی۔ میں کافی دیر تک ادھر کھڑا رہا۔میرا دل

چادر لے جانے سے منع کر رہا تھا۔ یہ چوری تھی لیکن دماغ کہہ رہا تھا اگر ایک رات اور باہر نکالی تو سردی سے ٹھٹھر کر کدھر جاؤں گا؟ آخر میں ایک درمیانی راستہ نظر آ گیا۔ دماغ نے یہ فیصلہ کیا کہ چادر لے جاتا ہوں، رات گزارتا ہوں اور صبح چار بجے آ کر چادر یہیں رکھ کر کام پر چلا جاؤں گا۔ ایک رات کی چوری سے جان بچ رہی تھی تو یہی صحیح فیصلہ تھا۔

میں چپکے سے چادر لے کر واپس اسی جگہ چٹان کے اندر کھڈے میں آ گیا۔ اس بار رات بہت آرام سے گزر گئی۔ میں چار بجے کے قریب اٹھا۔ میں نے چادر کو واپس اسی جگہ پر رکھا جہاں سے اٹھائی تھی اور کام پر چلا گیا۔ آج بھی کام کچھ خاص نہیں تھا۔ چار چھوٹی چھوٹی گاڑیاں اور ایک بڑی گاڑی سے سبزی اتاری۔ زبان ابھی مجھے تھوڑی تھوڑی آنا شروع ہو گئی تھی باقی کام اشاروں سے چل جاتا تھا۔

میں کبھی کسی گاڑی والے سے بارگیننگ نہیں کرتا تھا اور نہ ہی پیسے گنتا تھا۔ جتنے پیسے دیتے خاموشی سے جیب میں ڈال لیتا تھا۔ گاڑی والے اور دوکان دار دونوں میرے کام سے مطمئن ہوتے تھے۔ میرا کام یہاں اچھا چل سکتا تھا لیکن مجھے ایک گھر اور کھانے کی ضرورت تھی۔ مجھے ایک مستقل کام چاہیے تھا جہاں کام کے ساتھ ساتھ کھانا اور گھر بھی ملتا۔ یہ کوئی دو تین دن کا کام تو نہیں تھا بلکہ مجھے یہاں تبریز میں چھ سات مہینے رہنا تھا اور میں روزانہ نہر کے کنارے پر نہیں سو سکتا تھا۔

آگے موسم زیادہ سے زیادہ ٹھنڈا ہو رہا تھا اور سردیوں میں باہر نہیں سویا جا سکتا تھا۔ میں نے کام ختم کر لیا اور ایک دوکان دار سے خدا حافظ کہہ کر باہر نکلنے لگا۔ جب اس نے مجھے گلے ہوئے ٹماٹروں کا ایک کریٹ کوڑے دان میں پھینکنے کو کہا۔ میں نے ٹماٹروں کی طرف دیکھا۔ گل گئے تھے لیکن پھر بھی ان میں سے کچھ کھانے کے قابل تھے۔ میں نے دوکان دار سے ایک لفافہ مانگا اور گلے ہوئے ٹماٹروں کے کریٹ کو لے کر کوڑے دان کے پاس آ گیا۔ یہاں آ کر میں اچھے اچھے ٹماٹر علیحدہ کرنے لگا۔

میں نے اس کریٹ سے ایک پورا لفافہ بھر کر علیحدہ کر لیا اور باقی گلے ہوئے ٹماٹروں کو کوڑے دان میں پھینک کر خالی کریٹ جا کر دوکان دار کو دے دیا اور خود ٹماٹروں والے بیگ کو لے کر سبزی منڈی سے باہر آ گیا اور ایک بار پھر شہر میں کسی چادر کی تلاش میں گھومنے لگا۔

بھوک کا انتظام ہو گیا تھا اور سردی کا انتظام کرنا ابھی باقی تھا۔ رات آٹھ بجے تک میں چادر یا کپڑوں کی تلاش میں رہا۔ میں نے ان آٹھ گھنٹوں میں ٹماٹروں کا پورا لفافہ کھا لیا تھا۔ پیٹ بھر گیا تھا لیکن چادر کہیں نہیں ملی تھی۔ ایک

جگہ پر مجھے ایک پرانی پینٹ اور دو شرٹیں مل گئی تھیں جو میں نے اٹھالی تھیں۔اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ملا تھا۔

میں واپس نہر کے کنارے کی طرف چل رہا تھا۔آج رات سردی میں ہی گزارنی تھی۔ مجھے رات والی جگہ پر وہی چادر پھر لٹکی نظر آئی۔ گھر والوں نے ابھی تک چادر وہاں سے اٹھائی نہیں تھی۔ میں نے چادر وہاں سے اٹھالی۔ آج رات پھر چادر وہاں سے اٹھا کر صبح واپس کر دیتا۔ میں نے رات وہیں نہر کے کنارے گزاری اور صبح کو چادر واپس اسی جگہ پر رکھ کر کام پر چلا گیا۔

بارہ بجے تک کام کرنے کے بعد میں کوڑے دان کے پاس آ گیا۔ میرے پاس لفافہ تھا۔کل میں نے ٹماٹر پھینکتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ یہاں سے بہت کچھ کھانے کو مل سکتا تھا۔ میں کوڑے دان سے آدھے گلے ہوئے سیب، کیلے، ٹماٹر اور دوسرے پھل نکالنے لگا۔آدھے گھنٹے میں ہی میں نے لفافہ بھر لیا۔میرے آج کے کھانے کا انتظام بھی ہو گیا تھا اس لئے میں ایک بار پھر شہر کی گلیوں میں پھرنے لگا۔ میں راستے میں آنے والی مختلف دکانوں سے کام کا بھی پوچھتا رہا۔

آج کا دن بھی میرے لئے کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آیا۔ میں خالی ہاتھ ہی واپس نہر کے کنارے کی طرف چل پڑا۔ چادر اس بار بھی رات والی جگہ پر ہی پڑی ہوئی تھی۔ میں دو دن سے مسلسل چادر استعمال کر رہا تھا اور ایک بار پھر چادر کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔اس بار چادر لے جانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ دو دن سے میں مسلسل چادر استعمال کر رہا تھا۔ میں آج کل بہت سست ہو گیا تھا۔ زندگی جیسے ایک مقام پر آ کر رک سی گئی تھی۔

''واہ رے رضوان علی گھمن صاحب! محبت میں بڑے بڑے پہاڑ توڑنے کے دعوے کرتے تھے۔آج سردیوں کی کچھ راتیں نہیں گزار سکتے، اتنے نازک ہو گئے ہو؟ اگر اتنی ہی سردی لگتی ہے تو واپس چلے جاؤ گھر میں ماں انتظار کر رہی ہے۔ ماں کے ہاتھ سے بنی ہوئی روٹی کھاؤ، کیا ضرورت پڑی ہے محبت کی راہوں میں ذلیل ہونے کی؟'' میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا تو میں نے چادر سے ہاتھ کھینچ لیا۔

مجھے محبت کرنا بھی آتا ہے، جان دینا بھی آتا ہے اور اسی محبت میں سردی کی ایک ایک رات بیٹھ کر گزار سکتا ہوں لیکن محبت کرنا نہیں چھوڑ سکتا۔ میں چادر سے تھوڑا دور ہوا اور مڑ کر واپس نہر کی طرف چلنے لگا۔

''اے اے دوست!'' مجھے پیچھے سے کوئی آواز دے رہا تھا تو میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

چادر والے گھر سے ایک آدمی باہر نکل کر مجھے آوازیں دے رہا تھا۔ ایک بار تو میں ڈر گیا۔ وہ آدمی مجھے چور سمجھ سکتا تھا اور جیل بھی بھجوا سکتا تھا۔ مجھے سزا کا کوئی ڈر نہیں تھا لیکن ڈی پورٹ ہو سکتا تھا اور ڈی پورٹ ہونے سے ہی ڈر لگتا تھا کیونکہ میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا اور چوری کے الزام میں پکڑا جاتا تو پکا ڈی پورٹ ہی ہونا تھا۔ میں بھاگنے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن پتہ نہیں کیوں میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور میں اس آدمی کے پاس چلا گیا۔ میں نے چادر نہیں اٹھائی تھی۔ خالی ہاتھ جا رہا تھا اور جو دو دن میں نے ان کی چادر استعمال کی تھی اس کی معافی بھی مانگنی تھی اس لئے میں اس آدمی کے پاس چلا گیا تو اس نے مجھ سے فارسی میں بات کرنا شروع کر دی۔

''نو فارسی! پاکستان۔۔۔اردو، اردو!'' میں نے اشاروں سے اسے بتایا کہ مجھے فارسی نہیں آتی۔

''نو فارسی، انگلش؟'' میں نے ہاں میں سر ہلایا تو وہ مجھ سے انگلش میں بات کرنے لگا۔ میں یہاں پر انگلش کی بجائے اردو ہی لکھوں گا۔

''پاکستان سے آئے ہو۔؟'' اس نے مجھ سے پوچھا تو میں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

''کیا کام کرتے ہو اور ادھر کہاں رہتے ہو؟'' اس نے ایک ساتھ دو سوال کر دیئے۔

میں نے اسے سبزی منڈی میں کام کرنے کا بتایا اور چادر استعمال کرنے پر معافی مانگی۔

''سوری انکل! نہر کے کنارے پر سردی بہت لگتی ہے، روزانہ شہر میں کوئی پرانا کمبل یا چادر وغیرہ تلاش کرتا ہوں لیکن ابھی تک مجھے کوئی پرانا کمبل یا چادر وغیرہ نہیں ملی۔ اتنے پیسے نہیں ہیں کہ کمبل خرید سکوں۔'' میں نے اس سے معافی مانگتے ہوئے کہا۔

''نہیں بیٹا! یہ چادر میں روزانہ اب تمہارے لئے ہی رکھتا تھا۔ تم استعمال کرنے کے بعد واپس رکھ دیتے تھے۔ یہ چادر تمہاری ہے، تم اسے استعمال کرو اور واپس بھی مت کرنا۔'' اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور چادر لے کر جانے لگا۔

''ایک منٹ ادھر ہی رکو، میں ایک منٹ میں آتا ہوں۔'' اس نے مجھے وہیں کھڑا رہنے کو کہا اور گھر میں چلا گیا۔ ایک منٹ بعد ہی وہ واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پیسے تھے۔ وہ پیسے مجھے پکڑانے لگا۔

''بیٹا یہ پیسے رکھ لو،تمہارے کام آئیں گے۔''

''نہیں انکل! میں مانگنے والا نہیں ہوں۔ مجھے پیسے نہیں چاہئیں، میرا گزارہ ہو رہا ہے۔'' میں اس سے دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

''نہیں بیٹا! میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں۔'' اس نے زور دیتے ہوئے کہا لیکن میں اپنی بات پر قائم رہا۔

''انکل بات خوشی کی نہیں ہے، جب میں محنت سے کما کر کھا سکتا ہوں تو پھر مانگ کر کیوں کھاؤں؟ آپ اگر کوئی کام دے سکتے ہو تو یہ آپ کی مہربانی ہو گی۔ مجھے کام بھی مل جائے گا اور سر چھپانے کی جگہ بھی مل جائے گی لیکن پیسے نہیں چاہئیں۔ آپ اعتبار کرو، میں محنتی لڑکا ہوں جہاں بھی جاؤں گا محبت سے دل لگا کر کام کروں گا۔'' میں نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! مجھے ایک دن کا ٹائم دو، میرا ایک بھائی ہے یہاں سے آدھا گھنٹہ کی مسافت پہ ایک گاؤں میں رہتا ہے۔ اس کا زمیندارے کا کام ہے۔ کھیتی باڑی اور بھیڑیں پالتا ہے۔ اچھے پیسے دے گا اور کھانا اور رہائش دونوں مل جائیں گے۔ میں پوچھتا ہوں بھائی سے۔۔۔ مجھے امید ہے اس کے پاس کام نکل آئے گا۔ کل شام کو ادھر آ جانا!'' میں نے اس سے شام کو آنے کا وعدہ کیا اور نہر کے کنارے پر آ کر سو گیا۔

دوسرے دن صبح صبح میں سبزی منڈی کام پر آ گیا۔ بارہ بجے تک میں نے منڈی میں کام کیا اس کے بعد میں اس کے گھر کی طرف چلا گیا۔ چونکہ اب میرے پاس رات گزارنے کے لئے چادر آ گئی تھی اس لئے مجھے شہر میں کپڑے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اس انکل کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اس کے دس سالہ بیٹے نے دروازہ کھولا۔ اس کا بیٹا بھی انگلش جانتا تھا۔ میں نے اس سے انکل کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ گاؤں گیا ہوا ہے۔ وہ شاید میرے کام کا پوچھنے کے لئے گاؤں میں اپنے بھائی سے ملنے گیا ہوا تھا۔

میں واپس آ گیا اور شہر میں آوارہ گردی کرنے لگا۔ مجھے ابھی بھی کسی اچھے کام کی تلاش تھی۔ انکل نے کام پوچھنے کا کہا ضرور تھا مگر کنفرم نہیں تھا۔ ہوسکتا تھا کہ اس کے بھائی کو آدمی کی ضرورت نہ ہو۔ یہی سوچ کر میں شہر میں گھوم پھر کر کام پوچھ رہا تھا۔ رات کو آٹھ بجے میں واپس ان کے گھر کی طرف چلا گیا۔ اس بار دروازہ کھٹکھٹایا تو اسی

انکل نے دروازہ کھولا اور مجھے دیکھ کر خوش ہوگیا۔اس نے اپنے بھائی سے بات کر لی تھی اور میرے کام کا بندوبست ہوگیا تھا۔ مجھے کل صبح نکلنا تھا۔ میں نے ان سے ایک بجے تک کا ٹائم لے لیا اور واپس آ گیا۔ میں بارہ بجے تک سبزی منڈی میں کام کرتا اور اس کے بعد ان کے ساتھ گاؤں چلا جاتا۔ پیسے وہ مالک ہفتے کے ہفتے دیتا تھا اور اچھے پیسے دیتا تھا۔ میں ادھر رہ کر آرام سے چھ مہینوں میں ترکی کا بارڈر کراس کرنے کے لئے پیسے جمع کر سکتا تھا۔

میں رات کو نہر کے کنارے پر آ گیا۔رات گزاری، دن کو کام کیا اور ایک بجے ان انکل کے گھر آ گیا۔ وہ مجھے لے کر تبریز کے بس اڈے پر آ گئے۔ یہاں سے ہم دونوں نے بس پکڑی اور ارمیہ جھیل کے کنارے ایک خوبصورت سے گاؤں میں آ گئے۔ مجھے اس گاؤں سے بہت محبت اور عزت ملی تھی۔ یہ سلماس شہر سے صرف چالیس منٹ کے فاصلے پر تھا۔

پاکستان سے یونان پیدل جانے والے ہر لڑکے کو سلماس کا نام زبانی یاد ہوگا۔سلماس مکمل طور پر پہاڑی علاقہ ہے اور ترکی کے بارڈر پر ہے۔ یہاں سے بارڈر صرف تیس کلومیٹر دور ہے اور پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہاں سے ترکی کی ڈنکی شروع ہوتی ہے اور پانچ پانچ دن تک لگا تار چلتی ہے۔لڑکے رات کو سفر کرتے ہیں اور دن کو جنگل میں چھپ کر سوتے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے پہاڑوں سے گھرا ہوا یہ علاقہ گاڑی کی پہنچ سے دور ہوتا ہے۔ پہاڑوں کے اوپر سے کچھ راستے بنے ہوتے ہیں لیکن پورے علاقے کی تو روڈ نہیں بن سکتی تھی۔

بھیڑ بکریاں چرانے والے ان پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھیڑیں چراتے ہیں اور یہی بھیڑیں چرانے والے بارڈر کراس کروانے کے نئے راستے تلاش کرتے ہیں۔ وہاں سے انسانی سمگلنگ روکنا ناممکن تھا کیونکہ ایجنٹ پانچ پانچ دن کی ڈنکی لگواتے ہیں۔ یہ پہاڑوں کی چوٹیوں کو کراس کرواتے ہوئے لڑکوں کو بارڈر پار لے جاتے ہیں۔

ڈنکی کے ساتھ ساتھ گھوڑے بھی اس وقت سفر کرتے ہیں۔ اگر کوئی لڑکا تھک جاتا ہے تو بیس بیس ڈالر دے کر کچھ وقت کے لئے گھوڑے پر سفر کر سکتا ہے۔ یہ بہت لمبی ڈنکی تھی۔لڑکوں کی سلماس کے نام سے ہی جان نکلتی تھی جبکہ سلماس کے مقابلے میں ماکو کی ڈنکی صرف دس گھنٹے کی ہوتی تھی۔لیکن یہاں پر سختی بہت زیادہ تھی کیونکہ بارڈر پر ترکی والے لڑکوں کو دیکھ کر فائرنگ کرتے تھے اور ڈنکر لڑکوں کو واپس لے کر آ جاتے تھے۔ وہ آگے جانے کی غلطی نہیں کرتے تھے کیونکہ بعض اوقات ترکی والے ڈائریکٹ فائرنگ بھی کر دیتے تھے اور وہ گھیرا ڈال کر پکڑنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ اس لئے ڈنکر چوری چھپے بارڈر کراس کرنے کی کوشش کرتے۔ اگر کوئی مسئلہ ہوتا تو چانس لینے کی

بجائے واپس آجاتے۔

ارمیہ جھیل کے کنارے یہ گاؤں بہت خوبصورت تھا۔ میرے مالک کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی اور ساری اولاد سولہ سے بیس سال کے درمیان جوان تھی۔ اس گاؤں میں اس کی کافی زمین تھی۔ یہاں پر ایکڑوں کا حساب نہیں ہوتا بلکہ زمین ناپنے کا پیمانہ اور ہوتا ہے۔ میرے مالک کی تقریباً پچاس ایکڑ زمین تھی۔ تیس ایکڑ پر تو وہ گندم اور چاول بیجتا تھا۔ (چاول یہاں پر موٹا ہی اگایا جاتا ہے۔ باریک باسمتی چاول صرف پاکستان اور انڈیا میں ہی بھیجا جاتا ہے۔) باقی بیس ایکڑ پر میرا مالک سبزی اگاتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس قریباً ایک سو پچاس کے قریب بھیڑیں بھی تھیں جو صرف گوشت کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔ دودھ والی بھیڑیں نہیں تھیں۔

دودھ دینے والی بھیڑیں مختلف ہوتی ہیں اور بہت نازک مزاج ہوتی ہیں۔ ان کی خوراک کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔ جبکہ یہ گوشت والی بھیڑیں بہت سخت جان ہوتی ہیں اور ہر قسم کے حالات میں رہنے کی عادی ہوتی ہیں۔ میرے مالک نے ایک لڑکا ان کیلئے رکھا ہوا تھا جو صبح صبح ان کو لے کر پہاڑوں کی طرف چلا جاتا اور شام کو گھر واپس لے آتا۔ بھیڑیں باہر سے چر کر آجاتی تھیں۔ پانی اور چارہ وغیرہ سب کچھ جنگل میں پہاڑوں پر مل جاتا تھا۔ صرف سردی کے مہینے میں جب برف پڑ جاتی تھی تو ان کو ڈیرے پر خوراک دی جاتی تھی۔

میرے مالک کے دس کے قریب لڑکے ملازم تھے جو سبزی توڑنے کا کام کرتے تھے۔ ڈیرے پر ہی ان کے رہنے کے لئے دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ مجھے بھی ان لڑکوں کے پاس ایک بیڈ مل گیا تھا۔ کھانا لڑکے مل کر باری سے بنا لیتے تھے۔ یہاں پر ڈیوٹی آٹھ بجے سے پانچ بجے تک ہوتی تھی۔ درمیان میں ایک بجے سے دو بجے تک بریک ہوتی تھی۔ لڑکے اس بریک ٹائم میں کھانا بھی کھا لیتے تھے اور نماز بھی پڑھ لیتے تھے۔ سبزی توڑنے کی ڈیوٹی ہوتی تھی، پالک، ٹماٹر، اور کدو نکالے جاتے تھے۔ مالک ہفتے میں پانچ دن ایک لڑکے کو اپنے ساتھ لے کر تبریز شہر میں گاڑی لے کر جاتا تھا۔ ساری سبزی اسی شہر میں جاتی تھی۔

گاڑی ایئر کنڈیشنڈ تھی جو کہ بجلی پر بھی چلتی تھی۔ ہم چار بجے گاڑی میں سبزی بھر دیتے تو وہ اس گاڑی کو کھڑا کر کے بجلی سے ایئر کنڈیشنڈ چلا دیتا۔ پوری رات ایئر کنڈیشنڈ میں رہنے کی وجہ سے سبزی بالکل تازی اور نکھری نکھری نظر آتی تھی۔ بجلی ایران میں چوبیس گھنٹے رہتی تھی اور بجلی کا بل زراعت کے لئے فری تھا۔ یہ بہت اچھی جگہ تھی اور میں پہلے دس بارہ دنوں میں ہی یہاں مل جل گیا تھا۔ مجھے اب یہاں کام کرنے کا مزا آنے لگا تھا۔ سبزی توڑنے کا کام میرا

پسندیدہ کام تھا۔ میں نے اپنا سارا بچپن اسی سبزی توڑنے کا کام کرتے ہوئے گزارا تھا۔

مجھے یہاں پر بالکل گھر والی فیلنگز آتی تھیں۔ باقی لڑکے اگر پالک کا ایک کریٹ توڑتے تھے تو میں ان کے مقابلے میں دو کریٹ توڑ لیتا تھا۔ میں سبزی کے کام میں ماسٹر مائنڈ تھا۔ مجھے اس کام سے محبت تھی اور یہی محبت میرے مالک کو نظر بھی آ گئی۔ صرف ایک مہینے میں ہی میں مالک کا سب سے پسندیدہ مزدور بن گیا تھا۔ وہ باقی لڑکوں سے زیادہ پیسے مجھے دینے لگا۔

تمام لڑکے چار بجے چھٹی کر کے کمروں میں چلے جاتے جہاں ٹی وی اور سی ڈی رکھا ہوتا تھا جبکہ مجھے ٹی وی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ میں بھیڑوں کی طرف نکل جاتا۔ مجھے بکریوں کی بچے بہت پیارے لگتے تھے۔ میں شام کو ان کو اٹھاتا رہتا تھا۔ ماں بننے والی بھیڑوں اور بیمار ہونے والی بھیڑوں کا میں بہت خیال رکھتا تھا۔ میں اس کام کو جانتا تھا اور دیسی ٹوٹکوں کی مدد سے بھیڑوں کا خیال رکھتا تھا۔ یہ سارا کام میں نے بچپن سے اپنے والد سے سیکھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ؛

''بیٹا! ان جانوروں اور سبزیوں سے محبت کرنا سیکھ لو۔ دنیا کے کسی کونے میں بھی چلے جاؤ تو کبھی بھوکے نہیں مرو گے'' اور میں نے محبت کرنا سیکھ لی تھی اور یہی محبت یہاں پر بھی میرے کام آ رہی تھی۔

مالک اب میرا بہت خیال رکھنے لگا تھا۔ اس نے تھانے میں لے جا کر میرا پرمٹ بھی بنوا دیا تھا۔ اب میں آسانی سے ہر جگہ جا سکتا تھا اور میں گاؤں میں گھومنے لگا۔ یہاں پر بھی کچھ لوگ تھے جن کے کانٹیکٹ آگے ایجنٹوں سے تھے۔ وہی ایجنٹ جو سلماس کی ڈنکی لگوا کر بارڈر کراس کرواتے تھے۔

''راضی بھائی! آپ ایجنٹوں کا پوچھتے رہتے ہو کیا آپ کا ارادہ آگے ترکی جانے کا تو نہیں ہے؟'' احمد نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

احمد اٹھارہ سال کا لڑکا تھا اور اسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ غریب اور والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔ باپ کی پانچ ایکڑ زمین تھی۔ قریباً سو کے قریب بھیڑیں رکھی ہوئی تھیں۔ احمد کا باپ ان بھیڑوں کو وادی میں چراتا تھا۔ زمین پر یہ لوگ بھیڑوں کا چارا اور گندم کاشت کرتے تھے۔ احمد کو بھی آگے جرمنی جانے کا بہت شوق تھا۔ جرمنی ایران کو ویزہ جاری نہیں کرتا تھا بلکہ معاشی پابندیوں کی وجہ سے کوئی بھی یورپی ملک ایران کو ویزہ نہیں دیتا تھا۔ اس لئے وہ غیر قانونی

طریقے سے ترکی کا بارڈر کراس کرنا چاہتا تھا تا کہ آگے یونان اور پھر جرمنی جا سکے۔

ایران معاشی طور پر مضبوط ملک ہے۔ یہاں کے لوگ غیر قانونی طریقے سے باہر نہیں جاتے بلکہ بیرون ملک جا کر مزدوری نہیں کرتے ہیں۔ بہت کم ایسے لوگ ہیں جن کو ایران سے باہر نکلنے اور باقی دنیا کو دیکھنے کا شوق ہوتا ہے۔ احمد بھی انہی لوگوں میں سے تھا۔ اس کی انگلش بہت اچھی تھی اور اسی انگلش کی وجہ سے وہ میرا دوست بن گیا تھا۔

''ہاں یار! میں آگے جانا چاہتا ہوں۔ زندگی یہاں نہیں ہے بلکہ ان پہاڑوں سے آگے ہے۔'' میں نے ترکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''راضی بھائی! جانا تو میں بھی چاہتا ہوں، بس تھوڑا انتظار کر رہا ہوں۔ ابھی سیزن ہے۔ ہر روز ادھر سے بارڈر کراس ہو رہا ہے اس لئے سختی بھی بہت زیادہ ہے۔ سردی آ گئی ہے، اگلے مہینے جب برف پڑنی شروع ہو گی تو بارڈر کراس کرنا آسان ہو گا۔ اس وقت سختی بھی نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔'' اس نے پہاڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''راضی بھائی! ترکی والے بہت نازک مزاج ہوتے ہیں۔ وہ برف میں کہاں چل سکتے ہیں؟ یہ ہم شیروں کا ہی کام ہے۔'' اس نے فخر سے کہا تو میں مسکرانے لگا۔

''یار! یہ کتنے پیسے لیتے ہیں بارڈر کراس کروانے کا؟ میں بھی پانچ چھ مہینوں میں پیسے اکٹھے کروں گا۔ سردی ختم ہونے کے فوراً بعد گرمیوں میں بارڈر کراس کروں گا۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے اسے اپنے ارادے کا اظہار کیا تو وہ مسکرا دیا۔

''راضی بھائی! یہاں سے ایجنٹ بارڈر کراس کروانے کا ساٹھ ہزار لیتے ہیں لیکن ایک ایجنٹ میرے چاچا کا دوست ہے مجھے تو وہ فری میں لے کر جا رہا ہے، آپ کی میں بات کر لوں گا۔ آپ میرے بھائی ہو، زیادہ پیسے نہیں ہوں گے۔'' اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔

''راضی بھائی ٹینشن مت لو! آپ میرے بھائی ہو اور میں اپنے بھائی کے لیے سب کچھ کروں گا۔'' اس نے میری کمر پر تھپکی دیتے ہوئے کہا اور میں مطمئن ہو گیا۔ احمد واقعی بہت تیز ثابت ہوا۔ دوسرے دن میں کھیت میں کام

کر رہا تھا اور وہ وہیں آ گیا۔

''راضی، راضی!'' وہ کھیت کے کنارے کھڑا آوازیں دینے لگا۔ میں نے پالک کاٹنے والی چھری کریٹ کے اندر رکھی اور کھیت سے باہر آ گیا۔

''ہاں یار! کیا بات ہے، اتنے خوش کیوں ہو رہے ہو؟''

''راضی بھائی! میری بات ہوئی ہے۔ بیس ہزار میں کام ہو جائے گا، میرے ابو بھی مان گئے ہیں لیکن وہ سلماس کی بجائے ماکو سے جانے کا بول رہے ہیں کیونکہ وہاں کی ڈنکی آسان ہے۔ میرے چچا کا دوست ادھر سے ہی ڈنکی لگوا رہا ہے۔ پیسے ادھر میرے چچا کے پاس ہی ہیں۔ جس دن ہم بارڈر کراس کر لیں گے اسی دن یہ پیسے ابو کو دے دیں گے اور پھر ابو پیسے آگے ایجنٹ کو دے دیں گے۔''

''راضی بھائی! آپ ترکی جا رہے ہیں اور میں جرمنی جاؤں گا۔ بہت بڑا اور بہت امیر ملک ہے بھائی! ایک دن میں جرمنی کی گلیوں میں گھوم رہا ہوں گا۔'' اس نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔ آج اس کی بجائے میں جرمنی میں بیٹھا ہوا ہوں۔ پتہ نہیں کیوں آج یہ الفاظ لکھتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو آ رہے ہیں۔ جرمنی جانے کی خواہش اس کی تھی، جرمنی کی گلیوں میں گھومنے کی آرزو وہ دل میں لئے پھرتا تھا لیکن اس کی قسمت میں جرمنی لکھا ہی نہیں تھا۔ جرمنی آنے کی میری بھی خواہش تھی بلکہ میں جرمنی سے بھی آگے جانا چاہتا تھا۔

اس ملک نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ دنیا کا یہ امیر ترین ملک خلوص اور محبت میں بھی بہت آگے ہے۔ جو آدمی بھی ایک بار اس ملک میں آ جاتا ہے اس کا پھر کہیں اور جانے کو دل ہی نہیں کرتا۔ ایمان کی خواہش اگر امریکہ نہ ہوتی تو میں کبھی بھی اس ملک کو چھوڑنے کا نہ سوچتا۔ جرمنی جانے کا جنون احمد کو تھا اور وہ جنون میں بہت آگے آ چکا تھا۔

''راضی بھائی! اب تو ابو بھی مان گئے ہیں، ہم ایک دو دن میں ادھر سے نکل جائیں۔'' اس نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔ میری ایک مہینے کی تنخواہ اور تہران اور تبریز کی سبزی منڈیوں میں کام کے پیسے ملا کر میرے پاس تقریباً پندرہ ہزار کے قریب رقم تھی۔

''یار! میرے پاس پندرہ ہزار روپے ہیں۔ مزید دو ہفتے اور کام کروں گا تو پیسے بن جائیں گے۔ آپ صرف دو ہفتے اور انتظار کر لو پھر اکٹھے ہی چلیں گے۔''

''راضی بھائی! میں ابو کو کہتا ہوں وہ پانچ ہزار روپے آپ کو دے دیں گے۔ کوئی بات نہیں آپ بھائی ہو ہمارے!'' اس نے جلدی سے کہا لیکن میں نے انکار کر دیا۔

وہ اتنے امیر لوگ نہیں تھے۔ ان سے پانچ ہزار لینا میرے ضمیر کو گوارہ نہیں تھا۔ ویسے بھی تھوڑی مزید سردی ہو جاتی تو ڈنکی لگانا آسان ہو جاتا۔ سردی میں اتنی زیادہ سختی بھی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے اس کو سمجھایا تو وہ مان گیا اور میں واپس کھیت میں آ کر پالک نکالنے لگا۔ ہفتے میں تین دن گزر گئے اور دو ہفتے مکمل ہونے میں باقی گیارہ دن رہ گئے تھے۔ دن ایک ایک کر کے گزرتے رہے۔ آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب ہم نے جانے کی تیاری کرنی تھی۔ اس دن میں نے ساری تنخواہ اور پیسے اپنے مالک کے سپرد کئے۔ میرے بارڈر کراس کر جانے کی صورت میں وہ یہ پیسے احمد کے والد کو دیتا اور احمد کے والد یہ پیسے ایجنٹ کے حوالے کر دیتے۔

احمد مجھے لے کر ماکو آ گیا۔ ماکو سے ہمیں احمد کے چچا کے ایجنٹ نے رسیو کیا اور کار میں بٹھا کر ہمیں بارڈر کے بالکل نزدیک ایک پرانے سے مکان میں لے گیا۔ یہاں پر ہم سے پہلے قریباً ساٹھ کے قریب لڑکے بیٹھے ہوئے تھے اور ان ساٹھ لڑکوں میں پچاس لڑکے پاکستانی تھے۔ کچھ افغانی اور دو لڑکے ان میں بنگالی بھی تھے۔ یہ ویزے پر پاکستان آئے تھے اور پھر آگے ڈنکی شروع کر دی تھی۔ میں ایک بار پھر اپنے لوگوں میں آ گیا تھا۔

مجھ سے دو مہینے پہلے جو لڑکے میرے ساتھ تہران تک آئے تھے ان کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ شاید وہ یونٹ پہنچ گئے ہوں گے یا پھر واپس پاکستان ڈی پورٹ ہو گئے ہوں مجھے ان کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ ان ساٹھ لڑکوں میں صرف احمد ہی ایرانی تھا اور اس وقت اپنے ہی ملک میں مہاجر بنا ہوا تھا۔ جرمنی جانے کا جنون اسے اپنے ہی ملک میں مہاجر بنائے ہوئے تھا۔

''راضی بھائی! جو آدمی اپنی قسمت سے لڑتا ہے وہی زندگی میں کامیاب ہوتا ہے۔ مہاجر کی زندگی بہت مشکل ہوتی ہے اور ہم اپنی مرضی سے اس زندگی کو چنتے ہیں۔ بڑے خواب کے لئے قربانی بھی بڑی دینی پڑتی ہے۔'' میں ایک چھوٹے سے بیگ کو سر کے نیچے رکھ کر لیٹا ہوا تھا اور احمد میرے سینے پر سر رکھ کر دوسری طرف لیٹا ہوا تھا۔

''احمد بھائی! جرمنی اور امریکہ میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو شاید ہمارے درد کا احساس نہیں ہے۔ ایک اچھے مستقبل کی آس ہی ہمیں ان پہاڑوں کو عبور کرنے پر مجبور کرتی ہے ورنہ کس کا دل کرتا ہے ان پہاڑوں میں دھکے کھانے کو؟'' میں نے احمد کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''جی بھائی! دیکھ لینا، ایک دن آپ کا بھائی دیوارِ جرمن کے اوپر کھڑا ہو کر تصویریں بنوائے گا۔''

ہم ایسے ہی ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے اور تھوڑی دیر بعد ہی احمد کو نیند آ گئی اور وہ دنیا کی ہر فکر سے آزاد میرے سینے پر سر رکھے سو رہا تھا۔ رات کو چھ بجے کے قریب پانچ ڈنکر آ گئے اور نہوں نے ہمیں ایک ڈالے میں ڈالا اور لے کر بارڈر کی طرف روانہ ہو گئے۔ گاڑی صرف آدھا گھنٹہ ہی چلی اور پھر ہمیں ایک پہاڑ کی روڈ پر چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ یہاں پر ہم نے مزید دو گھنٹے رات کا اندھیرا چھانے کا انتظار کیا اور آٹھ بجے کے قریب جب اندھیرا چھا گیا تو ہم وہاں سے آگے پیدل چل پڑے۔

ماکو کی طرف سے پڑنے والا یہ بارڈر بھی پہاڑی علاقہ تھا لیکن یہ آباد تھا۔ بارڈر کے دونوں طرف دیہات تھے اور ہم رات کے اندھیرے میں تیزی سے آگے بڑھتے رہے۔ یہاں سے بارڈر چھ گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ بارڈر کراس کرنے کے بعد مزید چار گھنٹے ترکی کے اندر داخل ہونے کے بعد گاڑی آتی تھی جو دوگو بیاز لے جاتی۔ دوگو بیاز سے آگے پھر استنبول کی طرف سفر شروع ہو جاتا۔

یہاں پر سب لڑکے ٹھیک تھے اور تیزی سے آگے کی طرف سفر کر رہے تھے کیونکہ یہ لڑکے پاکستان سے مختلف ڈنکیاں لگا کر یہاں پہنچے تھے اس لئے اب پیدل سفر کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ جو کمزور لڑکے ہوتے ہیں اور سفر کی مصیبتیں نہیں سہہ سکتے وہ واپس چلے جاتے ہیں۔ 100 میں سے 50 لڑکے ہی آگے پہنچتے ہیں۔ باقی ڈی پورٹ ہو جاتے ہیں اور دوبارہ پھر آگے کی طرف بڑھتے ہیں۔ البتہ ترکی پہنچتے ہی ڈی پورٹ ہونے کی شرح کم ہو جاتی ہے۔ ترکی تک ایجنٹوں کے ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ لگ چکے ہوتے ہیں اس لئے گیمیں بہت زیادہ سیف ہو جاتی ہیں اور پیسے بھی بڑھ جاتے ہیں۔

صرف یونان کا بارڈر کراس کروانے کا اس وقت تین لاکھ روپیہ لیتے تھے۔ وہاں پیمنٹ یورو میں دی جاتی تھی اور اس ٹائم ایک یورو قریباً 75 سے 77 روپے کا آتا تھا۔ آج تو یورو 120 کے قریب پہنچ گیا ہے۔ یورو نے مسلسل آگے کی طرف ترقی کی ہے اور ہمارے پاکستانی روپے نے پیچھے کی طرف۔

ہم پچاس کے قریب لڑکے مسلسل آگے کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ احمد نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور ہم دونوں ایک دوسرے کا سہارا بنے ہوئے تھے۔ احمد اٹھارہ سال کا نوجوان لڑکا تھا اور بہت تیز تھا جبکہ میں اس سے دو سال بڑا تھا اور اسی دو سال کا فائدہ اٹھا کر اس سے بڑے بھائیوں جیسا ہی سلوک کرتا تھا۔ ہمیں چلتے ہوئے دو گھنٹے

سے زیادہ وقت ہو گیا تھا جب پہلے فائر کی آواز سنائی دی۔

ڈنکروں نے جلدی سے ہمیں نیچے بیٹھنے کو کہا تو ہم تیزی سے زمین پر بیٹھ گئے۔ اب کی بار دوسرا فائر ہوا اور ہم سب لڑکوں کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ بارڈر ابھی چار گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ یہ ترکی کی فورسز نہیں تھیں اور نہ ہی ایرانی فورسز تھیں۔ ایران والے ترکی کے بارڈر پر گولی نہیں چلاتے تھے بلکہ صرف پاکستانی بارڈر پر گولی چلاتے تھے۔ یہی حالات آگے یونان کے بارڈر پر ہوتے تھے۔ ترکی صرف ایران کے بارڈر پر گولی استعمال کرتا ہے یا پھر عراق کے بارڈر پر، یونان کے بارڈر پر گولی نہیں چلتی۔ اس بارڈر پر دونوں طرف کوئی بھی انسانی حقوق کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

اب کی بار اکٹھی تین گولیاں فائر ہوئیں۔ یہ کرد قبائل سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ ان دنوں ترکی نے کافی سختی کر دی تھی اور ڈنکیاں زیادہ تر سلماس کی طرف سے چل رہی تھیں۔ یہ ایک مہینے میں تیسری ڈنکی تھی جو ماکو کی طرف سے لگائی جا رہی تھی۔ ڈنکیاں اگر مسلسل چلتی رہیں تو کرد بھی حملہ کر کے ہفتے میں ایک آدھ ڈنکی لے جانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

اب تو پورے مہینے سے ان لوگوں کے ہاتھ کوئی لڑکا نہیں لگا تھا اس لئے وہ ہر قسم کی احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر لڑکوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ورنہ یہ کرد لوگ ہمیشہ ناکام واپس آنے والی ڈنکی کو ہی پکڑتے تھے۔ بارڈر کی طرف جانے والے قافلے کو یہ لوگ نہیں روکتے تھے کیونکہ ڈنکیاں کامیاب ہوتیں تو ہی مزید لڑکے ادھر سے بارڈر کراس کرتے۔ اگر کوئی بھی ادھر سے بارڈر کراس نہ کر سکے تو کوئی اور ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ اسی وجہ سے یہ لوگ بارڈر کی طرف جانے والوں کو نہیں روکتے تھے بلکہ صرف ناکام لوٹنے والوں کو پکڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ چونکہ ایک مہینے سے بارڈر سیل تھا اس لئے ان کے ہاتھ بھی کچھ نہیں آیا تھا اور آج یہ کرد پرانے اصولوں کو بھول کر صرف لڑکے اغوا کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

ہمارے ڈنکر بڑی دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے۔ مجھے ان کی زبان تو نہیں آتی تھی لیکن احمد ان کی باتیں سمجھ رہا تھا اور گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ کی گرفت میرے ہاتھ پر زیادہ مضبوط ہو رہی تھی۔

”کیا بات ہے احمد! معاملہ زیادہ خراب ہے؟ میں نے احمد سے سرگوشی میں پوچھا۔

''جی راضی بھائی! یہ لوگ بھی آگے سے فائرنگ کا جواب دینے کا کہہ رہے ہیں۔ان کے پاس بھی اسلحہ موجود ہے۔

احمد ابھی اپنی بات بھی مکمل نہیں کر پایا تھا جب ہمارے ایک ڈنکر نے رائفل کا منہ آسمان کی طرف کر کے ایک برسٹ مار دیا۔فضا رائفل کی تھرتھراہٹ سے گونج اٹھی لیکن دوسری طرف والے بھی آج فیصلہ کر کے ہی آئے تھے۔ اب کی بار وہاں سے اکٹھی چار رائفلوں کے برسٹ آئے اور سیدھے ہمارے اوپر کی پہاڑی پر لگے۔گولیاں پہاڑی سے ٹکرائیں تو پتھر ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے اور نیچے بیٹھے ہوئے لڑکوں کے سروں میں لگنے لگے۔

لڑکے پہلے ہی ڈرے ہوئے تھے۔پتھروں کی وجہ سے کھڑے ہو گئے اور ان سے بچنے کے لئے ایک طرف ہونے لگے۔اتنی دیر میں مزید برسٹ آ کر پہاڑی میں لگے اور اب کی بار آواز بہت زیادہ تھی کیونکہ ایک ساتھ کم از کم دس رائفلوں کی آوازیں تھیں۔لگا تار برسنے والی گولیوں نے پہاڑی کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ایسے لگ رہا تھا جیسے پوری پہاڑی ہی ٹوٹ کر نیچے گر جائے گی۔لڑکے جان بچانے کے لئے پیچھے کی طرف بھاگنے لگے۔احمد مجھے لے کر بھاگنے لگا لیکن میں ڈنکروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

مجھے معلوم تھا یہ فائرنگ صرف لڑکوں کو بکھیرنے کے لئے ہے۔ہم بھی اگر ایسے بھاگنے لگے تو ان کردوں کے ہاتھ لگ جائیں گے۔اس لئے میں ڈنکروں کا انتظار کرنے لگا۔ڈنکروں نے لڑکوں کو بھاگتے دیکھا تو ان کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگے۔کردوں نے جب لڑکوں کو بھاگتے دیکھا تو وہ بھی پہاڑی سے نیچے آ گئے اور بھاگنے والے لڑکوں کو پکڑنے لگے۔

فائرنگ کی آوازیں اب ہر طرف سے آ رہی تھیں اور لڑکے مکمل طور پر بکھر گئے تھے۔میں نے احمد کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور ہم دونوں مسلسل ایک ڈنکر کا پیچھا کر رہے تھے۔مجھے معلوم تھا کہ ڈنکر ہی زندگی ہے اس کے پیچھے چلیں گے تو بچ جائیں گے ورنہ کرد پکڑ کر لے گئے تو پھر زندگی عذاب ہو جائے گی۔

میرے پاس میرے گھر والوں یا گاؤں کے کسی بھی شخص کا رابطہ نمبر نہیں تھا۔مجھے کسی کا نمبر پتہ ہی نہیں تھا اور نہ ہی میں نے کسی سے رابطہ کیا تھا۔میرے گھر والوں کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے جو وہ تاوان کی رقم ادا کر سکتے اس لئے مجھے ہر حالت میں ان کردوں کے ہاتھ آنے سے بچنا تھا۔کرد پکڑ لیتے تو میری منزل مجھ سے بہت دور ہو جاتی۔

اچانک ایک پتھر سے احمد کا پاؤں ٹکرایا اور وہ زمین پر گر گیا۔ چونکہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اس لئے میں بھی اس کے ساتھ ہی زمین پر گر گیا۔ پتھریلی زمین پر گرتے ہی میرا سر ایک پتھر سے ٹکرایا اور ایک پل کے لئے میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا لیکن دوسرے ہی پل میں سنبھل گیا۔ ڈنکر ہم سے چند قدم کے فاصلے پر دوڑ رہا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ احمد کا ہاتھ میرے ہاتھ سے نکل گیا اور مجھے اس کی چیخ کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور احمد کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھڑا ہونے میں مدد کرنے لگا۔ اتنی دیر میں ڈنکر ہم سے بہت دور نکل گیا تھا۔

''احمد جلدی کرو! ہمیں اس ڈنکر کے پیچھے جانا ہے ورنہ کردوں کے ہاتھ لگ جائیں گے۔'' میں احمد کو اپنے ساتھ لے کر بھگانے لگا۔

''راضی بھائی! میں بھی تو کرد ہوں، آپ نے ایک کرد کا ہاتھ پکڑا ہوا ہے۔'' اس نے میرے ساتھ بھاگتے ہوئے کہا۔ احمد خود بھی ایک کرد تھا۔ ایران اور ترکی کے بارڈر پر تقریباً سارے دیہات ہی کردوں کے ہیں۔

''میں دوسرے والے کردوں کی بات کر رہا ہوں۔ جو لڑکوں کو اغوا کرتے ہیں اور مار مار کر ان کے گھر والوں سے تاوان وصول کرتے ہیں۔ تم اچھے والے کرد ہو!'' میں نے احمد کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور اس کے ساتھ بھاگتا ہوا ڈنکر کو ڈھونڈ رہا تھا۔ ہم دونوں ایسے ہی پندرہ بیس منٹ تک مختلف سمتوں میں بھاگتے رہے اور مکمل طور پر راستہ بھول گئے تھے۔

''یار! ڈنکروں کو تو ہم نے دھوکا دیا ہے اور اگر ایسے ہی بھاگتے رہے تو پکڑے جائیں گے، اب کہیں چھپتے ہیں اور صبح ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔'' میں نے رفتار کم کی اور ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔

''جی! یہی ٹھیک ہے، صبح کا انتظار کرتے ہیں۔ صبح حالات ٹھیک ہوں گے۔'' احمد نے میری رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا اور میں اسے لے کر ایک طرف بڑھ گیا۔

اب ہم دونوں کو کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش تھی۔ ہم دونوں ایک پہاڑی کے کنارے سے گزر رہے تھے جب اچانک سات آٹھ آدمیوں نے ہم پر دھاوا بول دیا۔ وہ ایک جھاڑی کے اندر چھپے ہوئے تھے اور ہمارے نزدیک آتے ہی انہوں نے حملہ کر کے ہمیں پکڑ لیا۔ ان کے پاس رسیاں تھیں اور انہوں نے رسی کی مدد سے ہم دونوں کے

ہاتھ اور پاؤں مضبوطی سے باندھ دیئے۔ احمد زور زور سے چیخیں مار رہا تھا۔ انہوں نے ایک کپڑے سے ہمارے منہ بھی مضبوطی سے باندھ دیئے۔

میں بے بسی سے احمد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ منزل ایک بار پھر دور ہو گئی تھی۔ درد اور اذیت کے دن ایک بار پھر شروع ہو گئے تھے۔ ان لوگوں نے ہمیں کندھوں پر اٹھایا اور چلنا شروع ہو گئے۔ بیس پچیس منٹ سفر کرنے کے بعد ایک گاڑی نظر آ گئی۔ گاڑی میں پہلے بھی دس بارہ لڑکے بندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہم دونوں کو بھی گاڑی میں ڈال دیا۔ ہم سارے لڑکے ایک دوسرے کے اوپر بندھے ہوئے لیٹے ہوئے تھے۔ ہمیں لے کر آنے والے کر دے ہمیں چھوڑ کر ایک بار جنگل میں چلے گئے۔ ہمیں ادھر مزید ایک گھنٹے تک رکھا گیا۔ اسی دوران مزید آٹھ لڑکے لائے گئے۔ صبح پانچ بجے کے قریب گاڑی ہمیں لے کر ایک پرانی حویلی میں آ گئی۔

اس دن ٹوٹل پچاس لڑکوں میں سے پینتیس لڑکے پکڑے گئے تھے۔ صرف پندرہ خوش قسمت لڑکے ان سے بچ گئے تھے۔ دوسرے دن مزید چھ لڑکے پکڑے گئے تھے۔ اس طرح ٹوٹل اکتالیس لڑکے پکڑ لئے گئے۔ اس گھر میں صرف دس لڑکے ہی رکھے گئے تھے۔ باقی اکتیس لڑکوں کو دوسری گاڑیوں میں ڈال کر کہیں اور منتقل کر دیا گیا۔ میرے خیال میں چار پارٹیوں نے مل کر حملہ کیا تھا اور دوسرے دن سب لڑکوں کو برابر تقسیم کر کے اپنے اپنے گھر لے گئے تھے۔ یہاں میرے اور احمد سمیت صرف دس لڑکے ہی رہ گئے تھے اور ابھی تک بندھے ہوئے تھے۔ کسی نے ہمیں کھولنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔

منہ بندھے ہونے کی وجہ سے ہماری چیخیں تو سنائی نہیں دے رہی تھیں لیکن آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر ختم ہو گئے تھے۔ ہم لڑکے ایک دوسرے کو حسرت کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ آنے والے وقت کا خوف لڑکوں کے چہروں پہ ثبت ہو گیا تھا۔ ایک اچھے مستقبل کے لئے پردیس جا رہے تھے لیکن یہ مستقبل ایک بار پھر تاریک ہو گیا تھا۔ یہ کر دے اذیت دینے میں بہت مشہور تھے۔ ایسی ایسی ایذائیں دیتے تھے کہ انسان کی روح بھی تڑپنے لگتی تھی۔ یہ جانور تھے اور پیسے کی خاطر کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے۔ ہم سب لڑکے آنے والے وقت کے خوف سے کانپ رہے تھے۔

دن کو تقریباً دس بجے کے قریب پانچ آدمی اندر آ گئے اور انہوں نے لڑکوں کو مارنا شروع کر دیا۔ ان کے پاس بجلی کی باریک تاریں تھیں اور وہ پوری طاقت سے لڑکوں کو مار رہے تھے۔ وہ لڑکوں پر اپنی دہشت بٹھا رہے تھے

تا کہ ان سے صحیح موبائل نمبر لے کر ان کے گھروں میں اطلاع کر کے تاوان کی رقم کی ڈیمانڈ کر سکیں اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو رہے تھے۔ صرف پانچ منٹ میں ہی انہوں نے ہم کو مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا۔ ہماری جیکٹیں انہوں نے اتروالی تھیں اور کپڑے پھٹنا شروع ہو گئے تھے۔

باریک تار کی وجہ سے جسم کی کھال اتر گئی تھی اور ہمارے سارے کپڑے لہولہان ہو گئے تھے۔ منہ بند ہونے کی وجہ سے ہماری چیخیں نہیں نکل رہی تھیں لیکن پورا جسم لرز رہا تھا اور ہماری سانسیں رک رک کر چل رہی تھیں۔ آخر انہوں نے مارنا بند کیا اور پہلے لڑکے کے منہ سے پٹی ہٹائی۔

پٹی ہٹتے ہی لڑکے نے زور زور سے چیخیں مارنا شروع کر دیں تو انہوں نے پھر سے لڑکے کو مارنا شروع کر دیا۔ وہ لڑکے کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کو خاموش کروا رہے تھے۔ دو منٹ کی مزید مار نے لڑکے کو بے ہوش کر دیا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز زمین پر لیٹ گیا۔ وہ اپنے ہوش و ہواس کھو بیٹھا تھا۔ ان لوگوں نے لڑکے کو ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچا اور کمرے کے ایک کونے میں پھینک دیا۔

''تم میں سے کوئی بھی لڑکا چیخ نہیں مارے گا! بس خاموشی سے اپنے گھر والوں کا رابطہ نمبر لکھواؤ، ہم آپ کی بات آپ کے گھر والوں سے کروائیں گے۔ وہ پیسے دے دیں تو ہم آپ کو چھوڑ دیں گے۔'' ان پانچ آدمیوں میں سے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر اردو میں کہا۔ اس کی اردو اتنی اچھی نہیں تھی۔ وہ فارسی تھا لیکن اس نے اردو زبان نارمل سیکھی ہوئی تھی۔

''ٹھیک ہے؟'' اس آدمی نے تقریر کرنے والے انداز میں کہا اور پھر انہوں نے ایک ایک کر کے لڑکوں کے منہ سے کپڑے ہٹانے شروع کر دیئے۔ وہ ہر لڑکے کے منہ سے کپڑا ہٹاتے، فون نمبر لکھتے اور اسے ایک طرف کر کے دوسرے لڑکے کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ میری باری احمد سے پہلے آ گئی۔ ایک آدمی نے میرے منہ سے کپڑا ہٹایا۔

''ہاں بھئی! پاکستان کے کس علاقے سے آئے ہو اور اپنا گھر کا فون نمبر بھی دے دو۔ زیادہ پیسے نہیں مانگیں گے، صرف پانچ سو ڈالر ہی مانگیں گے۔ آج پیسے مل جائیں گے تو کل کو تم سب کو چھوڑ دیا جائے گا۔''

وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ پانچ سو ڈالر کی بجائے وہ لوگ دس ہزار ڈالر مانگتے تھے۔ جو کہ پاکستانی روپوں میں تقریباً ساڑھے چھ لاکھ روپے بنتے تھے۔ پانچ سو ڈالر صرف ہمیں مطمئن کرنے کے لئے کہہ رہے تھے تا کہ ہم آسانی

سے صحیح نمبر دے دیں۔

''میں بہاولپور کا رہنے والا ہوں۔ پاکستان کے صوبہ پنجاب سے تعلق رکھتا ہوں لیکن پاکستان میں میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ میں یہاں سلماس کے قریب ایک گاؤں کے کھیتوں میں کام کرتا ہوں۔'' میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ان لوگوں نے مجھے مارنا شروع کر دیا۔

میں خاموشی سے ان کی تاریں سہتا رہا۔ مجھے معلوم تھا وہ کبھی بھی میری بات کا یقین نہیں کریں گے اور یہ مار اب مجھے اگلے کئی دنوں تک ایسے ہی برداشت کرنی پڑے گی۔ میں خاموشی سے ان کی تاریں سہتا رہا۔ منہ سے سسکیوں کی آوازیں نکل رہی تھیں اور میرا جسم بھی مار کھانے سے ادھڑ گیا تھا۔ اب کی بار میرے چھلے ہوئے زخموں پر پھر زخم پڑ رہے تھے۔ مزید چار پانچ منٹ کی مار سہتے سہتے میرے حواس جواب دے گئے اور میں بے ہوش ہو گیا۔

شاید خدا نے انسان کے اندر بے ہوش ہونے کی صلاحیت صرف اسی وجہ سے رکھی ہوتی ہے۔ کسی بھی چیز کو بقا نہیں ہے۔ خدا کے علاوہ ہر چیز ختم ہو جاتی ہے تو درد اور اذیت کیسے ہمیشہ رہ سکتی ہے؟ اس کو ختم کرنے کے لئے خدا نے بے ہوشی بنا دی تھی۔ جب بہت زیادہ درد محسوس ہونا شروع ہو جاتا ہے تو دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ صرف ہمارا دماغ ہی درد محسوس کرتا ہے اور ہمیں درد اور تکلیف ہوتی ہے لیکن یہی دماغ جب بہت زیادہ کام کر کے تھک جاتا ہے تو کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ اسی کو بے ہوشی کہتے ہیں اور اسی بے ہوشی میں بعض اوقات انسان مر بھی جاتا ہے۔

میں بے ہوش ہو گیا تھا اور ان لوگوں نے مجھے ایک طرف کر دیا۔ اب وہ لوگ دوسرے لڑکے کی پٹی کھول کر اس سے نمبر لکھوا رہے تھے۔ میری بے ہوشی صرف دو تین منٹ کی ہی تھی۔ میں پھر ہوش میں آ گیا تھا اور اب زمین پر تڑپ رہا تھا۔ میرے پھٹے ہوئے جسم سے خون نکل نکل کر نیچے زمین کو سرخ کر رہا تھا اور میں حسرت سے احمد کی طرف دیکھ رہا تھا جو پہلے ہی میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں عجیب سی بے بسی اور شرمندگی مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ مجھے ماکو لے کر آیا تھا۔ اس کے چچا کا دوست ایجنٹ تھا اور مجھے احمد ہی اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ اپنے آپ کو قصوروار سمجھ رہا تھا کہ میں اس کی وجہ سے یہاں ان کردوں کے ہاتھ لگ گیا ہوں۔ میری حالت سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرے پاس دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔

ایک لڑکے نے اپنے گھر کا نمبر لکھوا دیا تو اگلی باری احمد کی تھی۔ اردو بولنے والے نے اس کے منہ سے پٹی ہٹائی اور اردو میں اس سے پوچھنے لگا۔

''ہاں تو لڑکے! تم کہاں سے آئے ہو؟ اپنے گھر والوں کا نمبر لکھوا دو، کل تک آزاد ہو جاؤ گے۔'' وہ اردو میں اس سے بات کر رہا تھا۔ وہ لوگ احمد کو بھی پاکستانی سمجھ رہے تھے۔

احمد آگے سے فارسی میں بولنے لگا تو ان لوگوں کے چہروں پر پریشانی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ ان پانچوں میں سے ایک آدمی جوان کا سرغنہ لگ رہا تھا اس نے احمد سے فارسی میں گفتگو کرنی شروع کر دی۔ احمد بار بار میری طرف اشارہ کر رہا تھا۔ درمیان میں اردو بولنے والا آدمی بھی حصہ لے لیتا تھا۔ وہ اب میرے بارے میں بات کر رہے تھے۔ تقریباً پندرہ بیس منٹ تک یہ گفتگو ہوتی رہی اور اس کے بعد وہ آدمی دو اور آدمیوں کو لے کر باہر نکل گیا۔ اب یہاں پر اردو بولنے والا ایک اور آدمی رہ گیا تھا۔

احمد کے بعد پیچھے صرف ایک لڑکا رہ گیا تھا۔ انہوں نے اس لڑکے سے بھی نمبر لکھا اور سارے ہی کمرے سے باہر نکل گئے۔ ہمارے ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے لیکن منہ کھلے ہوئے تھے۔ میرے اور احمد کے علاوہ سارے لڑکے ہی سسک رہے تھے لیکن چیخنے کی جرأت کوئی نہیں کر رہا تھا۔ لڑکے ڈر رہے تھے کہ اگر کوئی چیخ ان کو سنائی دے گئی تو وہ پھر سے مارنے کے لئے آ جائیں گے۔

میں احمد کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا کیونکہ مجھے احمد کی آنکھوں میں دیکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ہم دونوں کردوں کے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔ اس میں اس بے چارے کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ تو اچھا کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ہماری قسمت میں ہی شاید یہی کچھ لکھا تھا۔

''راضی بھائی! مجھے معاف کر دو، آپ میری وجہ سے یہاں پھنس گئے ہو۔'' اس نے شرمندگی سے کہا تو میں تڑپ اٹھا۔

''نہیں یار! نہیں، تم میرے چھوٹے بھائی ہو اور یہ تمہارا قصور نہیں ہے۔ میری قسمت میں ہی یہ سب کچھ لکھا ہوا ہے۔ خوشی مجھے کبھی راس ہی نہیں آئی۔ پچھلے چھ سال سے ایک ایک لمحہ تڑپ تڑپ کر گزار رہا ہوں، یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ نہیں یار! یہ تمہارا قصور نہیں ہے بلکہ یہ میری قسمت ہے جو تجھے بھی آج میرے ساتھ لے ڈوبی ہے۔'' میں نے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اٹھارہ سال کے اس چھوٹے سے نوجوان کی بے بسی دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ اپنے ہی ملک میں مہاجر بنا تھا اور اب ہمارے ساتھ اغوا بھی ہو گیا تھا۔

''بھائی! میں نے ان سے بات کی ہے، اپنے گاؤں کا پتہ بھی دے دیا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں ہم بھی کرد ہیں۔ میری فیملی بہت بڑی ہے۔ آج شام تک یہ لوگ ہمیں چھوڑ دیں گے۔'' میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ وہ کرد تھا اور شاید اسے چھوڑ دیں کیونکہ وہ اسی علاقے کا رہنے والا تھا جبکہ مجھے وہ کسی بھی حالت میں نہ چھوڑتے۔ میری پوری رقم وہ وصول کر کے ہی چھوڑتے۔

شام کے قریب وہ لوگ واپس آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی احمد کو پکڑ لیا اور اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے باہر لے جانے لگے۔ وہ لوگ احمد کو رہا کر رہے تھے۔ احمد چونکہ اسی علاقے کا تھا اور اس کے گھر والے سارے علاقوں کے ایجنٹوں کو جانتے تھے۔ وہ احمد کو تلاش کر رہے تھے۔ یہ لوگ احمد کا تاوان کبھی بھی وصول نہیں کر سکتے تھے اس لئے وہ اس کو چھوڑنے میں ہی اپنی بھلائی سمجھ رہے تھے۔

احمد ان سے لڑنے لگا وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن وہ لوگ اس بات پر کبھی بھی رضامند نہ ہوتے۔ میرے جیسے لوگوں سے ہی انہوں نے روزی کمانی ہوتی ہے۔ احمد بڑی دیر تک ان سے لڑتا رہا لیکن ان لوگوں نے دھکے سے احمد کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور باہر لے جانے لگے۔

''راضی بھائی! فکر مت کرنا، ان کا باپ بھی آپ کو رہا کرے گا۔ خدا کی قسم! احمد پر کھانا اور سونا حرام ہے جب تک آپ کو آزاد نہ دیکھ لوں۔ یہ احمد بھوک سے مر جائے گا لیکن آپ کا چہرہ دیکھے بغیر کھانا نہیں کھائے گا۔'' وہ لوگ احمد کو اٹھا کر باہر لے گئے۔

یہ لوگ ماکو شہر کے نزدیک کہیں جا کر احمد کی آنکھوں سے پٹی کھولتے اس کے ہاتھ اور پاؤں کھولتے اور اسے وہیں چھوڑ کر واپس آ جاتے جہاں سے احمد اپنے گھر چلا جاتا۔ ان لوگوں کی واپسی تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوئی اور انہوں نے آتے ہی سب سے پہلے مجھے پکڑ لیا اور ایک بار پھر مارنے لگے۔

میری پیٹھ اور بازو پھٹ گئے تھے۔ ان زخموں کے نشانات آج بھی میرے جسم پر موجود ہیں۔ یونان اور جرمنی میں رہتے ہوئے میں سینکڑوں بار سمندر یا کسی جھیل پر نہانے کے لئے گیا ہوں لیکن کبھی بھی میں نے شرٹ نہیں اتاری۔ میں صرف ان زخموں کے نشانات کو چھپانے کے لئے ہمیشہ پورے کپڑے پہن کر نہاتا ہوں۔ مجھے شرٹ پہن کر نہانا پڑتا تھا۔ گاؤں میں نمبردار کے ہاتھوں، کراچی اور پھر تربت میں پولیس کے ہاتھوں اور اب یہاں ان کردوں کے ہاتھ مار کھا کھا کر میرا پورا جسم داغدار ہو گیا تھا۔

پتہ نہیں کتنی دیر تک وہ مجھے مارتے رہے۔ میں بے ہوش ہوتا تو وہ پانی چھینک کر پھر مجھے ہوش دلاتے اور پھر مارنا شروع کر دیتے۔ وہ مجھ سے میرے گھر کا نمبر مانگتے رہے لیکن میرے پاس کچھ ہوتا تو ان کو دیتا۔ میرے پاس ان کو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا اور وہ غصے میں مزید مارتے جاتے یہاں تک کہ میں مکمل ہی ہوش وحواس سے بے گانہ ہو گیا۔ مجھ پر ان کا کسی بھی قسم کا تشدد اب اثر ہی نہیں کر رہا تھا۔ وہ میرے چہرے پر پانی پھینکتے لیکن اس سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ آخر تھک کر وہ دوسرے لڑکوں کی طرف متوجہ ہو گئے جن کی جان مجھ پر تشدد ہوتے دیکھ کر ہی نکل گئی تھی اور تقریباً آدھے مر چکے تھے۔

وہ اپنے ساتھ ڈرل مشین لے کر آئے تھے۔ وہ پہلے لڑکے کو آگے لے کر آئے اور اس کے گھر کا ٹیلی فون ملا کر سپیکر آن کر دیا۔ اردو بولنے والا آدمی ہی ان کے گھر والوں سے بات کر رہا تھا۔ اس نے دس ہزار ڈالر نعیم کریم کے نام سے ترکی ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجنے کا کہا۔ ویسٹرن یونین کا نام پہلی بار میں نے ان کردوں کے ہاں ہی سنا تھا۔ بعد میں تو بہت دفعہ اس سے واسطہ پڑتا رہا ہے۔

پیسوں کی ڈیمانڈ کرنے کے بعد وہ ڈرل مشین کی مدد سے لڑکے کی ٹانگ میں سوراخ کرنے کی کوشش کرتے۔ تین آدمی لڑکے کو مضبوطی سے پکڑ لیتے تا کہ وہ حرکت نہ کر سکے۔ ایک آدمی موبائل لڑکے کے منہ کے قریب رکھتا اور ایک آدمی ڈرل چلا کر اس کی ٹانگ پر رکھ دیتا۔ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفے میں ڈرل مشین کا برما ٹانگ کے اندر گھس جاتا اور لڑکے کی فلک شگاف چیخوں سے پورا گھر گونج اٹھتا۔ یہ گھر شاید آبادی سے دور تھا اس لئے انہیں چیخوں کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ یہ چیخیں پاکستان میں اس لڑکے کے گھر والوں کو سنائی جاتی تھیں تا کہ وہ جلد سے جلد پیسے دے کر اپنے بچوں کو چھڑا سکیں۔ یہ سلسلہ رات کو بارہ بجے تک چلتا رہا اور انہوں نے سب لڑکوں کے گھر والوں کو دو دو بار فون کر دیئے۔ پاکستان والے ان سے مہلت اور پیسے کم کروانے کا کہہ رہے تھے لیکن یہ لوگ کسی بھی صورت ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔

ان لڑکوں سے فارغ ہو کر وہ میری طرف متوجہ ہو گئے۔ انہوں نے مجھے مضبوطی سے پکڑ لیا اور میری ٹانگ پر ڈرل رکھ کر چلا دی۔ ڈرل کا برما میری ٹانگ کے نرم گوشت کو کاٹتا ہوا اندر گھس گیا۔ میری ٹانگ سے خون نکل نکل کر زمین پر گرنے لگا اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ میں درد سے تڑپ رہا تھا لیکن ان لوگوں نے مجھے مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا اور میرے تڑپنے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ میری ایک ٹانگ سے برما نکال کر انہوں

نے دوسری ٹانگ میں بھی سوراخ کر دیا اور سوراخ کرنے کے بعد مجھے چھوڑ دیا۔ میں اذیت سے کمرے کے فرش پر لوٹنے لگا۔ مجھے زمین پر ایسے لوٹتے ہوئے دیکھ کر وہ زور زور سے ہنسنے لگے اور زمین پر بندھے ہوئے دوسرے لڑکے خوف سے بے ہوش ہو گئے۔

آج میں جرمنی میں بیٹھا ہوا ہوں اور ابھی تک میرے کیس کا فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ زیادہ تر پاکستانیوں کے کیس فیل ہو جاتے ہیں اس لئے ہمیشہ دل میں ایک خوف سا رہتا ہے۔ جرمنی میں کسی پاکستانی کا کیس پاس ہو جانا کسی معجزے سے کم نہیں ہوتا۔ یہ لوگ ایک ہزار میں سے ایک لڑکا ہی پناہ کے لئے مستحق سمجھتے ہیں جو کہ احمدی یا اہل تشیع میں سے کوئی ہوتا ہے اور میں نہ احمدی تھا اور نہ اہل تشیع بلکہ میں ایک سادہ سا مسلمان تھا۔

جرمنی والے کہتے ہیں ہمیں پاکستان میں جان کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم پاکستانی لوگ مرتے نہیں ہیں لیکن زندہ بھی کہاں ہوتے ہیں؟ ہماری پوری زندگی بھوک اور غربت سے لڑتے لڑتے گزر جاتی ہے۔ آپ کو پاکستانی قوم دنیا کے ہر گوشے میں مزدوری کرتی نظر آئے گی۔ بیس کروڑ کی اس آبادی والے چھوٹے سے ملک میں ہم ہر روز روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے ترستے ہیں۔ پانچ پانچ ڈالر مزدوری لینے والے آدمی کے گھر میں دس دس بچے ہوتے ہیں۔ یہ بھوک ہی ہوتی ہے جو ہمیں ایک ملک سے دوسرے ملک کے دھکے کھانے پر مجبور کرتی ہے۔ ورنہ کس کا دل کرتا ہے کہ اپنے ملک، اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر یورپ کی ان آزاد فضاؤں میں غلاموں کی سی زندگی بسر کرنے کو؟

میں اپنی کتاب صرف ان جرمنی کے باسیوں کو پڑھانا چاہتا ہوں جو کہتے ہیں ہم مہاجرین ان کے ملک کو گندہ کر رہے ہیں۔ آپ قسمت والے ہو جو جرمنی جیسے ترقی یافتہ ملک میں پیدا ہوئے ہو۔ یہ زندگی اس جرمن سے باہر کتنی مشکل ہے اس کا آپ لوگوں کو اندازہ نہیں ہے۔ سندھ اور راجھستان کے صحراؤں میں بھوک اور پیاس سے بلکتے ہوئے بچوں کا درد شاید آپ لوگ محسوس ہی نہیں کر سکتے۔ میری یہ کتاب آپ کو اس درد سے آشنا کروائے گی جو میں نے محسوس کیا ہے اور جو مجھ پر گزرا ہے۔ میرا جسم آج بھی اس ظلم کے نشانات سے بھرا ہوا ہے۔

کچھ دیر تک وہ لوگ مجھے زمین پر تڑپتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔

''راضی! اپنے گھر والوں کا نمبر دے دو، پیسوں سے زندگی نہیں خریدی جا سکتی۔ اگر پیسے نہ ملے تو ہم لوگ تجھ کو مار دیں گے۔ تم ایسے ہی تڑپ تڑپ کر مر جاؤ گے اور تمہاری لاش ان پہاڑوں پر پڑی سڑتی رہے گی۔ نمبر دے دو بچ

جاؤ گے۔تمہارے گھر والوں سے صرف دو ہزار ڈالر ہی مانگیں گے، ہم نے تمہیں دو ہزار ڈالر میں خریدا ہے۔اتنے پیسے تو ہمارا فرض بنتا ہے؟'' اس نے میرے بالوں کو کھینچتے ہوئے کہا۔

''آہ!'' میرے منہ سے آہ نکل گئی۔

''میرا کوئی نہیں ہے، میرے پاس کسی کا بھی نمبر نہیں ہے۔'' میں نے اٹک اٹک کر بولتے ہوئے کہا۔

''بے غیرت انسان! بہت ہی ڈھیٹ ہے۔۔۔تو مر کر ہی سانس لے گا'' وہ کھڑا ہو گیا اور اس نے ایک زور دار لات میری کمر پر رسید کی۔ باقیوں نے بھی اس میں اپنا حصہ ڈالنا لازمی سمجھا۔ان سب نے مجھے فٹ بال کی طرح ککیں مارنا شروع کر دیں۔تکلیف میری برداشت سے باہر ہو گئی تو میں نے چیخنا شروع کر دیا۔وہ ایسے ہی کچھ دیر تک مجھے ککیں مارتے رہے، پھر باہر چلے گئے اور باہر سے تالا لگا دیا۔

میرا پورا جسم درد اور تکلیف سے ٹوٹ رہا تھا۔خون بہنا رک گیا تھا۔ان لوگوں نے کسی لڑکے کی پٹی کرنے یا خون روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ہم سب سترہ میں سے پانچ لڑکے درمیانی عمر کے نوجوان تھے اور ہمارا مدافعاتی نظام کافی مضبوط تھا۔اس لئے کچھ ہی دیر میں ہم سب کا خون بہنا بند ہو گیا تھا لیکن ان زخموں سے اٹھنے والی ٹیسیں اب بھی باقی تھیں اور ان ٹیسوں نے پوری رات ہمیں سونے نہیں دیا۔ہم پوری رات درد سے کراہتے رہے۔ان آدمیوں نے ایک ایک کر کے ہم لڑکوں کو پیشاب وغیرہ کروا دیا تھا تا کہ ہم کپڑوں میں پیشاب کر کے بدبو نہ پیدا کر سکیں۔کھانا اور پانی دینے کا تکلف انہوں نے بالکل نہیں کیا تھا۔ہم لڑکے پوری رات بھوکے پیاسے تکلیف سے لڑتے رہے۔

دن کو بارا بجے کے قریب وہ پھر آ گئے اور آتے ہی انہوں نے پھر لڑکوں کو مارنا شروع کر دیا۔میری باری سب سے پہلے آتی تھی۔وہ مار مار کر مجھ سے رابطہ نمبر مانگتے تھے لیکن میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے مار مار کر جب وہ تھک گئے تو دوسرے لڑکوں کی طرف متوجہ ہو گئے اور دوبارہ ان لڑکوں کے گھروں میں فون کرنے لگے۔وہ لڑکوں کو حد سے زیادہ مارتے تھے اور ان کی چیخوں کی آوازیں ان کے گھر والوں کو سناتے تھے تا کہ ان کے گھر والے جلد سے جلد پیسے ادا کر سکیں۔ان لڑکوں سے فارغ ہو کر اردو بولنے والا آدمی میرے پاس آ گیا۔

''راضی صاحب! کوئی نمبر دو گے یا پھر ہم نمبر لینے کا کوئی اور طریقہ استعمال کریں؟

''میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے، میں ادھر سلماس میں کام کرتا ہوں۔آپ اس گاؤں سے پتہ کروالیں۔میرا پاکستان میں کوئی نہیں ہے۔'' میں نے چلاتے ہوئے کہا۔اس نے فارسی میں ایک آدمی کو کچھ کہا تو وہ باہر چلا گیا۔

''میں نے پلاس لانے کے لئے کہا ہے۔ہم ایک ایک کر کے تمہارے سارے ناخن اکھیڑ دیں گے۔آخر کب تک درد برداشت کرو گے؟ مان جاؤ اور ہمیں کوئی نمبر دے دو تا کہ ہم تمہارے پیسے وصول کر سکیں۔'' میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔جو فارسی کمرے سے باہر گیا تھا وہ پلاس لے کر آ گیا تو ان لوگوں نے مجھے مضبوطی سے پکڑ لیا۔اردو بولنے والے آدمی نے پلاس کو میری انگلی کے ناخن پر رکھ دیا۔اس نے پلاس سے میری انگلی کا ناخن پکڑ لیا تھا۔

''کیا کہتے ہو؟نمبر دو گے یا اکھاڑ دوں؟اس کے بعد دوسرا،تیسرا اور پھر بیس کے بیس ناخن اتار دوں گا۔اس نے پلاس کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے،آپ مار دو مجھے لیکن مجھ سے آپ کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔'' میں نے اپنے دانتوں کو مضبوطی سے بھینچ لیا۔میں اس درد کو برداشت کرنے کیلئے اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی!'' اس نے پلاس سے ناخن پر دباؤ بڑھانا شروع کر دیا اور میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

اچانک باہر سے گاڑی کے رکنے کی آواز آئی تو وہ سب باہر کی طرف متوجہ ہو گئے۔وقتی طور پر میری جان چھوٹ گئی تھی۔وہ باہر والے کا انتظار کرنے لگے۔تھوڑی دیر بعد ایک لمبا تڑنگا آدمی اندر آ گیا۔اس کا قد تقریباً 6 فٹ سے زیادہ تھا اور وہ آتے ہی ان لوگوں سے باتیں کرنے لگا۔اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ذرا سی دیر میں دوسرے لوگ بھی پریشان ہو گئے اور وہ جلدی جلدی ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔

پانچ منٹ تک بحث کرنے کے بعد ان لوگوں نے مجھے کھڑا کیا اور میری آنکھوں پر پٹی باندھنے لگے۔پٹی باندھنے کے بعد انہوں نے مجھے گاڑی میں ڈالا اور گاڑی کچے کے راستے پر تیزی سے دوڑنے لگی۔میں تقریباً چالیس منٹ تک ایسے ہی سفر کرتا رہا اور اس کے بعد انہوں نے ایک جگہ گاڑی کھڑی کی،میری آنکھوں سے پٹی اتاری اور کچی سڑک کے کنارے پر پھینک کر میرے ہاتھ کھولے اور گاڑی دوڑا کر لے گئے۔

انہوں نے مجھے آزاد کر دیا تھا۔ میں نے جلدی جلدی اپنے پیروں سے رسیوں کو کھولا اور لنگڑاتا ہوا سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ صرف دس منٹ چلنے سے ہی میری ٹانگوں میں سے خون نکلنے لگا۔ ڈرل سے بنے سوراخ ایک بار پھر کھل گئے تھے اور مجھ سے مزید چلا نہیں جا رہا تھا۔ میں چار پانچ منٹ تک ہمت کر کے مزید چلتا رہا لیکن میری ٹانگیں بالکل ہی جواب دے گئی تھیں اور آخر زمین پر گر پڑا۔ مجھے دور ایک گاڑی آتی ہوئی نظر آئی جو تیزی سے میری طرف بڑھ رہی تھی۔

یہ کردوں کا علاقہ تھا اور گاڑی میں کوئی اور اغوا کرنے والے کرد ہو سکتے تھے۔ مجھے اس گاڑی سے چھپنا تھا لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے گھسٹتا ہوا روڈ سے ایک طرف ہو گیا تا کہ گاڑی سپیڈ سے آتی ہوئی مجھے ٹائروں کے نیچے روند نہ ڈالے۔ گاڑی تیزی سے میرے پاس آئی اور بریک لگا دی۔ یہ آرمی کی گاڑی تھی اور اس میں ایرانی فوجی بیٹھے ہوئے تھے۔ فوجیوں نے جلدی سے مجھے روڈ سے اٹھایا اور گاڑی میں ڈال کر ماکو شہر کی طرف بڑھنے لگے۔ میں نے فوجی وردیاں دیکھ لیں تھیں اور خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ اس نے پھر مجھے کردوں کے ہاتھ لگنے سے بچا لیا تھا۔

آرمی کی گاڑی مجھے ماکو شہر کے ایک چھوٹے سے ہسپتال میں لے آئی جہاں ایک ڈاکٹر نے میرے زخموں کو ڈیٹول سے دھویا اور پٹی کر دی۔ مجھے اب کچھ سکون محسوس ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے پینے کے لئے ایک جوس کا ڈبہ بھی دیا جسے میں ایک ہی سانس میں پی گیا اور ڈاکٹروں کی طرف شکر گزار نظروں سے دیکھنے لگا۔ مجھے دیکھ کر ڈاکٹر باہر گیا اور اب کی بار آرمی کا ایک افسر اندر آ گیا۔ وہ میرا بیان لکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے ڈنکی کی بجائے سلماس کے گاؤں کا پتہ لکھ دیا جہاں میں کام کرتا تھا۔

میرے پاس سلماس کا پرمٹ نہیں تھا لیکن سلماس کے تھانے میں میرا اندراج ضرور تھا اور ادھر سے پرمٹ کی فوٹو کاپی بھی مل سکتی تھی۔ اس کے علاوہ میرا پرمٹ گاؤں میں میرے مالک کے پاس بھی پڑا ہوا تھا۔ احمد نے جو بیان پولیس کو دیا تھا اس کے مطابق کرد مجھے سلماس سے اغوا کر کے لائے تھے۔ اس آرمی افسر نے بھی مجھے یہی بتایا۔ میں نے افسر کی ہاں میں ہاں ملا دی۔

تھوڑی دیر بعد احمد بھی وہاں آ گیا اس کے جسم پر ابھی تک وہی خون آلود کپڑے تھے اور وہ آتے ہی مجھ سے لپٹ گیا اور زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ اس کے پیچھے احمد کا والد اور میرا مالک بھی تھا۔ ان لوگوں نے احمد کو مجھ سے الگ کیا اور میرا حال پوچھنے لگے۔ میں ان لوگوں کو اپنے پاس پا کر اب مطمئن ہو گیا تھا۔ احمد مجھ سے الگ ہو کر

میرے بستر پر ہی بیٹھ گیا۔

''بھائی! دیکھ لو، آخر چھڑوا ہی لیا نا آپ کو؟ میں نے بولا تھا کہ ان کے باپ بھی آپ کو چھوڑیں گے۔'' وہ میرے ہاتھ کو پیار سے سہلانے لگا اور میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

میرا مالک میرا سلماس میں کام کرنے والا پرمٹ لے کر آیا تھا۔ اس نے وہ پرمٹ دکھایا اور مجھے لے کر گھر آ گئے۔ وہ رات میں نے احمد کے گھر میں ہی گزاری تھی۔ احمد نے بھی اب کپڑے تبدیل کر لیے اور میرے ساتھ مل کر کھانا کھانے لگا۔ اس اٹھارہ سال کے معصوم سے نوجوان کی وجہ سے مجھے ان کردوں سے رہائی ملی تھی۔ وہ پورے گاؤں کے ایک ایک گھر میں مدد مانگنے کے لئے گیا تھا لیکن ایک مزدور پاکستانی لڑکے کے لئے کوئی بھی ان کردوں کے خلاف ایکشن نہیں لے رہا تھا۔

سب لوگ احمد کو سمجھا رہے تھے لیکن احمد اکیلا ہی میرا پرمٹ لے کر تھانے گیا اور پولیس والوں کو کارروائی کرنے کا بولنے لگا۔ پولیس والے اتنی جلدی حرکت میں نہیں آتے تھے۔ انہوں نے پرچہ کاٹا اور اسے گھر جانے کا کہنے لگے لیکن احمد اڑ گیا۔ وہ وہاں سے آرمی کی مقامی یونٹ میں چلا گیا۔ یہ بارڈر سیکورٹی فورسز کے انڈر آرمی کی یونٹ تھی۔ احمد ان کے دروازے کے آگے جا کر لیٹ گیا۔ خون سے لال سرخ کپڑوں کے ساتھ وہ آرمی افسران کے سامنے ڈٹ گیا۔ وہ معصوم سا نوجوان آرمی والوں کے سامنے شیر بن گیا۔

بالآخر ان لوگوں کو احمد پر ترس آ گیا اور آرمی حرکت میں آئی تو پولیس والے بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ماکو کے پورے علاقے میں بھونچال آ گیا تھا۔ پولیس والے اور آرمی والے ہر گاؤں میں تفتیش کر رہے تھے۔ یہ دور دراز چھوٹے چھوٹے پہاڑوں میں بنے ہوئے ویران مکانوں کی تلاشی لے رہے تھے۔ ان کو میری تلاش تھی اور وہ پوری سرگرمی سے مجھے تلاش کر رہے تھے اور اسی سرچ آپریشن کی وجہ سے کردے مجھے چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر ان لوگوں نے مجھے آزاد نہ کیا تو میرے ساتھ باقی دوسرے لڑکے بھی آزاد ہو جائیں گے اور اسی وجہ سے ان لوگوں نے مجھے آزاد کر دیا تھا۔ احمد کی بے لوث محبت نے مجھے آج بچا لیا تھا۔ ایک دو دن تک میں لنگڑا کر چلتا رہا اس کے بعد ٹھیک ہو گیا۔ مزید دس دن تک میں بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔

برف باری کا موسم شروع ہو گیا تھا۔ احمد کا والد اب اسے جرمنی جانے سے روک رہا تھا لیکن احمد ابھی تک وہیں اٹکا ہوا تھا۔ اسے جرمنی جانے کا جنون تھا۔ احمد نے اپنے چاچا سے بات کی کہ اب برف باری شروع ہو گئی ہے۔ اگر

ادھر سے کوئی مجھے بارڈر کراس کروا دے تو میرے پاس بیس ہزار روپے ابھی تک پڑے ہوئے ہیں۔امید ہے کہ بیس ہزار میں کام ہو جائے گا۔میں اور احمد اس وقت گھر کی چھت پہ کھڑے ہوئے تھے۔

''بھائی! آپ ابھی بھی ترکی جانے کا سوچ رہے ہو؟'' اس نے حیرانگی سے کہا تو میں مسکرا دیا۔

''مسٹر احمد! میں ترکی نہیں امریکہ جانا چاہتا ہوں۔راستہ ترکی اور جرمنی سے ہو کر جاتا ہے تو ترکی اور جرمنی بھی جاؤں گا۔ایک خدا رہتا ہے امریکہ میں اس خدا کے پاس جانا ہے۔اپنی داستان سنانی ہے اس خدا کو۔۔۔اس درد کی داستان شاید نیو یارک میں کھڑے اس خدا کو ہی سمجھ آئے گی۔'' میں ایک بار پھر ایمان کی یادوں میں کھونے لگا تھا لیکن احمد مجھے ان یادوں سے باہر لے آیا۔

''بھائی! دیکھ لو ایک بار، اگر کہتے ہو تو میں ابا کو منا لوں گا۔''

''تم اپنے ابا کو منا لو احمد بھائی! میں نے تو ہر حال میں ترکی جانا ہے۔تمہارا ساتھ ہو گا تو مجھے کچھ حوصلہ رہے گا۔'' میں نے احمد سے ہاتھ ملایا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے جانے لگا۔

احمد نے اپنے ابا کو منانا شروع کر دیا اور دو دن بعد ہی ہم دونوں ایک بار پھر بارڈر کراس کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔احمد کے چچا نے اس بار ہم سے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔وہ ابھی تک شرمندہ تھے کہ ان کی وجہ سے ان کا بھتیجا اور میں کردوں کے ہاتھ لگے تھے اور زخمی ہوئے تھے۔وہ اس بار ہمیں فری میں آگے دوگو بیاز تک لے جا رہے تھے۔

میں نے بیس ہزار کے ڈالر خرید کر جیب میں رکھ لئے جو کہ آگے کے سفر میں کام آتے۔دوگو بیاز سے آگے ہمیں خود ہی سفر کر کے استنبول پہنچنا تھا اور استنبول کا بارڈر کراس کرنا تھا۔اس دن شام کو 70 کے قریب لڑکوں کو دو گاڑیوں میں بٹھا کر پہاڑوں کی طرف لے جایا گیا۔یہاں سے آگے تقریباً چار یا پانچ دن کا پیدل سفر تھا اور پھر ہم ترکی پہنچ جاتے جہاں سے گاڑی ہمیں دوگو بیاز لے جاتی۔اس سے آگے ہمیں خود ہی سفر کرنا تھا۔ہم نے رات کو آٹھ بجے کے قریب سفر شروع کیا اور چار گھنٹے تک مسلسل سفر کرتے رہے۔

70 لڑکوں کے ساتھ دو گھوڑے بھی سفر کر رہے تھے۔ان کے اوپر کھانے کا اور دوسرا ضروری سامان رکھا ہوا تھا۔کھانے کے لئے صرف روٹیوں کے بنڈل تھے اور پانی راستے میں چشموں سے مل جاتا تھا۔یہاں پر پانی کی کمی

نہیں تھی۔ٹماٹر یا پنیر وغیرہ رکھنے کا تکلف نہیں کیا گیا تھا کیونکہ اس سے وزن بڑھ جاتا تھا۔لڑکوں نے اپنے بیگوں میں بسکٹ اور چنے وغیرہ رکھے ہوئے تھے جو سفر کے ساتھ ساتھ بھاری ہونے کی وجہ سے پھینکے جا سکتے تھے۔احمد کا بیگ بھرا ہوا تھا جبکہ میرے پاس کوئی بیگ نہیں تھا۔میں احمد کا بیگ اٹھا لیتا تھا۔احمد مجھے منع کرتا رہتا تھا لیکن میں پھر بھی اس سے بیگ لے لیتا اور ہم دونوں باری باری بیگ اٹھا رہے تھے۔وہ نازک سا لڑکا تھا جس نے ابھی تک زمانے کی سختی نہیں دیکھی تھی۔جبکہ میں زمانے کے حالات بھگت چکا تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ تک سستانے کے بعد ہم ایک بار پھر چل پڑے۔یہ پہاڑی علاقہ تھا۔سیدھا راستہ نہیں تھا بلکہ کبھی ڈھلان ہوتی اور کبھی چڑھائی۔لڑکے تھکنا شروع ہوئے تو ڈنکروں نے تاریں نکال لیں اور مارنا شروع کر دیا۔یہاں پر لڑکے خود بھی محنت کر رہے تھے کیونکہ پیچھے رہ جانے کا مطلب اس جنگل میں سوائے بھٹکنے کے اور کچھ نہیں تھا۔یہاں پر کردوں کا زیادہ خطرہ تو نہیں تھا لیکن اس علاقے میں پہاڑوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔برف پڑی ہوئی اور وہ ہمارے بوٹوں کے نیچے مسلسل پھسل پھسل جاتی تھی۔ٹھنڈ بہت زیادہ تھی لیکن مسلسل چلنے کی وجہ سے ہمیں محسوس نہیں ہو رہی تھی۔احمد سے بیگ اب مستقل میں نے ہی پکڑ لیا تھا۔مجھے معلوم تھا کہ اب بیگ کے ساتھ احمد مزید سفر نہیں کر سکے گا۔اس لئے اس کے اصرار کے باوجود بھی بیگ اسے نہیں پکڑا رہا تھا۔

صبح چار بجے کے قریب ہم سب لڑکے تھک گئے لیکن ابھی دو گھنٹے کا مزید سفر کرنا تھا اور ڈنکروں کی تاریں بھی اب تیز ہو گئیں تھیں۔وہ مار مار کر لڑکوں کو آگے کی طرف چلنے پر مجبور کر رہے تھے۔گھوڑوں پر سفر کرنے کے لئے لڑکوں کے پاس کوئی ڈالر نہیں تھے۔ان کو سلماس آنے سے پہلے لوٹ لیا گیا تھا۔ڈنکروں کو بھی اس بات کا پتہ تھا اس لئے وہ ان لڑکوں کو گھوڑے پر بٹھا کر سفر کروا رہے تھے جو بالکل ہی گر جاتے تھے۔

لڑکے آدھا گھنٹہ گھوڑے پر سفر کرتے اور پھر اتر کر دوبارہ پیدل سفر شروع کر دیتے اور پھر دوسرا لڑکا گھوڑے پر بیٹھ جاتا۔آدھے گھنٹے سے ہی تھکاوٹ کم ہو جاتی تھی اور لڑکا دوبارہ چلنے کے قابل ہو جاتا تھا۔لڑکے گھوڑے پر بیٹھنے کا بہانہ کرتے تو وہ مارنا شروع کر دیتے تھے۔ان کو اصل اور بناوٹی لڑکوں کی پہچان تھی۔احمد بھی اب بالکل تھک گیا تھا۔میں نے اس کا بازو اپنے کندھے پر رکھا ہوا تھا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے آگے کی طرف لے جا رہا تھا۔

''راضی بھائی! میں تھک گیا ہوں، مجھ سے اب مزید نہیں چلا جا رہا ہے۔اب چھوڑ دو مجھے، آپ بھی تھک جاؤ

گے۔'' وہ میرے ساتھ گھسٹتا ہوا چل رہا تھا۔

''کچھ نہیں ہوتا، بس تھوڑا سا مزید سفر رہ گیا ہے۔ صبح کی روشنی شروع ہوتے ہی قافلہ رک جائے گا اور پھر سارا دن آرام ہی کرنا ہے۔'' میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا تو وہ میرے ساتھ خاموشی سے چلنے لگا۔

چھ بجے کے قریب صبح کی روشنی اٹھنی شروع ہو گئی تو ڈنکی رک گئی۔ یہاں پر دو پہاڑیاں اس طرح جڑی ہوئی تھیں کہ قدرتی طور پر ایک گڑھا سا بنا ہوا تھا۔ ڈنکروں نے ہمیں اس گڑھے میں بیٹھنے کا اشارہ کیا تو ہم سب لڑکے اس گڑھے میں بیٹھ گئے۔ تھکاوٹ سے برا حال ہو گیا تھا اور اب گڑھے میں بیٹھتے ہی سکون آ گیا تھا۔ ڈنکروں نے ہمیں دو دو روٹیاں پکڑائیں اور کھانا کھا کر خاموشی سے ادھر سو جانے کا کہہ کر گھوڑے لے کر چلے گئے۔

ڈنکر کبھی بھی لڑکوں کے ساتھ نہیں رہتے۔ یہاں تک کہ اگر لڑکے دس منٹ بھی آرام کے لئے بیٹھیں گے تو تب بھی یہ لڑکوں سے دور ہو کر بیٹھیں گے۔ پولیس والے لڑکوں کو تو پکڑ کر ڈی پورٹ کر دیتے تھے لیکن اگر ان کے ہاتھ میں ڈنکر لگ جاتا تو اسے نہیں چھوڑتے تھے۔ انسانی سمگلنگ کی کم سے کم سزا بھی 7 سال تھی۔ ڈنکر کبھی بھی پولیس والوں کے ہاتھ نہیں لگتے تھے۔ وہ گھوڑے لے کر چلے گئے تو پیچھے صرف لڑکے رہ گئے۔ ہم نے روٹی کو پانی میں بھگو بھگو کر کھایا اور اپنے بیگ سروں کے نیچے رکھ کر لیٹ گئے۔ میں نے سر کے نیچے احمد کا بیگ رکھ لیا اور احمد میرے پیٹ پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔

ساری رات کے سفر نے ہم کو تھکا دیا تھا اس لئے لیٹتے ہی نیند آ گئی اور ہم دن کو بارہ بجے تک سوتے رہے۔ تھکاوٹ ختم ہوئی اور نیند کا اثر کم ہوا تو سردی لگنے لگی۔ پہلے تو سورج بالکل ہمارے سامنے تھا اور ہم دھوپ میں لیٹے ہوئے تھے لیکن بارہ بجے کے بعد سورج کچھ بلند ہوا تو گھاٹی کا سایہ آنے لگا اور اس کے ساتھ ہی ٹھنڈ بھی لگنی شروع ہو گئی۔ میں نے ٹراؤزر، پینٹ، تین شرٹیں اور اس کے اوپر جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ اتنے کپڑوں کے باوجود سردی لگ رہی تھی۔

''راضی بھائی! سردی لگ رہی ہے۔'' احمد نے بیگ سے مزید دو اور کپڑے نکال کر پہن لیے لیکن سردی کبھی بھی کپڑوں سے ختم نہیں ہوتی بلکہ چادر یا کمبل سے ہی ختم ہوتی ہے۔ ویسے بھی یہاں کافی ٹھنڈ تھی اور کپڑے کچھ بھی نہیں کر رہے تھے۔

''بھائی! بہت سردی لگ رہی ہے۔'' احمد نے سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے کہا۔

میں زمین پر سیدھا ہو کر لیٹ گیا اور احمد کو اپنے سے لپٹا لیا۔ میں نے ایک بازو سیدھا کیا تو وہ میرے بازوؤں کو اپنے سر کے نیچے سے گزار کر میرے کندھے پر سر رکھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ میں آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اس خوبصورت لڑکے کی وجہ سے میری منزل نزدیک ہو رہی تھی۔ یہ اس نوجوان کی وجہ سے ہی ممکن ہوا تھا جو آج میں یہاں تک پہنچ گیا تھا اور اگلے چار پانچ دن تک میں ترکی چلا جاتا۔ یہ چھوٹا سا نازک لڑکا اپنے سینے میں شیر کا جگر رکھتا تھا اور مجھے اس سے بہت محبت تھی۔

''احمد!'' میں نے اسے پیار سے پکارا۔

'جی بھائی!'' وہ بدستور مجھ سے لپٹا ہوا تھا اور آنکھیں بند کر کے پھر سونے کی کوشش کر رہا تھا۔

''احمد! تم بہت اچھے اور پیارے ہو۔ جرمنی بہت خوش قسمت ملک ہوگا جو تجھے اپنے پاس رکھے گا۔ جس ملک سے تم محبت کرتے ہو وہ واقعی اس دنیا میں سب سے خوش قسمت ہوگا۔ میں امریکہ جا رہا ہوں، بلکہ جانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پاکستان میں میرا ایک محبوب رہتا ہے اور اسے امریکہ سے محبت ہے۔ میں اس شخص کے خوابوں کی تکمیل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے امریکہ کے علاوہ اس دنیا میں اور کسی سے محبت نہیں ہے۔ ایک بار امریکہ سے بھی محبت کر کے دیکھ لو! شاید تمہاری محبت سے امریکہ بھی خوش قسمت ہو جائے۔'' میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''راضی بھائی! میری محبت کرنے سے کوئی بھی ملک خوش قسمت نہیں ہو سکتا۔ جرمنی تو میرے دل میں رہتا ہے اور جہاں تک خوش قسمتی کا سوال ہے تو شاید آپ دنیا کے سب سے خوش قسمت انسان ہو کیونکہ یہ احمد آپ سے بہت محبت کرتا ہے۔ خدا نے مجھے کوئی دوسرا بھائی یا بہن نہیں دی۔ میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں اور میں نے ہمیشہ ایک بھائی کی کمی محسوس کی ہے۔ وہ کمی آپ نے پوری کر دی ہے۔ میں نے ہمیشہ آپ کو ایک بھائی کی طرح محسوس کیا ہے۔'' وہ باتیں کرتا کرتا ایک بار پھر سو گیا۔

اس بار وہ شام کے چھ بجے تک ایسے ہی سوتا رہا۔ مجھے بھی کبھی نیند آ جاتی اور کبھی جاگ جاتا لیکن چھ بجے تک میں ایسے ہی لیٹا رہا۔ احمد کے اٹھنے کے بعد میں بھی اٹھ کر بیٹھ گیا اور ہم سب لڑکے ڈنکروں کے آنے کا انتظار کرنے

لگے۔ڈنکرسات بجے کے قریب آئے اور آتے ہی ہمیں لے کر چل پڑے۔کھانے کے لئے اس بار انہوں نے ایک ایک روٹی دے دی تھی جس کو ہم نے رول کر کے ہاتھ میں پکڑ لیا اور سفر کے ساتھ ساتھ کھاتے جاتے۔ایک روٹی کا نوالہ اور ایک گھونٹ پانی بہترین کمبی نیشن تھا۔

ہم خاموشی سے سفر کرتے رہے۔لڑکے اب کی بار پہاڑی علاقے میں سفر کرنے کے عادی ہو رہے تھے اور بہت کم تنگ کر رہے تھے۔بس کبھی کبھی کوئی لڑکا تنگ کرتا تو ڈنکر کی ایک دو تاریں کھا کر ٹھیک ہو جاتا تھا اور خاموشی سے پھر قطار میں چلنے لگتا۔ہم نے سات بجے سے چلنا شروع کیا تھا اور ڈنکروں نے ایک بجے تک ہمیں مسلسل چلایا۔اس کے بعد کچھ منٹ ستانے کے بعد پھر سے سفر شروع ہو گیا۔چار بجے کے قریب ایک بار پھر رکے اور دوبارہ سفر کرتے کرتے صبح چھ بجے کے قریب ایک نالے کے قریب جا کر ڈنکروں نے ہمیں رکنے کو کہا۔

یہ بہت تنگ سا راستہ تھا۔ایک طرف چھوٹا سا نالہ بہہ رہا تھا جس کے کناروں پر برف جمی ہوئی تھی۔ایک طرف بھیڑ بکریوں نے گزر گزر کر تنگ سا راستہ بنا دیا تھا۔دونوں اطراف پر آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ تھے۔ہمیں ایک کھلی جگہ مل گئی تھی۔ڈنکروں نے ہمیں وہیں دن گزارنے کا کہا اور کل کی طرح دو دو روٹیاں دے کر چلے گئے۔یہاں پر ٹھنڈک کا احساس تو ہو رہا تھا لیکن چونکہ یہ جگہ پہاڑوں سے گھری ہوئی تھی اس لئے ادھر سے ہوا نہیں گزر رہی تھی اور ہوا نہ ہونے کی وجہ سے سردی بھی زیادہ نہیں لگ رہی تھی۔احمد نے دو تین کپڑے اپنے اوپر ڈالے اور ایک بار پھر مجھ سے لپٹ کر سو گیا۔

''اوئے!میں تمہاری ماں نہیں ہوں جو تم یوں مجھ سے لپٹ لپٹ کر سو رہے ہو۔'' میں نے طنزیہ کہا۔

''بڑے بھائی تو ہو ناں میرے؟احمد کے بڑے بھائی۔۔۔اور فخر کرو اس بات پر!احمد ایسے ہی ہر کسی کو اپنا بھائی نہیں بناتا۔'' اس نے ایک منٹ کے لئے میرے سینے سے سر اٹھایا اور دوبارہ لیٹ گیا۔

مجھے ایمان کی ایک پرانی بات یاد آ گئی،وہ بھی ایسے ہی کہتی تھی؛

''ایمان کا بھائی ہونا بہت بڑے نصیب کی بات ہوتی ہے۔ایمان ایسے ہی ہر کسی کو اپنا بھائی نہیں بناتی۔'' وہ واقعی ایسی ہی تھی،محبت میں بھی،دوستی میں بھی اور نفرت میں بھی۔اس کی محبت بھی شدید تھی اور نفرت بھی انتہا کی تھی۔مجھے اس کی محبت نے رانجھا بنا دیا تھا۔

وہ دن ہم نے یہیں پر ہنستے ہوئے گزارا۔ یہاں سے بارڈر صرف چار گھنٹے کی دوری پر تھا اور ڈنکروں نے ہمیں احتیاط سے ادھر رہنے کا بول دیا تھا۔ ہم لڑکے سارا دن وہیں رہے۔ رات کو سات بجے کے قریب ڈنکر آ گئے اور ایک بار پھر آگے کی طرف سفر کرنے لگے۔ ہم دو گھنٹے تک ایسے ہی نالے کے ساتھ ساتھ سفر کرتے رہے۔ اس کے بعد پہاڑی کی ایک کھائی سے دوسری طرف جانے لگے کیونکہ سیدھا آگے ترکی کی ایک چیک پوسٹ آتی تھی۔

وہ ایک چھوٹی سی چیک پوسٹ تھی جہاں پر کبھی کبھار ہی کوئی سیکورٹی کا آدمی ہوتا تھا۔ گرمیوں میں تو مستقل ہوتا تھا لیکن ابھی سردیاں تھیں اس لئے سیکورٹی اتنی سخت نہیں تھی لیکن پھر بھی ادھر کیمرے لگے ہوئے تھے اور ہمیں ان سے بچ کر نکلنا تھا۔ اس لئے ہم پہاڑی کو کراس کر کے دوسری طرف کو نکل رہے تھے۔ آخر کار ایک گھنٹے تک ہم نے پہاڑی کراس کر لی اور دوسری طرف نکل گئے۔

یہ راستہ بالکل تنگ سا تھا۔ صرف ایک آدمی کے گزرنے کی جگہ تھی۔ ہم پہاڑی کے نیچے سے گزر رہے تھے۔ نیچے تقریباً 100 فٹ کے قریب زمین تھی جہاں سے برف کا پانی پگھل کر گزر رہا تھا اور اس کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ اوپر تقریباً 400 فٹ کی پہاڑی تھی۔ لڑکوں کے چلنے سے اگر کوئی پتھر ٹوٹتا تو وہ نیچے گہرائی میں گرتا چلا جاتا۔

رات کا اندھیرا ہر طرف پھیلا ہوا تھا اور ہم لڑکے پیچھے سے ایک دوسرے کی شرٹ پکڑ کر چل رہے تھے۔ سب لڑکوں نے ایک دوسرے کو تھاما ہوا تھا اس لئے بھٹک کر دوسری طرف جانے یا نیچے گرنے کا امکان نہیں تھا۔ لڑکے ایک دوسرے کے پیچھے قدم سے قدم ملا کر چل رہے تھے۔ ایسے ہی چلتے چلتے ہمیں ایک گھنٹے سے زیادہ ٹائم ہو گیا۔ آخر ایک جگہ پر جا کر سب لڑکے رک گئے۔ ڈنکروں نے ہم کو لیٹنے کا اشارہ کیا اور ہم ایک ایک کر کے لیٹتے چلے گئے۔ یہ کھلی جگہ تھی اور ہم ایک جگہ پر اکٹھے ہو گئے تھے۔

''راضی بھائی! وہ سامنے بارڈر ہے۔'' اندھیرے میں ہم کسی حد تک دیکھنے کے قابل ہو گئے تھے۔

''بھائی! یہاں سے بارڈر صرف 100 میٹر کے فاصلے پر سامنے ہے اور ڈنکر آگے راستہ دیکھنے گئے ہیں۔'' احمد نے سرگوشی میں کہا اور میں نے سر ہلا دیا۔

دس منٹ تک ایسے ہی بیٹھے رہنے کے بعد ڈنکر واپس آ گئے اور انہوں نے آتے ہی ہمیں جلدی سے کھڑے ہونے کا کہا اور آگے کی طرف چل پڑے۔ یہاں سے جگہ کھلی تھی اور ہم لڑکے ایک گروپ کی طرح چل رہے تھے۔

پہاڑی کے اوپر ہمیں بہت تیز گڑگڑاہٹ کی آواز آئی تو ہم گھبرا کر رک گئے۔

''زدزد (جلدی جلدی)'' ڈنکروں کے چلانے کی آواز آئی تو ہم لڑکے تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ یہ پہاڑی کے اوپر جمع برف تھی جو ٹوٹ کر نیچے گر رہی تھی۔ ہمارا پورا گروپ اس برف کی زد میں آ گیا اور ہم سب لڑکے برف کے زور سے نیچے 100 فٹ کی گہرائی میں گرتے چلے گئے۔ یہ خشک پہاڑی علاقہ تھا اور کوئی درخت وغیرہ نہیں تھا اس لئے برف ٹوٹ کر ڈائریکٹ نیچے گر رہی تھی اور ہم بغیر کسی رکاوٹ کے لڑھکتے ہوئے نیچے گہرائی کی طرف جا رہے تھے۔

درخت برف کے بہاؤ کو روک لیتے ہیں۔ درخت صرف آکسیجن کی فراہمی کا ہی باعث نہیں بنتے یہ پانی کے تیز بہاؤ میں رکاوٹ پیدا کر کے سیلاب سے بچاتے ہیں۔ اس کے علاوہ پہاڑوں میں ہونے والی ٹوٹ پھوٹ بھی درختوں کے باعث کم ہو جاتی ہے۔ یہ

برف کا بہت بڑا ریلہ تھا جو پتہ نہیں کتنی دیر سے اوپر اٹکا ہوا تھا۔ ہمارے قدموں کی دھمک سے پیدا ہونے والی لہر نے اس کو توڑ دیا تھا اور پوری پہاڑی ہی جیسے نیچے آنے گی۔ ہم سب اس برف کے اندر دب گئے تھے اور لڑھکتے ہوئے نیچے آ رہے تھے۔ یہ 100 فٹ کا فاصلہ تھا اور دس بارہ سیکنڈ میں ہی ہم نیچے پہنچ گئے۔ احمد کا ہاتھ میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

میرے چاروں طرف برف ہی برف تھی اور میرا سانس جیسے بند ہو گیا ہو۔ میں پوری طرح سے برف سے جکڑا ہوا تھا اور برف کے وزن سے میری ہڈیاں ٹھنڈی ہو کر درد کر رہی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ موت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آج ترکی سے صرف چند میٹر کے فاصلے پر برف میں دفن ہو گیا تھا۔ مجھے موت نظر آ رہی تھی اور میں آہستہ آہستہ سو رہا تھا۔ زندگی کی خواہش بھی اب دم توڑ چکی تھی۔ مرنے کے بعد اس دوسری دنیا میں ایمان نے ملنے کا وعدہ کیا تھا اور مجھ سے اب اس دنیا کی مزید سختیاں برداشت نہیں ہو رہی تھیں اس لئے میرا ذہن آہستہ آہستہ تاریکی میں جانا شروع ہو گیا۔ میرا پورا جسم سردی سے اکڑ گیا تھا۔

اچانک میرے پاؤں میں کھجلی محسوس ہوئی اور مجھے دوبارہ ہوش آ گیا۔ میں نے اپنے چہرے کو دائیں بائیں ہلایا تو تھوڑی جگہ بن گئی۔ میں نے ایک لمبی سانس کھینچی تو برف میرے ناک میں گھس گئی اور مجھے چھینک آ گئی۔ اسی چھینک نے میرے پورے جسم کو لرزا کر رکھ دیا اور میں مکمل طور پر ہوش میں آ کر زندگی کی جدوجہد کرنے لگا۔

ایک آدمی میرے پاؤں کو پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔ میں نے اپنے پاؤں کو حرکت دی تو اس کے ہاتھ تیز ہو گئے اور وہ جلدی جلدی میرے جسم سے برف ہٹانے لگا۔ تھوڑی دیر تک برف ہٹی تو میں زور لگا کر برف سے باہر نکل آیا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن پھر گر گیا۔ یہ وقتی جھٹکا تھا۔ میں فوراً ہی نارمل ہو گیا اور اس بار میں کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

آسمان پر آخری راتوں کا چانداور ستاروں کی مدہم روشنی برف پر پڑھ رہی تھی اور برف اس روشنی کو منعکس کر کے ہر طرف ہلکی ہلکی روشنی بکھیر رہی تھی۔ جو لوگ برفانی علاقوں کے رہنے والے ہیں انہیں اس چیز کا پتہ ہو گا۔ جب ہر طرف برف پڑھ جاتی ہے تو اندھیری رات بھی برف کی سفیدی کی وجہ سے روشن ہو جاتی ہے۔

مجھے اپنے چاروں طرف برف بکھری نظر آ رہی تھی۔ میرے علاوہ تین اور لڑکے باہر تھے اور وہ برف میں باقی لڑکوں کو تلاش کر رہے تھے۔ کچھ لڑکے دوسری طرف ایک کونے میں پڑے کراہ رہے تھے۔ شاید ان کی ٹانگیں یا جسم کی کوئی ہڈی وغیرہ ٹوٹ گئی تھی یا پھر برف کے دباؤ کی وجہ سے ان کے جسم نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے احمد کا خیال آیا اور میں جلدی جلدی برف میں احمد کو ڈھونڈنے لگا۔ باقی لڑکے بھی برف میں لڑکوں کو ڈھونڈتے رہے۔ جلد ہی ہم دوسرے لڑکوں کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے اور باری باری ان کو باہر نکالنے لگے۔

ہمیں لڑکوں کو ڈھونڈنے میں زیادہ دقّت نہیں ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک باقی جو ٹھیک لڑکے تھے وہ بھی ہمارے ساتھ مل گئے اور ہم نے بیس پچیس منٹوں تک سب لڑکوں کو برف سے نکال لیا۔ مجھے احمد بھی مل گیا تھا اور میں اسے اٹھا کر ایک طرف لے گیا۔ اس کا پاؤں ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے علاوہ دائیں ہاتھ اور کمر پر بھی چوٹیں آئی تھیں اور اس لیے وہ درد سے کراہ رہا تھا۔

''احمد! احمد! ہوش کرو، تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' میں اس کے پاؤں کی مالش کرنے لگا۔ اس کا پاؤں گرم ہوا تو اس کی تکلیف کچھ کم ہوئی۔

''بھائی! میں ٹھیک ہوں آپ اب پاؤں ملنا بند کر دو۔'' احمد نے کراہنا بند کر دیا تھا۔

میں اسے چھوڑ کر باقی لڑکوں کو دیکھنے لگا۔ ہمارے لڑکوں کے بیچ میں کوئی بھی ڈنکر نہیں رہ گیا تھا۔ گھوڑے بچ گئے تھے۔ جانوروں کو خطرے کا پہلے ہی احساس ہو جاتا ہے اس لئے وہ بچ گئے اور واپس بھاگ گئے تھے۔ ان کو

راستوں کا پتہ ہوتا ہے اور یہ واپس اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ ڈنکروں نے لڑکوں کی حالت دیکھ لی تھی۔ ہم پچاس لڑکوں میں سے صرف آٹھ لڑکے ہی ٹھیک حالت میں تھے، باقی سب لڑکوں کو چوٹیں آئی تھیں۔ پانچ چھ لڑکے تو انتہائی سیریس تھے اور بے ہوش تھے۔

ڈنکر یہ سب کچھ دیکھ کر بھاگ گئے تھے۔ وہ فون کر کے پیچھے مین ایجنٹ کو اطلاع دے دیتے اور مین ایجنٹ کسی طریقے سے یہ خبر پولیس کو پہنچا دیتا۔ پھر دو تین گھنٹوں تک ریسکیو کی ٹیمیں یہاں پہنچ جاتیں اور ہمیں واپس لے جا کر ہسپتال منتقل کر دیتیں۔ جہاں سے ابتدائی طبی امداد دے کر ہمیں اپنے ملک ڈی پورٹ کر دیا جاتا۔

''راضی بھائی! جرمنی ایک بار پھر دور ہو گیا۔ صرف چند قدم کے فاصلے پر بارڈر ہے لیکن ہماری قسمت ہی خراب ہے جو پورا سمندر کراس کر کے کنارے پر ڈوب رہے ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ میرے گلے لگ کر رونے لگا۔

''اوہ مائی گاڈ!'' میں نے احمد کو اپنے گلے سے الگ کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''تم چل سکتے ہو؟'' میں نے جلدی سے احمد کو بازو پکڑ کر کھڑا کیا تو وہ تکلیف کی شدت سے کراہ اٹھا۔

''نہیں بھائی! میرا پاؤں ٹوٹ گیا ہے، میں نہیں چل سکوں گا۔ آپ جانا چاہتے ہو تو جا سکتے ہو۔'' احمد نے کراہتے ہوئے کہا۔

''سوری بھائی! آپ چلے جاؤ۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''احمد بھائی! ایک دو گھنٹے تک یہاں ریسکیو کی ٹیمیں پہنچ جائیں گی جو مجھے پاکستان ڈی پورٹ کر دیں گی۔ میں پاکستان نہیں جانا چاہتا، میں نے بہت محنت کی ہے یہاں تک آنے کے لئے اور اب واپس نہیں جانا چاہتا۔ احمد! ان پچاس لڑکوں میں صرف تم ہی فارسی ہو۔ یہاں کے مقامی کرد، پولیس اور ایجنسی والے کبھی یقین نہیں کریں گے کہ تم ڈنکی لگا کر جرمنی جانا چاہ رہے تھے بلکہ وہ تم کو ایجنٹ ہی سمجھیں گے۔ جو زخمی ہو کر پکڑا گیا۔ ہمت کرو احمد بھائی! ہمیں ہر حال میں بارڈر کراس کر کے دوسری طرف جانا ہے۔ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرتے ہوئے تمہاری پوری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزر جائے گی۔ احمد بھائی! ہمت کرو، ایجنسی والے بہت مارتے ہیں۔ میں نے ان کی مار سہی ہے۔ یہ سب رہا ہو جائیں گے کیونکہ یہ پاکستانی یا افغانی ہیں اور ڈی پورٹ ہو جائیں گے لیکن تم پھنس جاؤ گے۔

ہمت کرو، ہمیں ہر حال میں بارڈر کراس کر کے دوسری طرف جانا ہے۔'' میں نے اس کا بازو اپنے کندھوں پر رکھا اور ایک ہاتھ سے اس کی کمر پکڑ کر اسے چلانے کی کوشش کرنے لگا۔

''آہ! نہیں بھائی، مجھ سے نہیں چلا جائے گا۔ میں مر جاؤں گا۔'' احمد نے چیختے ہوئے کہا لیکن میں اسے آگے کی طرف بڑھاتا رہا۔

''ارے! تم لوگ کدھر جا رہے ہو؟'' دو لڑکوں نے آگے بڑھ کر مجھے روک لیا۔

''میں بارڈر کے اس طرف جا رہا ہوں!'' میں نے ان لڑکوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''تم ان لڑکوں کو ایسے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ یہاں لڑکے مر رہے ہیں اور تمہیں آگے جانے کی پڑی ہوئی ہے؟'' ایک لڑکے نے میرا گریبان پکڑتے ہوئے کہا۔

''تمہارے اندر تھوڑی سی بھی انسانیت ہے؟'' ایک اور لڑکے نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ میں نے احمد کا بازو کندھے سے نکالا اور اسے ایک طرف بٹھا دیا۔

''ہاں! میرے اندر انسانیت ہے۔ یہ یہاں کا مقامی کرد لڑکا ہے جو جرمنی جانا چاہتا ہے۔ ہم سب یورپ جانا چاہتے ہیں۔ ابھی ریسکیو والے آئیں گے تو سب کو پکڑ کر واپس لے جائیں گے اور پھر پاکستان ڈی پورٹ کر دیں گے۔ آپ لوگ دوبارہ بھی واپس آ سکتے ہیں لیکن میرے پاس کھانا کھانے کے بھی پیسے نہیں ہیں۔ اگر مجھے ڈی پورٹ کر دیا گیا تو میں کہاں جاؤں گا؟ آپ میں سے کوئی لڑکا اگر مجھے اپنے گھر لے جائے یا واپس یورپ کی ڈنکی کے پیسے دے دے تو میں رک جاتا ہوں۔ میں ڈی پورٹ نہیں ہونا چاہتا، میں نے لڑکوں کو اپنے ہاتھوں میں دم توڑتے ہوئے اور بارڈر پر گولی کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ مجھے اب ان چیزوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور اگر ڈی پورٹ ہو بھی جاؤں تو اس لڑکے کا کیا بنے گا؟ اسے ایرانی پولیس والے ایجنٹی کے کیس میں دس سال کے لئے اندر کر دیں گے۔ میں اپنے لئے بھی جانا چاہتا ہوں اور اس لڑکے کے لئے بھی جانا چاہتا ہوں۔'' لڑکے اب پیچھے ہٹ گئے تھے۔ میں نے دوبارہ احمد کا بازو اپنی گردن کے گرد ڈالا اور اسے اٹھا کر اپنے ساتھ چلانے لگا۔

''میرے ترکی جانے کے سارے پیسے یہ لڑکا دے رہا ہے، یہ فارسی بھائی ہے میرا اور اس کے لئے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔'' میں آہستہ آہستہ بارڈر کی طرف چلنے لگا اور لڑکے بھی ہمارے ساتھ آگے بڑھنے کو تیار ہو گئے۔

پیچھے صرف دو صحت مند لڑکے رہ گئے تھے اور وہ آگے جانے سے ڈر رہے تھے۔ برف، بارڈر، پولیس اور کردوں کا خوف انہیں آگے بڑھنے سے روک رہا تھا اور وہ وہیں رک کر مدد کا انتظار کرنے لگے اور ہم آٹھ لڑکے آگے کی طرف بڑھنے لگے۔ احمد کے پاؤں سے ٹیسیں نکل رہی تھیں اور وہ درد سے چلا رہا تھا۔ ایک لڑکے نے احمد کو دوسری طرف سے پکڑ لیا اور ہم سب لڑکے بارڈر کی طرف بڑھنے لگے۔ بارڈر ہم سے صرف 10 منٹ کی مسافت پر تھا۔ بارڈر کی تار لگی ہوئی تھی جس کو ڈنکروں نے کاٹ کر راستہ بنا دیا تھا۔ ہم سب لڑکے ایک ایک کر کے تار کو کراس کرنے لگے۔ میں نے احمد کو سہارا دے کر تار کراس کی اور ہم ترکی کی حدود میں داخل ہو گئے۔ سب لڑکوں نے دھیمی آواز میں خدا کا شکر ادا کیا اور ہم ترکی کے اندر کی طرف بارڈر سے دور ہونے لگے۔

میں ایران کو چھوڑ کر ترکی میں داخل ہو گیا تھا۔ میں نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر قطبی ستارے کو تلاش کیا اور اس کی مدد سے مسلسل آگے کی طرف بڑھنے لگا۔ ہمیں مغرب کی طرف جانا تھا۔ احمد کا پاؤں گرم ہو کر اب زمین پر لگنے لگا تھا اور وہ بھی کچھ تیز چلنے کے قابل ہو گیا تھا اس لئے ہم تیزی کے ساتھ بارڈر سے دور ہونے لگے۔ ہمیں راستوں کا کوئی علم نہیں تھا، صرف یہ پتہ تھا کہ مغرب کی طرف ترکی ہے اور ہم مغرب کی طرف ہی سفر کر رہے تھے۔ دو گھنٹے تک مسلسل سفر کرنے کے بعد ہم نے تھوڑی دیر کے لئے آرام کیا اور ایک بار پھر سفر کرنے لگے۔

صبح سات بجے تک مسلسل سفر کرنے کے بعد ہم پہاڑی کے اوپر چڑھے اور پہاڑی پر موجود چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں میں اپنے آپ کو چھپا لیا۔ دن کا اجالا پھیل گیا تھا۔ ہم سارا دن انہی جھاڑیوں میں چھپے بیٹھے رہے۔ ہمیں رات ہونے کا انتظار تھا تاکہ مزید آگے کی طرف بڑھ سکیں۔

مجھے بارڈر کے ساتھ ساتھ ترکی کے تقریباً سبھی دیہاتوں کے نام زبانی یاد تھے۔ میں نے نقشے کی مدد سے ان سبھی دیہات کے نام اور ان کا بارڈر سے فاصلہ اور لوکیشن سبھی زبانی یاد کر رکھی تھیں۔ کچھ لوگ شاید میری بات کا یقین نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب محبت کا جنون انسان کے سر پر سوار ہوتا ہے تو انسان پہاڑوں کو بھی کاٹ کر دودھ کی نہریں نکال دیتا ہے اور یہ تو کچھ دیہات کے نام اور ان کو ملانے والے راستے تھے۔ رات کو ایک بار پھر ہم سفر کرنے لگے۔ احمد اب ٹھیک ہو گیا تھا اور اپنے سہارے پر چل رہا تھا۔ مجھے اس کا بیگ برف میں نہیں ملا تھا اس لئے ہم بغیر بیگوں کے ہی سفر کر رہے تھے۔

''بھائی جان! ہم صحیح راستے پر ہی جا رہے ہیں؟ کہیں غلط تو نہیں جا رہے؟'' ایک لڑکے نے آگے بڑھ کر مجھ

سے پوچھا تو میں چلتے چلتے رک گیا اور سمت کا اندازہ لگانے لگا۔

''نہیں! میرا خیال ہے کہ ہم درست جا رہے ہیں، مجھے ایک کچے روڈ کی تلاش ہے۔'' میں نے اس لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ایک بار پھر آگے کی طرف بڑھنے لگا۔

مجھے شمال سے جنوب کی طرف جانے والے ایک کچے راستے کی تلاش تھی۔ ہم مسلسل مغرب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ راستہ بارڈر سے تقریباً آٹھ کلومیٹر دور تھا۔ پہاڑی راستہ ہونے کی وجہ سے یہ فاصلہ بڑھ کر تقریباً پندرہ کلومیٹر ہو گیا تھا۔ ہمیں یہ پندرہ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتے کرتے ڈیڑھ رات لگ گئی تھی کیونکہ یہ پہاڑی علاقہ تھا اور ہمیں کبھی چڑھائی چڑھنی پڑتی اور کبھی نیچے اترنا پڑتا۔

میں مسلسل کچے راستے کی تلاش میں تھا۔ یہ کچا راستہ شمال سے نکلتا اور جنوب کی طرف جاتا تھا۔ ہم اس راستے کو درمیان سے کہیں کاٹتے۔ چلتے چلتے ہم صبح 2 بجے کے قریب اسی راستے پر پہنچ گئے۔ یہ راستہ پہاڑی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ہم پہاڑی سے نیچے اتر آئے اور سامنے تر کی کا ایک چھوٹا سا گاؤں اوز پینر ہمیں نظر آنے لگا۔ یہ چھوٹا سا گاؤں ہے جس میں تقریباً پچاس کے قریب گھر ہوں گے۔ یہ پہلا گاؤں تھا جو اس راستے پر واقع تھا۔ ہم اس گاؤں میں رکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے کیونکہ اس راستے پر بارڈر سیکورٹی فورسز کی گاڑیاں گھومتی رہتی تھیں۔

یہ کچا راستہ سرحدی گاؤں ''کاسکول'' سے شروع ہوتا ہوا ''جیلنر'' اور پھر وہاں سے ''یوزلر'' تک جاتا تھا۔ یوزلر سے یہ پانی کے ایک چشمے کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور تقریباً دو سو پچاس کلومیٹر تک چلتے ہوئے ''ہاکاری'' سے ہوتا ہوا ایران میں داخل ہو جاتا ہے۔ ہم اوز پینر کو کراس کرتے ہوئے مسلسل آگے بڑھتے رہے اور پنر سے ایک کچا راستہ نکلتا تھا جو پانچ کلومیٹر آگے جا کر ایک اور گاؤں ''ایسپینر'' جاتا تھا۔ ہم تیزی سے اس کچے راستے پر چل رہے تھے۔ یہاں پر اب زمین قدرے ہموار تھی اور ہماری چلنے کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ پانچ بجے کے قریب ہم ایسپنر پہنچ گئے۔ صبح ہونے والی تھی اور مسجدوں سے اذانوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں تھیں۔

اس گاؤں میں بھی رکنا ہمارے لئے بہت خطرناک تھا۔ اس لئے ہم نے راستہ چھوڑا اور پہاڑوں کی طرف بڑھنے لگے۔ ہم ایک پہاڑی پر چڑھ کر دوسری طرف جھاڑیوں کے اندر جا کر چھپ گئے۔ یہ جگہ گاؤں سے کافی دور تھی اور گھنی جھاڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔ کانٹوں والی جھاڑیاں تھیں اس لئے انہیں بھیڑ بکریاں وغیرہ نہیں کھاتی تھیں۔ یہ ہمارے لئے اچھا تھا کیونکہ اس طرف بکریاں نہ آتی اور نہ ہی ان کے پیچھے بکریاں چرانے والے چرواہے

آتے۔

دو دن ہو گئے تھے کھانا کھائے ہوئے ،لڑکے بھوک سے مر رہے تھے۔ وہ ضد کر رہے تھے کہ نیچے جا کر کھانا خرید کر لایا جائے لیکن میں ان کو منع کر رہا تھا۔ یہ چھوٹا سا گاؤں تھا اور سارے لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ یہاں جو لڑکا بھی کھانا خریدنے جاتا پکڑا جاتا۔ وہ پولیس کو اطلاع دے دیتے اور پولیس والے ہمیں ڈھونڈ لیتے۔ اس لئے ہمیں صبر کرنا تھا تا کہ زیادہ سے زیادہ ترکی کے اندر چلے جائیں۔ ہم جتنا زیادہ بارڈر سے دور ہو جاتے اتنا ہی ہمارے لئے بہتر تھا اور میں یہی چاہتا تھا۔ پانی ہمیں راستے میں آنے والے چشموں سے مل جاتا تھا اور پانی سے ہی ہم پیٹ بھر لیتے تھے۔

لڑکے اب مجھ سے جھگڑا کرنے لگے۔ بارڈر سے لے کر یہاں تک میں ان کو لے کر آ گیا تھا۔ لیکن اب وہ میری بات ماننے سے انکار کر رہے تھے۔ ہم دن کو بارہ بجے تک ادھر ہی لیٹے رہے۔ آخر بھوک سے نڈھال لڑکوں کا صبر جواب دے گیا اور ایک لڑکا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''راضی صاحب! ہم میں سے ایک لڑکا نیچے جائے اور کھانا لے کر آئے گا۔ اگر ایک رات اور بھوکے سفر کیا تو مر جائیں گے۔ اس لئے پہلے کھانا اس کے بعد آگے کی طرف سفر ہوگا۔'' اس نے غصے سے گرجتے ہوئے کہا۔

یہ وہی لڑکا تھا جس نے بارڈر پر میرا گریبان پکڑا تھا اور اب ایک بار پھر لڑنے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ دو لڑکوں کے پاس ڈالر موجود تھے اور وہ کچھ بریڈ یا بسکٹ وغیرہ خریدنے کے لئے نیچے جانا چاہتے تھے۔

''یار! صرف آج کی رات نکال لو کل کو جو بھی گاؤں آگے آئے گا ہم وہاں سے کھانا خرید لیں گے۔'' میں نے ان کو منانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں!! پہلے کھانا اس کے بعد سفر اور یہ ہم سب لڑکوں کا متفقہ فیصلہ ہے۔'' اسی لڑکے نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا

''کیا کہتے ہو احمد؟'' میں نے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ بھوک کی وجہ سے اس معصوم سے ایرانی لڑکے کا چہرہ سوکھ گیا تھا۔

''راضی بھائی! میں آپ کے ساتھ ہوں۔ کھلاتے ہو یا بھوکا رکھتے ہو کوئی گلہ نہیں، کوئی شکوہ نہیں ہے۔'' اس

نے لا پرواہی سے کہا اور دوبارہ بیٹھ گیا۔

''تو ٹھیک ہے چلو! ہم ابھی یہاں سے نکلیں گے۔'' میں نے احمد کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھڑا کر دیا۔

''میں آپ لوگوں کو یہاں تک لے آیا ہوں۔ اب آپ لوگ اپنی مرضی کے خود مالک ہیں۔ نیچے جاؤ، کھانا خریدو، کھانا کھاؤ اور اس کے بعد رات کو پھر مغرب کی طرف اپنا سفر جاری رکھنا۔ تمہارے پاس ایجنٹوں کے نمبر بھی ہیں۔ ایک رات مزید سفر کرنے کے بعد اپنے ایجنٹ کو کہیں سے فون کر لینا، وہ تمہیں آ کر لے جائے گا۔ میں اور احمد ابھی یہاں سے نکل جائیں گے۔ ہم مزید دو دن اور سفر کریں گے۔ اس کے بعد ایجنٹ سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ آپ لوگوں کی اپنی مرضی ہے، جو مرضی کرو ہم جا رہے ہیں۔'' میں نے احمد کا ہاتھ پکڑ لیا۔ احمد خاموشی سے میرے ساتھ چلنے لگا لیکن ان لڑکوں نے ہمیں روک لیا۔

''نہیں بھائی! ہم سب اکٹھے ہی جائیں گے۔ ہمیں بہت بھوک لگی ہے اس وجہ سے ہم کہہ رہے تھے لیکن اگر آپ کہتے تو ٹھیک ہے ہم کھانا لینے نہیں جائیں گے۔ آپ ہمیں چھوڑ کر مت جاؤ، ہم اکٹھے ہی آگے جائیں گے۔'' وہ لڑکے مان گئے تو ہم ایک بار پھر جھاڑیوں میں جا کر بیٹھ گئے اور رات ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

سات بجے کے قریب اندھیرا ہوتے ہی ہم جھاڑیوں سے نکل آئے اور ایک بار پھر سفر کرنے لگے۔ ہم بارڈر سے کافی دور ہو گئے تھے اس لئے اب کچی سڑک پر چل رہے تھے۔ اس سڑک پہ گاڑی وغیرہ آ سکتی تھی اور جب بھی کسی گاڑی کی لائٹس نظر آتیں تو ہم روڈ سے نیچے ہو کر جھاڑیوں میں لیٹ جاتے۔ گاڑی کے گزرنے کے بعد دوبارہ سفر شروع کر دیتے۔ ہم پہاڑوں پر نہیں چل رہے تھے بلکہ پہاڑوں کے درمیان سے گزرنے والے کچے راستے پر چل رہے تھے اس لئے ہماری رفتار بھی کافی تیز تھی۔

رات کو ایک بجے کے قریب ہم ایک اور گاؤں کے قریب پہنچ گئے۔ یہ پچھلے گاؤں سے نسبتاً بڑا گاؤں تھا۔ ستّر یا اسّی کے قریب گھر ہوں گے۔ گاؤں کے بیچوں بیچ ایک مسجد تھی اور کھیلنے کے لئے باسکٹ بال کا چھوٹا سا گراؤنڈ بھی تھا جو ہمیں گاؤں کراس کرتے ہوئے نظر آیا تھا۔ لڑکے ادھر رکنا چاہتے تھے لیکن میں نے ان کو بتایا کہ اگلا گاؤں نزدیک ہے، ادھر جا کر آرام کریں گے۔ اس گاؤں کا نام ''تیرازن'' تھا جس کا ایک پرانا سا بورڈ گاؤں کے باہر لگا ہوا تھا۔ ہم نے گاؤں کو کراس کیا اور چلتے ہوئے باہر نکلنے لگے۔

لڑکے پوری رات اگلے گاؤں کا انتظار کرتے رہے لیکن وہ گاؤں نہیں آیا۔آخر کار صبح چھ بجے کے قریب ہم گاؤں کے نزدیک پہنچ گئے۔میں گاؤں سے ایک کلومیٹر پیچھے ہی راستے سے ہٹ گیا اور پانی کے چشمے کو کراس کر کے کھیتوں کے درمیان سے گزرنے لگا۔ ہر طرف گندم کے کھیت تھے اور یہ جگہ چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھری ہوئی وادی تھی لیکن درمیان میں تقریباً سات کلومیٹر کا ایریا ہموار تھا۔ اس میں دو گاؤں ساتھ ساتھ تھے جو ایک دوسرے سے صرف دو کلومیٹر دور تھے۔

میں نے ایران سے چلنے سے پہلے مختلف دیہات کے نام اور راستے زبانی یاد کئے تھے تاکہ میں اکیلا ہی سفر کر سکوں۔ چونکہ میرے پاس ایجنٹوں کو دینے کے لئے پیسے نہیں تھے اور یہی معلومات اس وقت سفر کرنے میں بھی کام آ رہی تھیں۔اب ناول لکھنے میں بھی کام آ رہی ہیں لیکن چونکہ اس بات کو اب گیارہ سال ہو گئے ہیں اس لئے قارئین کو کہیں کوئی غلطی نظر آئے تو پلیز! نظر انداز کر دیجئے گا۔

میں ان لڑکوں کو ساتھ لے کر کھیتوں کے درمیان میں چلنے لگا۔ یہ گندم کے کھیت تھے۔آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ سردیوں میں تو گندم نہیں ہوتی، راضی جھوٹ بول رہا ہے۔ایسی بات نہیں کہ گندم صرف پاکستان میں ہی سال میں ایک بار بیجی جاتی ہے۔ بہت سارے ملکوں میں یہ دو دو بار بیجی جاتی ہے۔ جہاں تک گرمائش کا تعلق ہے تو وہ لوگ کھاد ڈال کر اس کی کمی پوری کر دیتے ہیں۔ وہاں گندم سال میں دو بار ہوتی ہے اور پاکستان کی نسبت کہیں زیادہ پیداوار دیتی ہے۔اب شاید پاکستان کے کچھ علاقوں میں بھی دو بار گندم بیجی جا رہی ہے۔

خدا کی بنائی ہوئی اس کائنات میں ہر چیز ہی پرفیکٹ ہے۔ اگر آپ صرف گندم کے دانے کو ہی دیکھ لیں تو آپ کو خدا کی خدائی کا یقین ہو جائے گا۔ یہ ایک چھوٹے سے دانے میں آٹھ دس پودے پیدا ہوتے ہیں۔جن کے سٹوں سے مزید پندرہ بیس دانے پیدا ہوتے ہیں۔یعنی گندم کا ایک دانہ صرف پانچ مہینے میں سو سے زیادہ دانے پیدا کرتا ہے۔اس فصل کو صرف ایک بار پانی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سبزیوں یا دوسری فصلوں کو بیجنے اور کاٹنے کے لئے مزدوروں کی ضرورت ہوتی ہے۔خدا نے مختلف سبزیاں بنائی ہی اس لئے ہیں کہ اس کے بیجنے اور کاٹنے سے مزدوری بنتی ہے۔ان سبزیوں کو کھیت سے نکالنے پر ہی غریب مزدور کے گھر کا چولہا جلتا ہے۔

خدا نے خوراک کا حصول آسان بنایا ہے تاکہ افرادی قوت نہ ہونے کے باعث لوگ بھوکے نہ مریں۔ایک اسی یا نوے سالہ بوڑھا بھی لاکھوں من گندم پیدا کر سکتا ہے۔خدا نے یہ گھاس اور دوسری جڑی بوٹیاں کیوں پیدا کی

ہیں۔ہم ان کو بیچتے بھی نہیں ہیں لیکن یہ پھر اُگ آتی ہیں اور ہم صبح سے شام تک ان کو نکالتے رہتے ہیں۔کیا ہی اچھا ہوتا اگر خدا نے یہ گھاس اور جڑی بوٹیاں پیدا ہی نہ کی ہوتیں۔سیدھی سیدھی سبزیاں بیچتے اور سبزیاں ہی اُگتیں، یہ گھاس نہ اُگتی۔میں نے کسّی کو نیچے رکھا اور ماتھے سے پسینہ پوچھتے ہوئے ابا سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ بیٹا! خدا کی بنائی ہوئی ہر چیز میں کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے۔اگر یہ گھاس پھوس اور جڑی بوٹیاں نہ ہوں تو غریب مزدور کو کام کہاں سے ملے گا؟ یہ روزی کا سہارا ہیں، ان سے بھی محبت کرو۔کل کو یہی گھاس اور جڑی بوٹیاں تم کو کہیں بھی بھوکا نہیں مرنے دیں گی۔

''واہ رے میرے باپ! میں نے دنیا کی ہر سچائی تم سے سیکھی۔تمہارے سکھائے ہوئے ایک ایک لفظ نے مجھے جینا سکھایا لیکن ایمان کے معاملے میں زیادتی کر گئے۔''

''راضی بیٹا! یہ سب کچھ میں نے تمہاری محبت میں کیا تھا، مجھے معاف کر دینا۔'' میرے ابو کا چہرہ ترکی کے ان پہاڑوں میں منڈلانے لگا۔

''راضی! یہ سب کچھ میں نے تمہاری محبت کے لئے کیا۔'' ان کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

''نہیں ابو! یہ محبت نہیں تھی، یہ غلطی تھی۔بہت بڑی غلطی۔۔۔جس نے میری اور ایمان دونوں کی زندگی تباہ کر دی۔نہیں ابو۔۔۔یہ کیسی محبت تھی جس میں ایک باپ اپنی بیٹی کے کپڑے پھاڑ دیتا ہے۔''

''راضی! اس دن صرف کپڑے ہی نہیں پھٹے تھے۔'' ایمان کراچی میں اس دن بہت کچھ کہہ گئی تھی۔

ایک چودہ پندرہ سال کی بچی کے اگر کپڑے پھاڑے جائیں، اس کی عزت پر حملہ کیا جائے یا اس کا ریپ کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ کونسی محبت ہے؟ جس کو بیٹی کہا جائے اور پھر اس کا ریپ کرنے کی کوشش کی جائے۔یہ سارا واقعہ اس ناول کے پہلے پارٹ ''دوسرا خدا'' میں موجود ہے۔یہ کہانی ''دوسرا خدا'' سے شروع ہوئی تھی اور یہ دوسرا پارٹ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

پاکستان سے امریکہ جانے کا فیصلہ میں نے کیوں کیا اور وہ کونسی وجوہات تھیں جنہوں نے مجھے پاکستان چھوڑنے پر مجبور کیا۔یہ سب کچھ پہلی کتاب دوسرا خدا میں موجود ہے۔دیسی کلاسک اور رومانس کی جھلک آپ کو دوسرا خدا میں ملے گی، اس لئے آپ میری وہ کتاب ضرور پڑھیں تاکہ آپ اس کتاب کو صحیح طریقے سے سمجھ سکیں۔

''نہیں ابو! یہ محبت نہیں تھی یہ کچھ اور ہی تھا۔'' میری آنکھو سے آنسو نکلنے لگے۔

''بھائی! آپ ٹھیک تو ہونا۔'' احمد نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا تو میں سوچوں کی دنیا سے باہر آ گیا۔

''سوری یار! میں خیالوں میں ہی کہیں چلا گیا تھا، اب ٹھیک ہوں۔'' میں نے دوسرے ہاتھ سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

''بھائی! آپ نے آج تک اپنا ماضی نہیں بتایا۔ آپ کی آنکھوں میں جو درد نظر آتا ہے وہ درد شاید ساری دنیا سے الگ ہے۔ اگر کبھی مجھے اس قابل سمجھو تو اپنے اس ماضی کی داستان ضرور سنانا! مجھے آپ سے محبت ہے اور میں آپ کے اس درد سے بھی محبت کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے میرا ہاتھ چھوڑا اور نیچے چلا گیا۔

لڑکے اسی گاؤں کے قریب رہنا چاہتے تھے تا کہ دن کو وہاں سے خوراک حاصل کر سکیں۔ میں نے ان کو بتایا کہ دو کلومیٹر آگے ایک اور گاؤں ہے۔ راستے میں چلتے ہوئے ہمیں سبزیوں کے کھیت بھی نظر آتے تھے اور یہ خوشی کی بات تھی کیونکہ اگر سبزی اگائی جا رہی ہے تو ظاہر ہے ان دیہات میں مزدور بھی ہوں گے جو کہ ان دیہات کی بجائے باہر سے آتے ہوں گے۔ اس کے علاوہ اتنا کم فاصلہ ہونے کی وجہ سے دونوں دیہات ایک دوسرے کے گاؤں سے بھی خریداری کرتے ہوں گے۔

اس گاؤں میں ایک انجان لڑکے کا گھومنا اور کچھ بریڈ یا بسکٹ وغیرہ خریدنا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ اگر احمد نیچے جا کر کسی دوکان سے سامان خریدتا تو احمد کو وہ کھیتوں میں کام کرنے والا مزدور ہی سمجھتے۔ احمد کرد تھا اور یہ سارا علاقہ بھی کردوں کا علاقہ تھا۔ احمد کو زبان کا بھی کوئی مسئلہ نہ ہوتا اور وہ آسانی سے سامان خرید کر لا سکتا تھا۔ میں نے لڑکوں کو سمجھایا تو وہ مطمئن ہو گئے اور تیز تیز آگے بڑھنے لگے۔

''راضی بھائی! لڑکے بہت تیز ہو گئے ہیں، کیا بولا ہے آپ نے ان لوگوں کو جو یہ اتنے تیز ہو گئے ہیں؟'' چونکہ میں نے لڑکوں سے پنجابی میں بات کی تھی اور احمد کو پنجابی یا اردو نہیں آتی تھی اس لئے اسے اس پلان کا کچھ پتہ نہیں چلا اور وہ بار بار میرے ہاتھ کو دبا کر پوچھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بھوک تو اسے بھی بہت لگی ہوئی تھی اور مسلسل تین دن سے بھوکا میرے ساتھ چل رہا تھا۔ اس کی بھی ہمت جواب دے گئی تھی۔ وہ صرف میری عزت کی وجہ سے چپ تھا اور ہمت کر کے میرا ساتھ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

''احمد صاحب! اگر میرے ساتھ چل رہے ہو تو تم کو مرنے نہیں دوں گا بھوک سے، ویسے بھی کھا کھا کر موٹے ہو گئے ہو تو کچھ چربی کم ہو جائے گی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جی جی! بہت موٹا ہو گیا ہوں۔ 45 کلوگرام وزن بہت ہوتا ہے اور آپ کے ساتھ اس ایک ہفتے میں 10 کلوگرام اور کم ہو گیا ہے۔'' وہ واقعی بہت دبلا پتلا سا لڑکا تھا۔

ہم کھیتوں کے درمیان میں موجود ایک پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ چلتے چلتے مجھے ایک چھوٹی پہاڑی نظر آئی تو ہم اس کے اوپر چڑھ گئے۔ پہاڑی پر چڑھ کر ہم دوسرے طرف ایک بہت اونچی پہاڑی پر چلے گئے۔ یہاں پر بھی کانٹے والی بہت سی جھاڑیاں تھیں۔ چونکہ یہ کھیتوں والا علاقہ تھا اس لئے یہاں بھیڑ بکریاں نہیں چرائی جاتی تھیں۔ یہ فصلیں بیجنے کا علاقہ تھا اور بھیڑ بکریوں کے لئے یہ جگہ ٹھیک نہیں تھی۔ تھوڑی سی بھیڑیں تھیں وہ بھی اپنے کھیتوں تک ہی محدود تھیں۔ ادھر ہم لڑکوں کو کوئی بھی خطرہ نہیں تھا۔

میرے اور احمد دونوں کے پاس ترکی روپے موجود تھے لیکن دوسرے لڑکوں کے پاس صرف ڈالر تھے۔ میں نے ان لڑکوں سے دس ڈالر لئے اور احمد کو 100 ترکی روپے دیئے اور اسے تاکید کی کہ صرف بریڈ اور جام ہی خریدے اس کے علاوہ اور کچھ نہ خریدے۔ پیسوں کی بچت کرے، آگے بھی کام آئیں گے کیونکہ زیادہ کچھ خریدنے سے دوکاندار کو شک بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے بہت سی نصیحتوں کے ساتھ گاؤں کا ماحول چیک کرنے کو بھی کہا۔ وہ پیسے لے کر چلا گیا۔

میں نے احمد کو تو بھیج دیا تھا اور اب خود پریشان ہو رہا تھا۔ گاؤں میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ احمد اگر پکڑا جاتا تو یہ میری غلطی تھی، احمد میری وجہ سے ہی پکڑا جاتا کیونکہ احمد کو میں نے ہی نیچے بھیجا تھا۔

اس کی واپسی دو گھنٹے بعد ہوئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں کھانے کے لفافے پکڑے ہوئے تھے۔ ہم نے لفافے کھولے تو اس میں ہر قسم کا کھانے کا سامان پڑا ہوا تھا۔ باقی لڑکے خوش ہو گئے تھے اور میرا منہ بن گیا۔ میں خاموشی سے ایک ایک بریڈ توڑ توڑ کر کھانے لگے۔ ترکی میں روٹی کی بجائے بریڈ استعمال ہوتا ہے بلکہ یہ بریڈ ترکی سے شروع ہوتے ہیں اور یورپ میں یہی بریڈ بطور روٹی کے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے نام ہر ملک میں مختلف ہوتے ہیں۔ یہ ڈبل روٹی کی طرح پھولا ہوا اور لمبا ہوتا ہے لیکن اس میں میٹھا نہیں ملایا جاتا تھا بلکہ یہ بالکل سادہ ہوتے تھے۔ یہ روٹی ہی کی ایک قسم ہوتی ہے۔ اسے توے یا تندور کی بجائے اوون میں تیار کیا جاتا ہے۔

''راضی بھائی! ناراض ہو؟'' احمد نے میرے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''نہیں! میں کیوں ناراض ہوں گا؟ کوئی بات نہیں میں خوش ہوں۔ میں خوش ہوں احمد! کیونکہ تم خوش ہو اور مجھے صرف تمہاری خوشی ہی عزیز ہے۔'' میں نے پیار سے اس کو سمجھایا۔ چھوٹا سا معصوم لڑکا تھا اگر کچھ زیادہ لے آیا تو کیا فرق پڑتا ہے۔

''کتنے پیسے لگے ہیں ٹوٹل اس کھانے پر؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''راضی بھائی! صرف 20 ترکی روپے لگے ہیں۔ فون کال پر اور ایک بوتل کوکا کولا پر۔۔۔ اصل میں ایران میں کوکا کولا نہیں ملتی ہے نا اس لئے ادھر سے میں نے خرید لی تھی۔ قسم سے بھائی! بڑی مزیدار ہوتی ہے۔'' وہ ایک بار پھر میرے گلے میں جھولنے لگا۔

''اچھا! اب پوری بات بھی بتاؤ گے یا ایسے ہی ترساتے رہو گے؟ گاؤں میں کیا ہوا تھا؟ یہ کھانا کس نے دیا ہے اور کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟ اگر خطرہ ہے تو ہم اس پہاڑی کی طرف چلے جاتے ہیں۔ پولیس والے صرف ہیلی کاپٹر سے ہی ہمیں پکڑ سکیں گے۔'' میں نے اس کے بال پکڑتے ہوئے کہا۔

''ایک منٹ بھائی! بتاتا ہوں، بال تو چھوڑو!'' اس نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں بولو! میں سن رہا ہوں۔'' میں نے اس کے بال چھوڑ دیئے تو وہ کھسک کر تھوڑا دور ہو گیا۔

''بھائی جی! سرپرائز ہے۔ دوکان پر فون بوتھ لگا ہوا تھا۔ میں نے بوتھ سے اپنے چاچا کو فون کیا تو وہ خوش ہو گئے کہ ہم ابھی تک پکڑے نہیں گئے ہیں۔ واپس جانے والے لڑکوں نے آپ کی بہت تعریف کی تھی۔ چاچا نے سپیشل آپ کا شکریہ ادا کیا ہے کہ آپ کی وجہ سے میں بچ گیا تھا ورنہ واقعی مجھے ایجنٹی کے کیس میں کم از کم دس سال کی سزا ہو جاتی۔ وہ ابھی تک ڈنکروں سے لڑ رہے تھے جو مجھے ادھر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ میرے پاؤں کی چوٹ کی وجہ سے ان لوگوں نے مجھے چھوڑا تھا ورنہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر جاتے۔''

''بس یا کچھ اور بھی؟'' وہ ایک لمحے کے لئے رکا تو میں نے پوچھا۔ ہم سب اس کی طرف کان لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک بار پھر بولنا شروع کیا۔

''واپس جانے والے لڑکوں میں سے دولڑکے مر گئے ہیں۔ پانچ لڑکوں کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں اور وہ معذور ہو گئے ہیں۔آٹھ لڑکے تہران کے بڑے ہسپتال میں ہیں اور باقیوں کو ایک دو دن تک کوئٹہ ڈی پورٹ کیا جا رہا ہے'' وہ ایک بار پھر سانس لینے کے لئے رک گیا۔

''اسی گاؤں میں میرے چاچا کا ایک ایجنٹ رہتا ہے اسی نے یہ کھانا دیا ہے اور رات کو وہ ہم کو ادھر سے نکال کر ''وان'' شہر پہنچا دے گا۔ جہاں سے دوسرے ایجنٹ ہمیں رسیو کر لیں گے اور ہمیں استنبول تک لے جائیں گے۔ ایک اور خوشخبری ہے آپ کے لئے راضی بھائی! آپ کو صرف وان شہر تک پہنچانے کی بات کی تھی چاچا نے لیکن اب مین ایجنٹ آپ کو فری میں استنبول تک لے جائے گا۔ مجھ سمیت آپ نے اس کے سات لڑکوں کو بارڈر کراس کروا کر محفوظ رکھا ہے۔ اس لئے وہ آپ سے بہت خوش ہے اور آپ کی محنت کا صلہ دینا چاہتا ہے۔'' وہ خاموش ہو کر میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

میری عجیب سی حالت تھی، آنکھوں سے خوشی کے مارے آنسو نکل آئے تھے۔ راستے میں مصیبتیں تو بہت اٹھائی تھیں لیکن میں مسلسل آگے کی طرف بڑھتا رہا۔ ایمان سچ کہتی تھی؛

''راضی! میں نے اپنی اس محبت کی قربانی تمہارے اچھے مستقبل کے لئے دی ہے اور میری قربانی اور دعائیں کبھی رائگاں نہیں جائیں گی۔ تم ایک دن امریکہ ضرور پہنچ جاؤ گے۔'' اور میں جا رہا تھا، میری مدد خدا کر رہا تھا۔ میرے پاس آگے جانے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں گھر سے صرف پانچ سو روپے لے کر نکلا تھا اور یہی پیسہ مجھے آگے کی طرف لے جا رہا تھا۔ آج میں ترکی پہنچ گیا تھا اور خدا نے استنبول تک جانے کا آسرا بھی بنا دیا تھا۔

''بھائی! روتے نہیں ہیں، دیکھو کیسے گندے بچوں کی طرح رو رہے ہو۔'' احمد نے میری آنکھوں سے آنسو صاف کئے تو میں اس کے گلے لگ کر رونے لگ گیا۔

''احمد بھائی! آپ جرمنی جا رہے ہو، بہت اچھا ملک ہے۔ آپ ابھی نوجوان ہو زندگی میں بہت کچھ کرو گے۔ بہت آگے تک جاؤ گے۔ احمد یار! کبھی محبت مت کرنا، یہ انسان کو ختم کر دیتی ہے۔ یہ وہ دیمک ہے جو آہستہ آہستہ کا پورے انسان کو کھا جاتی ہے۔ یار! کبھی بھی کسی سے محبت مت کرنا۔ اس محبت میں جو درد ہے اسے سہنے میں ساری زندگی ہی کم پڑ جاتی ہے۔ سب کچھ کرو لیکن محبت مت کرو۔'' میں اس کے گلے سے لگ کر روتا رہا۔

رات کو گیارہ بجے کے قریب پہاڑی سے نیچے سڑک پر ایک گاڑی آ کر کھڑی ہوگئی اور اس نے دو تین بار لائٹیں آن آف کر کے اشارہ دیا تم ہم پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔ آدھے گھنٹے میں ہم لڑکے نیچے روڈ پر پہنچ گئے تھے۔ سوزوکی کار میں ایک ہی آدمی تھا جو کار کو روڈ سے ایک سائیڈ پر کر کے کھڑا ہوا تھا۔ ہم اس کے پاس پہنچے تو اس نے جلدی سے ہمیں گاڑی میں بٹھایا اور کچے روڈ پر گاڑی دوڑانے لگا۔ یہاں سے وان کا سفر تقریباً 70 کلومیٹر دور تھا اور کار کو وان لے جانے میں دو گھنٹے لگ گئے۔

وان شہر ترکی کا پہلا بڑا سرحدی شہر ہے۔ یہ وان جھیل کے کنارے آباد ہے اور بہت خوبصورت ہے۔ سرسبز و شاداب پہاڑوں سے گھرا ہوا یہ شہر چار لاکھ سے زیادہ کی آبادی کا حامل ہے۔ شہر میں اکثریت کرد لوگوں کی ہے۔ یہ وہی کرد ہیں جو ایران، عراق، شام اور ترکی میں پھیلے ہوئے ہیں اور اپنے لئے ایک الگ ملک کی جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ 2006ء میں ان کا بہت ہولڈ تھا لیکن بعد میں ترکی نے ایک بہت بڑا آپریشن کر کے ان کو بکھیر دیا تھا۔ آج سیریا اور عراق میں تو کرد زور لگا رہے ہیں لیکن ایران اور ترکی میں یہ خاموش ہو گئے ہیں۔ سیریا میں تو اب داعش کے آنے کی وجہ سے حالات بہت زیادہ بگڑ گئے ہیں۔

گاڑی ہمیں وان شہر کے ایک خوبصورت سے گھر میں لے کر آ گئی۔ یہ چھوٹا سا تین کمروں کا گھر تھا جس میں اٹیچ باتھ روم بنے ہوئے تھے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار ویسٹرن باتھ روم یہاں دیکھا تھا۔ صرف میں نے ہی نہیں بلکہ باقی لڑکوں نے بھی یہی پر دیکھا تھا اور حقیقت میں ہمیں استعمال کرنے کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ ہم پانی کا ڈبہ یا لوٹا وغیرہ ڈھونڈ رہے تھے۔ میزبان نے ہمیں پانی ڈالنے اور ٹشو پیپر استعمال کرنے کا طریقہ بتایا۔ یہ ایک لمبی سی زنجیر تھی جو ٹائلٹ کے سرے پر لٹک رہی تھی اسے کھینچنے سے پانی چل پڑتا تھا۔

ہم ٹوٹل آٹھ لڑکے تھے اور ادھر تین دن تک رہے۔ ایجنٹ صرف آٹھ لڑکوں کو آگے سفر نہیں کروا سکتے تھے اس لئے ہم باقی لڑکوں کے آنے کا انتظار کرتے رہے۔ یہاں ہم لڑکے کم تھے اس لئے پیٹ بھر کر اچھا کھانا ملتا تھا۔ ہم صرف کھانا کھاتے تھے اور سوتے تھے۔ کمرے میں کارپٹ بچھا ہوا تھا اور انہوں نے ہمیں کمبل لا کر دے دیئے تھے۔ اس کے علاوہ کمرے میں ہیٹر بھی لگا ہوا تھا۔

تین دن تک ہم سکون سے ادھر پڑے رہے۔ اس کے بعد ایک دن گاڑی آ گئی۔ رات کو ہمارے میزبان نے ہمیں کار میں بٹھایا اور شہر سے باہر ایک بھیڑوں والے فارم پر لے گیا۔ ہمیں وہیں اتار کر اس نے باری باری

سب سے ہاتھ ملایا اور گاڑی لے کر چلا گیا۔

فارم پر موجود ایک بڑی بڑی مونچھوں والے آدمی نے ہمیں لیا اور اندر آ گیا۔ یہاں پر پچاس کے قریب لڑکے بیٹھے ہوئے تھے، ہم بھی ان کے ساتھ جا کر بیٹھ گئے۔ تین دن بڑی مہمان نوازی کے مزے لے لئے تھے اور اب پھر سے اپنی اوقات پہ آ گئے۔ میں نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔ احمد میرے ساتھ جڑ کر بیٹھ گیا۔

''شکریہ رضوان بھائی! آپ کی وجہ سے ہم یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔'' میں نے آنکھیں کھول کر اس لڑکے کو دیکھا یہ وہی لڑکا تھا جس نے ایران میں میرا گریبان پکڑا تھا اور اب میرا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس آیا تھا۔

''کوئی بات نہیں یار! آپ لوگوں کی وجہ سے مجھے بھی استنبول تک کا آسرا مل گیا ہے۔ ورنہ میرے پاس تو کھانا کھانے کے پیسے بھی نہیں تھے۔'' میں نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔

''راضی بھائی! میں تو آپ کو ''تھینک یو'' نہیں بولوں گا کیونکہ بھائیوں کو کوئی بھی تھینک یو نہیں بولتا؟'' احمد نے میرے بازو کو نیچے کیا اور اس پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ میں بے اختیار مسکرانے لگا۔

وہ رات ہم نے وہیں گزاری اور دوسرے دن مزید 60 لڑکے وہاں آ گئے۔ اب ہم یہاں 120 لڑکے ہو گئے تھے۔ وہ دن ہم نے وہیں گزارا۔ اگلے دن بارہ بجے ٹماٹروں والے موٹے چاول سب کو کھلائے گئے۔ رات کو دس بجے کے قریب ایک بڑا ٹرالر آیا اور ہم سب لڑکے اس کے اندر گھس گئے۔ اس پر لوہے کے پائپ لگے ہوئے تھے اور اوپر ترپال سے بند کیا گیا تھا۔ 120 لڑکے لوہے کے پائپوں کو تھام کر کھڑے ہو گئے۔ ٹرالر نے چلنا شروع کیا اور تھوڑی دیر بعد وہ مین ہائی وے پر فل رفتار سے اڑا چلا جا رہا تھا۔

یہ سفر اتنا مشکل ثابت نہیں ہوا۔ راستے میں ایک چیک پوسٹ کو کراس کرنے کے لئے ہمیں نیچے اتارا گیا اور تین گھنٹے پیدل چلتے ہوئے ہم نے اس چوکی کو کراس کر لیا۔ لڑکے کھیتوں کے درمیان سے گزرتے رہے۔ اس بار صرف دو ڈنکر ہمارے ساتھ تھے۔ انتہائی تیزی سے سفر کرتے ہوئے ہم نے چوکی کراس کی اور آگے جا کر پھر ٹرالر میں بیٹھ گئے۔ اس بار ٹرالر صرف ایک گھنٹہ ہی چلا اور ہمیں ''ارزم'' شہر سے باہر ایک چھوٹے سے گاؤں میں لے گیا۔

یہ بہت بڑا احاطہ تھا اور ہم سے پہلے بھی لڑکے ادھر موجود تھے جو دوگو بیاز سے آئے تھے۔ ایران کے ماکو شہر سے جو لڑکے ڈنکی لگاتے ہیں وہ دوگو بیاز آتے ہیں اور دوگو بیاز سے پھر وہ ارزم آتے ہیں۔ سلماس والے بھی وان پہنچتے ہیں اور پھر وان سے ارزم آ جاتے ہیں۔ ارزم میں سارے لڑکے اکٹھے ہو جاتے ہیں اور پھر آگے کی طرف اکٹھے سفر کرتے ہیں۔

ارزم وان شہر سے 26 کلومیٹر مغرب کی طرف ہے۔ سمندر سے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع اس شہر کی آبادی چار لاکھ کے قریب ہے۔ دو سِروں والا عقاب اس شہر کی علامت ہے۔ ملک کی چند بڑی یونیورسٹیوں میں سے ایک وناترک یونیورسٹی اسی شہر ارزم میں ہے جس میں چالیس ہزار سے زیادہ طالب علم پڑھتے ہیں۔ جسمانی کھیلوں کے لئے یہ ترکی کا سب سے بڑا شہر ہے۔ ارزم نابوکو پائپ لائین کا سٹارٹنگ پوائنٹ ہے۔ یہ پائیپ لائین کیپسن سی سے نیچرل گیس حاصل کرتی ہے اور پورے ترکی کو کراس کرتی ہوئی اور یلغاریہ سے ہوتی ہوئی دوسرے یورپی یونین ممالک تک جاتی ہے۔

صبح کے چار بج چکے تھے۔ لڑکے احاطے میں بیٹھنے کے لئے جگہ تلاش کرنے لگے۔ یہ بہت بڑا احاطہ تھا اور اس احاطے میں تین سو کے قریب لڑکے موجود تھے اس لئے اتنا بڑا احاطہ ہونے کے باوجود جگہ کم ہوگئی تھی۔ لڑکے ایک دوسرے کے بیچ میں گھس کر لیٹے ہوئے تھے۔ لڑکوں کے پیروں کی بدبو سے دماغ پھٹ رہا تھا۔ یہاں پر سارے لڑکے پاکستانی یا افغانی تھی۔ احمد اتنے سارے لڑکوں کو دیکھ کر کچھ گھبرا گیا تھا کیونکہ وہاں صرف وہ اکیلا ہی ایرانی تھا اور باقی ہم سب اردو یا پشتو بولتے تھے۔ افغانی لڑکے فارسی بھی بولتے تھے لیکن احمد ان کی بجائے میرے ساتھ ساتھ لگا ہوا تھا۔

میں نے احاطے میں ایک جگہ دیکھی اور ادھر جا کر بیٹھ گیا۔ احمد بھی میرے پاس بیٹھ گیا۔ دس منٹ تک ایسے ہی بیٹھے رہنے کے بعد لڑکے تھوڑے ہلے جلے تو ایک آدمی کے لیٹنے کی جگہ بن گئی۔ میں نے احمد کو لیٹ جانے کو کہا تو اس نے اپنا سر میری گود میں رکھا اور لیٹ گیا۔ صرف آدھے گھنٹے میں ہی وہ لڑکا دنیا و مافیہا سے بے خبر میری گود میں سر رکھے سو رہا تھا۔ احمد کے سونے کے تھوڑی دیر بعد ہی میں بھی ادھر بیٹھا بیٹھا سو گیا۔ دن کو دس بجے کے قریب کچھ لڑکے اٹھ گئے تو مجھے بھی تھوڑی جگہ مل گئی اور میں ادھر ہی لیٹ گیا۔

میری آنکھ دن کے تین بجے کے قریب کھلی۔ احمد ابھی تک سو رہا تھا۔ میں نے آہستگی سے اس کا سر اٹھایا اور

ایک لڑکے کے بیگ پر رکھ دیا۔ وہ ذرا سا کسمسا یا اور دوبارہ سو گیا۔تھوڑی دیر بعد ہاؤس انچارج بریڈ کے پیکٹ لے کر آ گیا اور ہر لڑکے کو ایک ایک بریڈ دینے لگا۔ میں نے اپنی اور احمد کی بریڈ لے لیں اور احمد کو سونے دیا کیونکہ رات کو پھر سفر کرنا تھا اس لئے میں نے اس کو اٹھانا مناسب نہ سمجھا۔تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی اٹھ گیا تو ہم دونوں نے مل کر پانی کے ساتھ بریڈ کھائی اور خدا کا شکر ادا کیا۔

رات کو ایک ٹرالر آیا اور 100 لڑکوں کو لے کر چلا گیا۔ اس رات ہمارا نمبر نہیں لگا اور ہم ادھر ہی رہے۔ اس رات سونے کے لئے جگہ مل گئی تھی۔ ہم دونوں کو احاطے کا ایک کونہ مل گیا اور ہم دیوار کے ساتھ لگ کر سو گئے۔ دن کو پانچ بجے کے قریب مزید پچاس لڑکے ادھر آ گئے اور ایک بار پھر جگہ تنگ ہو گئی لیکن پھر بھی ہمارے لیٹنے کے لئے کافی تھی۔ ہم دن بارہ بجے تک سوتے رہے اور اس کے بعد میں اٹھ کر مختلف لڑکوں کے ساتھ گپ شپ لگاتا رہا۔

بہت سے لڑکے سیالکوٹ کے بھی تھے۔ ہمارے بہاولپور سے تو کوئی بھی لڑکا ان دنوں یورپ کے لئے نہیں نکلتا تھا لیکن سیالکوٹ سے بہت زیادہ لڑکے آئے ہوئے تھے۔ میں نے اپنا سارا بچپن سیالکوٹ میں ہی گزارہ تھا اس لئے مجھے سیالکوٹ کی ساری گلیوں اور دیہات کا پتہ تھا۔ کچھ لڑکے ایمان کے شہر گجرات کے بھی تھے اور میں ان لڑکوں کو عقیدت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ احمد بھی میرے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اسے ہماری زبان کی سمجھ تو نہیں آتی تھی لیکن وہ پھر بھی میرے ساتھ چپکا رہتا تھا۔

رات کو دس بجے کے قریب دو ٹرالر آ گئے اور اس بار ایک ٹرالر میں ہماری بھی باری آ گئی۔ یہ سبزیوں والا ٹرالر تھا اور اس ٹرالر میں ہم تقریباً 100 سے زیادہ لڑکے تھے جو ایک دوسرے سے جڑے کھڑے تھے۔ ٹرالر ہمیں لے کر ''ارشم'' سے 170 کلومیٹر دور ''ارزنکن'' کی طرف لے کر جا رہا تھا۔ یہ شہر دریائے ایفریٹ کے کنارے آباد ہے۔ ایک لاکھ سے زیادہ آبادی والے اس شہر کو ہاتھ سے بنی کاپر کی اشیاء کی وجہ سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہ شہر ٹیکسٹائل کی بہت بڑی مارکیٹ ہے اور یہاں کپڑے کے بہت بڑے بڑے کارخانے ہیں۔ سادہ الفاظ میں یہ ترکی کا فیصل آباد ہے۔

تین گھنٹے میں ٹرالر ہمیں ارزنکن لے آیا تھا لیکن ہماری منزل ارزنکن نہیں تھی بلکہ ارزنکن سے 230 کلومیٹر دور ''سیواس'' شہر تھا۔ ریڈ ریور کے کنارے آباد اس شہر کی آبادی ساڑھے چار لاکھ کے قریب ہے۔ 13355 کلومیٹر لمبا یہ دریا ترکی کی پن بجلی کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ یہ دریا سواس کے پہاڑوں سے نکلتا ہے اور جھیل تز

سے ہوتا ہوا بلیک سی میں جا کر گرتا ہے۔ یہ شہر ریلوے لائن کے ذریعے ایران اور عراق میں تجارت کا ذریعہ بھی ہے۔ سیواس سنٹرل ترکی کا ایک بڑا شہر ہے اور بہت خوبصورت بھی ہے۔

صبح کے پانچ بجے ہمیں سیواس شہر سے باہر ایک بہت بڑے شیڈ میں لے جایا گیا۔ یہ ایک طرح کا گیراج تھا جو کھیتی باڑی کے اوزار اور ٹرالر وغیرہ کھڑے کرنے کے کام آتا تھا۔ گیراج کا مالک سبزی کا کام کرتا تھا۔ اس گیراج میں ہم نے چار دن گزارے۔ ہر روز لڑکے اس گیراج میں آتے تھے اور آگے مختلف شہروں کی طرف روانہ ہو جاتے تھے۔ یہاں سے لڑکے ''انقرہ'' کی طرف جاتے تھے، جہاں سے استنبول اور پھر یونان چلے جاتے تھے۔ دوسرا راستہ ''کونیا'' کا تھا جہاں سے ازمیر یا استنبول جایا جاتا تھا۔ استنبول سے پیدل ڈنکی لگتی تھی جو یونان کے شہر الیگزنڈر را پلی چلا جاتا ہے۔ ازمیر سے سپیڈ بوٹ کی مدد سے یونان میں داخل ہوا جاتا ہے۔

''راضی بھائی! ایک بار یونان میں داخل ہو گئے تو پھر واپس تو نہیں آیا جاتا نا؟'' احمد نے روٹی کا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار! یہاں سے کوئی لڑکا بھی ڈی پورٹ نہیں ہوتا۔ ایک بار یونان پہنچ گئے تو اپنے ملکوں کو ڈی پورٹ ہونے کا ڈر ختم ہو جائے گا۔ یونان یورپی یونین کا ایک امیر ملک ہے۔ یہاں پہ رہ کر مزدوری کر و تو آگے کے سفر کے لئے کافی پیسے بن جاتے ہیں۔ تم بھی ایک سال ادھر ہی کام کر لینا! پیسے بن جائیں گے تو آگے جرمنی چلے جانا۔ میں نے یونان سے آگے میکسیکو کی ٹرائی کرنی ہے۔ ادھر سے میکسیکو جانا نسبتاً آسان ہے۔ دو سال تک میں اتنے پیسے کمانے میں کامیاب ہو جاؤں گا کہ آگے میکسیکو جا سکوں۔ میکسیکو سے آگے امریکہ کا بارڈر کراس کرنے کی کوشش کروں گا۔''

پانچویں دن آخر خدا خدا کر کے ہماری باری آ گئی۔ باہر ایک بار پھر آئل ٹینکر آ کر کھڑا ہوا تھا۔ میں آئل ٹینکر دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس آئل ٹینکر نے ایران میں دو لڑکوں کی جان لی تھی اور اب ایک بار پھر موت سامنے نظر آ رہی تھی۔

''احمد واپس چلو! ہم نے اس میں نہیں جانا ہے۔'' میں نے احمد کا بازو پکڑا اور اسے واپس شیڈ میں لے گیا۔ احمد خاموشی سے میرے ساتھ اندر چلا گیا۔

''اے! کیا ہوا ہے؟ تم اندر کیوں نہیں بیٹھ رہے ہو؟ میں یہ سب کھانا اور رہائش فری میں نہیں دے رہا جو تم

اپنی مرضی کرر ہے ہو۔تمہاری مرضی کی گاڑیاں نہیں آئیں گی تم کو لینے کے لئے۔۔۔ یہاں سب سے سیف یہی ٹینکر ہے۔'' ترکی ہاؤس انچارج نے میرا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں! یہ موت ہے۔ ایران میں ہم نے اسی ٹینکر میں دولڑکوں کو اپنی آنکھوں سے مرتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں اس میں نہیں جاؤں گا۔'' میں نے اس سے اپنا بازو چھڑوالیا۔احمد میرے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔

''چپ کر کے اس ٹینکر میں بیٹھ جاؤ! کوئی لڑکا بھی اس میں نہیں مرتا ہے۔ پچھلے ایک سال سے یہ ٹینکر چل رہا ہے اور آج تک کوئی بھی لڑکا اس میں نہیں مرا ہے۔تم زیادہ ہی نازک ہو گئے ہو؟'' اس نے ایک تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

''میں اس میں نہیں بیٹھوں گا چاہے جو مرضی ہو جائے۔ہم ایک دودن مزید انتظار کریں گے لیکن اس میں نہیں جائیں گئے۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''تم مجھ کو جانتے نہیں ہو! اگر اس ٹینکر میں نہ بیٹھے تو میں مار کر پھینک دوں گا اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ کدھر گم ہو گئے۔تمہاری مائیں ساری زندگی یونان سے آنے والے لڑکوں کو تمہاری تصویریں دکھا دکھا کر پوچھتی رہیں گی کہ میرے بیٹوں کو تو نہیں دیکھا؟ چپ کر کے بیٹھ جاؤ کیونکہ اگر ایک لڑکا اعتراض کرے گا تو باقی بھی نہیں بیٹھیں گے۔'' واقعی سات آٹھ اور لڑکے بھی ٹینکر سے باہر نکل آئے اور وہ بھی نہیں جارہے تھے۔

''تم مجھے ماردو! اُدھر بھی مرنا ہے اور یہاں تمہارے ہاتھوں بھی لیکن میں اس میں نہیں جاؤں گا۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے میری گردن پکڑی ہوئی تھی اور اسے دبا رہا تھا۔ سانس بند ہونے کی وجہ سے مجھے کھانسی آگئی اور میں کھانسنا شروع ہو گیا۔صرف کچھ لمحوں کے دباؤ سے ہی میری آنکھوں سے پانی نکل آیا تھا۔

''اس کے نیچے جا کر سوراخ دیکھ لو! ہوا گزرتی ہے، یقین کرو یہ بہت محفوظ ہے۔کوئی لڑکا نہیں مرتا اس میں!'' ترکی ہاؤس انچارج نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

اسے مجھ پر ترس آگیا تھا۔ میں نے ایک نظر دیکھنے کا ارادہ کیا اور ٹینکر کے نیچے لیٹ کر دیکھنے لگا۔ واقعی آٹھ سوراخ ہونے کی وجہ سے ہوا گزر سکتی تھی۔ پہلے والے ٹینکر میں صرف دو سوراخ تھے اور اسی وجہ سے لڑکے مرے تھے۔ یہاں بہت زیادہ تھے اور ہوا کا گزر آسانی سے ہو سکتا تھا۔

''بھائی! کونیا تک جارہا ہوں۔صرف پانچ گھنٹے کا راستہ ہے اور اگر حالات ٹھیک ہوئے اور زیادہ سختی نہ ہوئی

تو آگے برسا تک لے جاؤں گا۔استنبول سے صرف دو گھنٹے دور۔۔۔سوچ لو! آدھا ترکی ایک جھٹکے میں کراس کر جاؤ گے۔لڑکے ہزاروں طرح کے خطرات برداشت کرتے ہوئے چار چار دن کی ڈنکیاں لگا کر پہنچتے ہیں برسا تک اور آپ ایک رات میں پہنچ جاؤ گے۔مرضی ہے اب آپ کی، اب کی بار نہیں روکوں گا۔'' ہاؤس انچارج نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔میں نے احمد کی طرف دیکھا۔اس کی آنکھوں میں اقرار تھا۔اس کا دل ٹینکر میں بیٹھنے کو کر رہا تھا لیکن صرف میری وجہ سے چپ تھا۔

''کیا کہتے ہو احمد! بیٹھنے کا ارادہ ہے؟'' میں نے احمد سے پوچھا تو وہ آگے آ گیا۔

''راضی بھائی! جب انسان محبت کرنے لگتا ہے تو اس کا اپنا اختیار ختم ہو جاتا ہے۔میری مرضی اب آپ کی مرضی میں ہے! جو آپ کا دل ہو وہ آپ فیصلہ کریں۔مجھے آپ کا ہر فیصلہ قبول ہوگا۔'' اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے چلتے ہیں، ایک بار ٹرائی تو کریں گے شاید اس بار زندگی نے ایک بہتر موقع دیا ہو۔'' میں احمد کو لے کر آئل ٹینکر میں بیٹھ گیا۔باقی لڑکے بھی خاموشی سے اندر آ گئے۔ڈرائیور نے ٹینکر کے ڈھکن بند کر دیئے اور ٹینکر سٹارٹ کر کے کونیا کی طرف بڑھنے لگا۔

سواس سے کونیا پانچ گھنٹے کا سفر تھا۔جلال الدین رومی کا یہ شہر صوفی ازم کی نشانی جانا جاتا ہے۔بارہ لاکھ کی آبادی والے اس بڑے شہر کی تعریف کے لئے صرف رومی کا لفظ ہی کافی ہے۔یہ بہت بڑا شہر تھا۔مولانا رومی ساتویں صدی کا سب سے بڑا شاعر تھا۔جس کی شاعری کا تقریباً دنیا کی سبھی بڑی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

ہم لوگ کونیا کراس کر کے آگے بڑھ گئے تھے۔حالات ٹھیک تھے اور ڈرائیور ایک بڑا رسک لینے کے موڈ میں تھا۔اس لئے وہ کونیا سے آگے بڑھ گیا۔اب اس کی اگلی منزل برسا تھی۔

ٹینکر میں بیٹھے ہوئے ہمیں چھ گھنٹے گزر چکے تھے۔آٹھ سوراخوں نے ہم لڑکوں کو مرنے تو نہیں دیا تھا لیکن پھر بھی اتنے لڑکوں کے لئے یہ ناکافی تھے۔گرمی بہت زیادہ ہوگئی تھی۔لڑکوں نے کپڑے اتار دیئے تھے اور بمشکل سانس لینے کی کوشش کر رہے تھے۔گرمی کی وجہ سے سارے جسم سے پسینہ نکل رہا تھا اور حلق خشک ہو گئے تھے۔یہ سفر بھی قیامت ہی لگ رہا تھا۔احمد بار بار میرا ہاتھ دبا رہا تھا اور زندہ رہنے کی تگ و دو کر رہا تھا۔مجھے تو بس زیادہ احمد

کی فکر ہو رہی تھی۔

گنجائش سے بہت زیادہ لڑکے بٹھانے کی وجہ سے ہم سب ایک دوسرے کے اوپر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایران والا منظر بار بار میرے سامنے آ رہا تھا۔ مجھے اپنے فیصلے پر پچھتاوہ ہونے لگا۔ مجھے ٹینکر میں کبھی بھی نہیں بیٹھنا چاہیے تھا۔ ٹینکر سارے کا سارا ابھی نیچے سے کھلا ہو پھر بھی اندر گھٹن ضرور ہوتی ہے۔ احمد بے حس وحرکت میرے ساتھ لگ کر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ اس کی گردن کے گرد حائل کیا ہوا تھا اور آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہا تھا۔

''راضی بھائی! اگر میں ادھر ہی مر گیا تو میرے لئے ایک بار جرمنی ضرور جانا اور دیوارِ برلن کے اوپر کھڑے ہو کر مجھے ضرور پکارنا! میں جہاں بھی ہوں گا جنت یا دوزخ میں۔۔۔ تمہاری آواز ضرور سنوں گا اور تمہاری آنکھوں سے جرمنی دیکھوں گا۔ بھائی! میں مر رہا ہوں۔ اس ملک کی خاطر مر رہا ہوں جس کے سپنے میں نے ساری زندگی دیکھے ہیں۔'' اس کی آواز بہت دھیمی ہو گئی تھی۔

''نہیں احمد! مرنا نہیں ہے۔ یہ جگہ مرنے کے لئے نہیں ہے۔۔۔۔ تمہاری عمر مرنے کے لئے نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ ہی جرمنی دیکھو گے جس کے خواب دیکھتے ہو۔ بس مرنا نہیں ہے، میری زندگی میں پہلے ہی بہت دکھ ہیں اور تمہارا دکھ برداشت نہیں کر سکوں گا۔'' میں نے بیٹھے بیٹھے احمد کو گلے لگا لیا اور اسے جھنجھوڑنے لگا۔ میری آنکھوں سے لگا تار آنسو نکل رہے تھے اور میں روئے چلا جا رہا تھا۔

''احمد! میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔'' احمد میری گود میں پڑا تیز تیز سانس لے رہا تھا۔

آکسیجن اس ٹینکر میں بہت کم ہو گئی تھی اور وہ ساری آکسیجن اپنے پھیپھڑوں میں بھر لینا چاہتا تھا۔ میں احمد کے سینے کی مالش کر رہا تھا اور زور زور سے چیخ رہا تھا لیکن میری آواز اس ٹینکر سے باہر نہیں جا رہی تھی۔ ٹینکر اپنی پوری رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ احمد پوری رات گرمی اور حبس سے تڑپتا رہا اور اس معصوم سے لڑکے کو دیکھ دیکھ کر میں اپنی تکلیف بھول گیا تھا اور صرف اسی کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔

میں نے اس دنیا میں صرف ایمان کی محبت کی دعائیں مانگی تھیں۔ کبھی زندگی میں خدا سے کچھ نہیں مانگا تھا۔ لیکن اس لڑکے کے لئے آج میں خدا سے مانگ رہا تھا۔ خدا اپنے وجود کا احساس دلا رہا تھا اور اپنی طاقت دکھا رہا

تھا۔کو نیا سے برسا جانے والے اس آئل ٹینکر میں سبھی اپنی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے لیکن صرف ایک میں ہی تھا جو اپنی بجائے احمد کی جان کی حفاظت مانگ رہا تھا۔شاید آج میرے بس میں ہوتا تو اپنی جان دے کر احمد کی جان بچا لیتا۔میرے پیچھے کوئی نہیں تھا اور میں سب کو پیچھے چھوڑ کر آ گیا تھا۔کسی کو بھی میری خبر نہیں تھی لیکن اس احمد کے پیچھے ہر کوئی تھا۔اگر آج یہ ادھر مر جاتا تو شاید میں ساری زندگی ایسے ہی بھٹکتا رہتا۔

آخر خدا کو ہماری حالت پر رحم آ گیا اور ٹینکر کی رفتار آہستہ ہونا شروع ہو گئی اور ٹینکر چلتے چلتے رک گیا۔دن کی روشنی سوراخوں سے باہر آ رہی تھی۔دن کے دس بجے کے قریب ٹائم ہو گیا تھا۔ہم رات کو دس بجے ادھر سے چلے تھے اور اب دن کے دس بج چکے تھے۔ہمیں اس ٹینکر میں پورے بارہ گھنٹے گزر گئے تھے۔

ٹینکر رکا تو ہم سب لڑکے زور زور سے چیخنے چلانے اور ٹینکر کی دیواروں کو کھٹکھٹانے لگے۔باہر پولیس بھی ہو سکتی تھی لیکن موت کا خوف پکڑے جانے کے خوف سے زیادہ تھا۔اس وقت صرف اس موت کے ٹینکر سے باہر نکلنے کی جلدی تھی۔جان بچ جاتی،بے شک واپس ڈی پورٹ ہو جاتے لیکن ادھر مرنا کسی کو بھی نہیں تھا۔اس لئے سب لڑکے زور زور سے چلا رہے تھے اور ٹینکر کھٹکھٹا رہے تھے۔

ٹینکر صرف ایک منٹ ہی رکا تھا اور اس کے بعد پھر سے چلنا شروع ہو گیا۔ہم سب کھڑے ہو گئے اور زور سے چلانے لگے۔ڈرائیور ہماری چیخیں سن رہا تھا لیکن انجان بنا ہوا تھا۔میرے ہاتھوں میں احمد جھول رہا تھا اور بے ہوش ہو گیا تھا۔ٹینکر تھوڑا سا چلا اور پھر بند ہو گیا۔ایک منٹ بعد ہی اس کے دونوں ڈھکن کھول دیئے گئے۔لڑکے جلدی جلدی باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔دو ڈھکن تھے اور ان میں سے ایک لڑکا ایک ٹائم پر نکل سکتا تھا اس لئے ایک ایک کر کے لڑکے باہر نکلنے لگے۔

''احمد!احمد!ہوش کرو یار!ہم پہنچ گئے ہیں۔'' میں احمد کو گلے سے لگائے مسلسل جھنجھوڑ رہا تھا۔

نیم بے ہوش احمد آہستہ آہستہ ہوش میں آ رہا تھا۔جب سب لڑکے باہر نکلے تو پیچھے صرف سات آٹھ ایسے لڑکے رہ گئے تھے جو بے ہوش تھے۔ڈرائیور ایک آدمی کے ساتھ نیچے اترا اور اس نے لڑکوں کو اوپر اٹھانا شروع کر دیا۔وہ لڑکے اوپر سوراخ تک کرتے اور آگے سے ایک آدمی ان کو اوپر اٹھا کر سوراخ سے باہر نکال لیتا۔ایک آدمی نے میرے ساتھ مل کر احمد کو اٹھایا اور باہر لے گئے۔احمد کے پیچھے پیچھے میں بھی باہر نکل گیا۔احمد اب ٹھیک ہو گیا تھا۔میں احمد کے نزدیک کھڑا ہو کر نیلے آسمان کو دیکھنے لگا۔

’’راضی بھائی! آپ سچ کہتے تھے کہ ٹینکر زندگی اور موت کا سفر ہوتا ہے۔یقین کریں اس وقت میرا دل ٹینکر میں بیٹھنے کو کر رہا تھا اور مجھے معلوم ہے کہ آپ کو بھی پتہ چل گیا تھا کہ میں جانا چاہتا ہوں، اس لئے آپ نے ہاں کر دی تھی۔لیکن یقین کرو! یہ میری زندگی کا سب سے خطرناک سفر تھا اور اس سفر میں میں مرتے مرتے بچا۔‘‘ اس نے مجھے گلے سے لگا لیا۔

’’پچھلے ایک سال سے یہ ٹینکر چل رہا ہے اور آج تک ایک بھی لڑکا نہیں مرا ہے۔‘‘ واقعی وہ ٹینکر مارتا نہیں تھا بلکہ صرف انسان کو موت کے اتنا قریب کر دیتا تھا کہ وہ اپنے سارے گناہوں سے توبہ کر کے پکا مسلمان ہو جاتا تھا اور آنے والی زندگی میں بالکل پاک باز اور سیدھا مسلمان بننے کا وعدہ کر لیتا تھا۔

ہم برسا پہنچ گئے تھے۔ 25لاکھ کی آبادی والے اس شہر کو گرین برسا کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔مرمرسی کے کنارے آباد یہ شہر ترکی کے خوبصورت ترین شہروں میں سے ایک ہے۔مرمرسی ایک چھوٹا سا سمندر ہے جس کے ایک کنارے پر استنبول اور دوسرے کنارے پر برسا شہر آباد ہیں۔ یہ سمندر بلیک سی اور ایجیس سی کو آپس میں ملاتا ہے۔ترکی کا یہ شہر آٹو موبائل انڈسٹری، ٹیکسٹائل اور فوڈ انڈسٹری کا مین شہر ہے۔فریش فوڈ اور ڈبوں میں پیک ٹن فوڈ کی بڑی بڑی انڈسٹریاں اسی شہر میں ہیں۔

یہ ایک بہت بڑا گائے کا فارم تھا جس کی دیواریں 10 فٹ کے قریب اونچی تھیں۔احاطے میں ایک طرف چار کمرے بنے ہوئے تھے۔ہمیں کمروں میں لے جانے کی بجائے باہر ہی بٹھا دیا گیا اور ہم احاطے کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ یہاں پر ایک موٹر لگی ہوئی تھی۔ہم سب لڑکے باری باری ادھر سے جا کر پانی پیتے رہے اور واپس آ کر بیٹھتے رہے۔

’’تم میں سے ایران سے کون سے دو لڑکے آئے ہیں؟‘‘ ہاؤس انچارج نے آ کر اونچی آواز میں کہا تو میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

’’جی! ہم دونوں ایران سے آئے ہیں۔‘‘ میں احمد کو لے کر کھڑا ہو گیا۔

’’آپ میں سے استنبول کس نے جانا ہے اور آگے یونان تک کون جا رہا ہے؟‘‘ وہ ایک بار پھر پوچھنے لگا۔

’’جی! میں استنبول تک جا رہا ہوں اور یہ یونان تک جائے گا۔‘‘ میں نے احمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

کہا۔

''استنبول کہاں جاؤ گے؟ ڈرائیور آپ کو اتار دے گا۔'' اس نے کاپی پنسل نکال لی اور لکھنے لگا۔

''آپ استنبول میں جدھر مرضی اتار دیں، آگے میں خود ہی چلا جاؤں گا۔'' میں نے نارمل لہجے میں کہا۔

'ٹھیک ہے! ابھی آدھے گھنٹے تک کار آ جائے گی اور آپ کو لے کر استنبول چلی جائے گی۔ منہ ہاتھ اچھی طرح دھولیں، آپ کو استنبول میں اتار کر کار آگے چلی جائے گی۔'' وہ دوسرے لڑکوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''راضی بھائی! میں ابو کو فون کرتا ہوں، وہ تمہارے پیسے بھی بھر دیں گے۔ ایک منٹ ٹھہرو! میں بات کرتا ہوں پھر دونوں بھائی اکٹھے ہی یونان جائیں گے۔'' وہ ہاؤس انچارج کی طرف جانے لگا تو میں نے اس کا بازو پکڑ کر روک لیا۔

''نہیں!'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''بھائی! آپ صرف ایک منٹ ٹھہرو! میں سب ٹھیک ٹھیک کروں گا۔'' وہ ایک بار پھر جانے لگا لیکن میں نے اسے روک لیا۔

''نہیں احمد! مجھے تمہارا ساتھ نہیں چاہیے۔ تم بہت اچھے ہو، مجھ سے محبت بھی بہت کرتے ہو لیکن میں کسی سے محبت نہیں کرتا بلکہ میں محبت کر بھی نہیں سکتا۔'' میں نے اس کا بازو پکڑا اور اسے اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔

''احمد! پاکستان میں میرے تین بھائی اور ایک بہن ہے۔ میرے ماں باپ بھی ہیں لیکن میں نے ان سب کو چھوڑ دیا ہے۔ میں کسی سے محبت نہیں کرتا، مجھے محبت کرنا ہی نہیں آتی۔ میں نے زندگی میں صرف ایک ہی شخص سے محبت کی ہے، عشق کیا ہے، ٹوٹ کر چاہا ہے اور اتنا چاہا ہے کہ اب کسی اور کی چاہت ہی باقی نہیں رہی۔ تم میرے لئے کچھ بھی نہیں ہو۔۔۔ صرف راستے میں آنے والے ایک مسافر تھے، ایک ساتھی تھے جو کچھ دیر ساتھ رہے۔ اچھا وقت گزرا تمہارے ساتھ۔۔۔۔ زندگی میں ہمیشہ یاد رہو گے لیکن تمہارے لئے میں اپنا سفر اپنی منزل نہیں چھوڑ سکتا۔ تم مجھے میرے راستے سے بھٹکا نہیں سکتے۔'' احمد نے اپنی نظریں جھکا لیں تھیں اور وہ زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''احمد! جس محبوب سے میں محبت کرتا ہوں اس کے سامنے اس پوری دنیا کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔اس لئے میرے بھائی! تم اپنی زندگی جیئو۔ جرمنی جا رہے ہو، میری دعا ہے کہ جرمنی میں ہمیشہ خوش رہو۔اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ میں اکیلا گھر سے نکلا تھا اور اکیلا ہی اپنے محبوب کے خواب کو پورا کروں گا۔ میں امریکہ کے اس خدا کو تلاش کروں گا جو نیو یارک کے پانیوں میں اپنے ہاتھ پھیلائے شاید میرا ہی انتظار کر رہا ہے۔اس سفر میں مجھے کسی کا بھی ساتھ نہیں چاہیے اور نہ ہی کسی کا سہارا چاہیے بلکہ میں خود ہی راستے تلاش کرلوں گا۔'' میں نے اس کا بازو چھوڑا اور پلٹ کر پانی کی موٹر کی طرف جانے لگا۔

''راضی!'' اس نے مجھے پیچھے سے آواز دی تو میں مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا بات ہے احمد؟'' میں نے نارمل لہجے میں کہا۔

میری آنکھوں سے آنسو باہر نکلنے کے لئے بے تاب تھے لیکن میں ثابت قدم رہا۔ مجھے کسی بھی حالت میں احمد پر اپنی کمزوری ظاہر نہیں کرنی تھی۔ وہ لڑکا اگر مجھ سے تھوڑی سی نفرت کرتا تو یہ اس کے لئے زیادہ آسان ہو جاتا کیونکہ میں اس کے ساتھ نہیں جا سکتا تھا۔ترکی سے یونان جانے کا بہت پیسا لگتا تھا اور احمد کا غریب باپ صرف احمد کے پیسے ہی دے سکتا تھا۔ میں اس پر مزید بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔

''راضی!'' وہ میرے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

''جانتے ہو نا کہ میں نے ہمیشہ آپ کو اپنا بڑا بھائی مانا ہے؟ جانتے ہو نا کہ میرا کوئی بھائی نہیں ہے اور میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں؟ جانتے ہو نا!'' اس نے میرا گریبان پکڑ لیا۔

''راضی صاحب! سنا تھا پاکستانی بہت بڑے دل کے مالک ہوتے ہیں، ایک دل میں پورا جہان آباد کر لیتے ہیں۔لیکن میں غلط تھا۔ پاکستان میں تمہارے جیسے چھوٹے دل کے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کو جتنی بھی محبت کرلو سانپ کی طرح کبھی اپنے نہیں ہوتے۔ بہت چھوٹا سا دل ہے آپ کا راضی! ایک لڑکے کی محبت کے لئے بھی جگہ نہیں ہے تمہارے پاس۔۔۔اب زندگی میں کبھی کسی پاکستانی سے دوستی نہیں کروں گا۔بس ایک بے وفا ہی کافی ہے زندگی سے سبق حاصل کرنے کے لئے۔'' اس نے ایک زوردار جھٹکا دے کر میرا گریبان چھوڑ دیا۔

''احمد! تم چھوٹے دل کی بات کرتے ہو؟ میرے پاس دل ہی نہیں ہے۔'' میں نے اس کے گالوں کو ہاتھ

لگانے کی کوشش کی تو اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور ایک تھپڑ میرے منہ پر مار دیا۔

''یہی تھپڑ تمہاری اوقات ہے راضی! چلے جاؤ اور ساری زندگی اس ایک تھپڑ کی گونج اپنے کانوں میں سنتے رہنا۔ یہ تھپڑ تمہیں ہمیشہ یاد دلاتا رہے گا کہ ایران کا ایک کردلڑکا کبھی تمہارا چھوٹا بھائی ہوا کرتا تھا۔

وہ واپس مڑا اور جا کر دوسرے لڑکوں کے درمیان میں جا کر بیٹھ گیا۔ میں خاموشی سے موٹر پر آ کر چہرا دھونے لگا۔ احمد کے چھوٹے سے تھپڑ نے میرے پورے چہرے کو سرخ کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک کار احاطے کے اندر آ گئی۔ ہاؤس انچارج نے مجھے اور پانچ مزید لڑکوں کو علیحدہ کیا اور کار میں بیٹھنے کا کہا۔ ہم یہاں سے استنبول جا رہے تھے۔ میں جانے سے پہلے احمد کے پاس گیا۔

''ٹھیک ہے احمد بھائی! میں جا رہا ہوں۔'' وہ خاموش بیٹھا رہا۔

''احمد یار! اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کر دینا یار!'' میں نے اس کے گالوں کو ہاتھ لگانا چاہا تو اس نے جلدی سے منہ پیچھے کر لیا۔

''نہیں راضی صاحب! تم نے اپنا ہر حق کھو دیا ہے۔ تم پاکستانی اچھے نہیں ہوتے ہو۔'' وہ ایک لڑکے کے کندے پر سر رکھے بولنے لگا۔

''پاکستانی بہت برے ہوتے ہیں۔ ان کے پاس دل ہی نہیں ہوتے۔'' وہ مسلسل رو رہا تھا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا تو وہ میرے گلے لگ کر رونے لگا۔ ہاؤس انچارج نے آگے بڑھ کر اسے مجھ سے علیحدہ کیا تو وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

''پاکستانی بہت برے ہوتے ہیں۔'' وہ مسلسل روتے ہوئے یہی الفاظ دہرا رہا تھا۔

ہاؤس انچارج کا دل بھی اسے روتے ہوئے دیکھ کر پگھل گیا۔ اس نے مجھے کار کی طرف جانے کا اشارہ کیا اور خود احمد کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا اور اسے چپ کروانے لگا۔ میں کار میں بیٹھا اور کار آہستہ آہستہ احاطے سے باہر نکلنے لگی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو احمد ہاؤس انچارج کے گلے لگا رو رہا تھا۔ میں نے اس دن برسا کے شہر میں احمد کو چھوڑ دیا تھا اور استنبول کی طرف جا رہا تھا۔ تین گھنٹے میں کار نے ایشیائی استنبول کو کراس کیا اور مجھے یورپی استنبول میں اتار کر آگے بڑھ گئی۔

میں ایشیا سے یورپ میں آ گیا تھا۔ یورپ کی سرزمین پر میرے قدم پڑ گئے تھے۔ایک چھوٹے سے پل نے مجھے ایشیا سے یورپ پہنچا دیا تھا۔ مجھے یہاں سے یونان تک جانا تھا۔2006ء میں ابھی ترکی ترقی کے زینے آہستہ آہستہ اوپر چڑھ رہا تھا۔اس دور میں ترکی کافی سختی کرتا تھا۔مشرف نے تازہ تازہ ترکی کا ایک دورہ کیا تھا اور ترکی سے واپس بندے پاکستان ڈی پورٹ کرنے کی منظوری دے دی تھی۔

اس دور میں ترکی سے جولڑکے پکڑے جاتے انہیں ایران کے بارڈر پر لا کر ایران کی طرف بھگا دیا جاتا تھا۔ترکی والے لڑکوں کو بارڈر پر لا کر چھوڑ دیتے تھے اور لڑکے ایران چلے جاتے تھے کیونکہ سامنے ترکی فورسز کھڑی ہوتی تھیں اور واپس آنے والے لڑکے کو گولی مار دیتی تھیں۔لڑکے ترکی فورسز کے ڈر سے مجبوری میں بارڈر کراس کر کے واپس ایران جاتے اور وہاں سے کردے اغوا کر لیتے اور پھر ان کے گھر والوں سے تاوان وصول کرتے۔مشرف ترکی کے دورے پر آیا تو یہاں کی گورنمنٹ نے پاکستانی لڑکوں کو سٹے دینے کی پیشکش کی۔ یہ سٹے دراصل ترکی میں چالیس دن رہنے کا اجازت نامہ ہوتا ہے۔

ترکی اس دور میں شام اور کچھ دوسرے عرب ممالک کو سٹے دیتا تھا۔جولڑکا بھی ترکی میں پکڑا جاتا اسے چالیس دن کا سٹے دے دیا جاتا تھا اور وہ چالیس دن کے اندر اندر ترکی کا بارڈر کراس کر کے یونان چلا جاتا تھا۔مشرف نے سٹے لینے سے انکار کر دیا تھا اور لڑکوں کو جہاز کے ذریعے ڈائریکٹ ڈی پورٹ کرنے کا کہہ دیا تھا۔ترکی میں اب جو بھی پاکستانی لڑکا پکڑا جاتا ہے اسے PIA کے ذریعے پاکستان ڈی پورٹ کر دیا جاتا تھا۔

2006ء سے لیکر 2009ء تک جتنے بھی لڑکے ترکی سے ڈی پورٹ ہوئے ہیں یہ اس مشرف کی مہربانی ہے۔ لڑکے دو دو مہینے کا اعصاب شکن سفر کر کے ترکی پہنچتے تھے اور اگر یہاں پر کہیں پکڑے گئے تو صرف پانچ گھنٹے میں ہی واپس۔ پاکستان سے دو مہینے کا جان لیوا سفر صرف پانچ گھنٹوں میں ہی ختم ہو جاتا ہے۔اس قانون کے تحت ایران بھی لڑکے واپس لے لیتا تھا کیونکہ پاکستان لڑکے واپس لینا شروع ہو گیا تھا۔اسی قانون کے تحت دہشت گرد اور غیر ملکی ایجنسیوں کے ایجنٹ بھی پاکستان چلے جاتے تھے۔

مشرف نے پورے ملک میں کھلی چھوٹ دی ہوئی تھی۔کوئی انکوائری نہیں،کوئی شناختی کارڈ یا پاسپورٹ کی ضرورت نہیں تھی بس ایرانی گورنمنٹ لڑکوں کو بارڈر پر لاتی اور پاکستانی فورسز لڑکوں کو وصول کرتیں اور انہیں تھانے

لے جایا جاتا تھا۔ پانچ پانچ ہزار فی کس تھانے والے جرمانہ وصول کرتے اور خاموشی سے لڑکا پاکستان کے اندر داخل ہو جاتا۔ پھر چاہے وہ عام لڑکا ہو، غیر ملکی ایجنٹ ہو یا دہشت گرد ہو کیا فرق پڑتا ہے۔ بھگتنا تو بعد میں زرداری اور نواز شریف کو پڑا تھا۔

شاید آپ میں سے کچھ لوگ مشرف کے حق میں ہوں اور مجھے گالیاں دیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ مشرف صرف گھر کا کاغذی شیر تھا۔ بین الاقوامی دباؤ کے آگے ڈھیر ہو جاتا تھا۔ آج ٹی وی پر آ کر بڑی بڑی بڑھکیں مارنے والے اسی بزدل نے امریکہ اور یورپ کے ہر فیصلے پر اپنی آنکھیں بچھائیں ہیں۔ پاکستانی لڑکے ڈی پورٹ کرنا بھی یورپی یونین کا فیصلہ تھا اور اس مشرف نے ان لڑکوں کو قبول کیا تھا۔ بعد میں زرداری کی حکومت آئی تو اس نے یہ سب کچھ ختم کیا۔ 2009-10ء میں ''سگویا'' آپریشن ختم کرنے والا یہی زرداری ہے جسے آج پورا پاکستان گالیاں نکال رہا ہے۔

اس آپریشن کے تحت یونان میں پہلے سٹے دینا بند کیا گیا اور جو لڑکے غیر قانونی اور بغیر سٹے کے یونان میں رہتے تھے ان کو پکڑتے اور پاکستان ایمبیسی سے ایک سادہ لیٹر بنا کر پاکستان ڈی پورٹ کر دیا جاتا۔ سینکڑوں لڑکوں کو ایسے ڈی پورٹ کیا گیا۔ زرداری کو پتہ چلا تو اس نے لڑکے لینے سے انکار کر دیا۔ اس نے یونان، ترکی اور ایران غرضیکہ کہیں سے بھی لڑکے لینے سے انکار کر دیا۔ یورپی یونین نے بہت زور لگایا لیکن یہی زرداری اڑ گیا۔ اس نے یونان سے پاکستانی ایمبیسڈر کو اسلام آباد بلا کر منع کیا۔

یونان کی گورنمنٹ نے تین تین سال تک لڑکوں کو جیل میں رکھا۔ اس دور میں پورا یونان جیسے جیل بن گیا تھا۔ فوج کی پرانی بیرکوں کو بھی خالی کروا کر ان کو جیل بنایا گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں پاکستانی لڑکوں کو پکڑا گیا لیکن یہی زرداری ڈٹ گیا۔ یورپی یونین کے سامنے یہ شخص کھڑا رہا اور آخر کار یونان کو اپنا سگویا آپریشن ختم کرنا پڑا اور انہوں نے لڑکوں کو چھوڑ دیا۔

اب نواز شریف حکومت میں ایک بار پھر ڈی پورٹ کرنا شروع کیا لیکن اس بار چوہدری نثار اڑ گیا۔ یورپی یونین کا دباؤ ہے نواز حکومت پر۔۔۔ جرمن گورنمنٹ نے پتہ نہیں کون کون سی مراعات دینے کا وعدہ کیا ہے لیکن نواز

شریف حکومت ایک بھی لڑکے کو واپس نہیں لیتی۔

میں ایک ادنیٰ سا رائٹر ہوں اور میں کسی بھی پارٹی کے حق میں نہیں ہوں۔ن لیگ اور پیپلز پارٹی دونوں میرے ملک کی سیاسی پارٹیاں ہیں اور اگر انہوں نے ہم تارکین وطن کے لئے کچھ اچھا کیا ہے تو مجھے اس کا اقرار کرنا چاہیے۔ چوہدری نثار یا زرداری اگر یونان یا جرمنی کے آگے آ کر کھڑے ہوئے ہیں اور انہوں نے اگر اپنے ملک کے وقار کا سودا نہیں کیا ہے تو مجھے ان کو داد بھی دینی چاہیے۔ان دونوں آدمیوں کے ہم تارکین وطن پر احسان ہیں اور مجھے ان دونوں سے محبت ہے۔

میں استنبول پہنچ گیا تھا۔میری جیب میں کافی رقم تھی۔یہ پیسے میں نے ایران میں کام کر کے کمائے تھے۔احمد کے چچا نے مجھ سے کوئی پیسہ بھی وصول نہیں کیا تھا اور اڑھائی مہینے کی تنخواہ میری جیب میں ترکی روپوں کی صورت میں موجود تھی۔یہ پاکستانی پچیس ہزار سے زیادہ روپے بنتے تھے۔

2006ء میں پچیس ہزار۔۔۔اس وقت ڈالر بھی 65 روپے کا تھا۔میں نے راستے میں لڑکوں سے معلومات لے لی تھی اور کچھ میری اپنی بھی معلومات تھیں۔یونان اور ترکی کے بارڈر پر بہت سختی تھی لیکن یہ یورپی بارڈر تھا اور یہاں جان کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ادھر نہ تو بلوچی تھے اور نہ ہی کرد جنگجو، یہاں صرف یورپی لوگ ہی بستے تھے۔اس لئے صرف پولیس یا آرمی کا ہی ڈر تھا اور کسی چیز کا ڈر نہیں تھا۔

میں نے اکیلے ہی بارڈر کراس کرنے کا فیصلہ کر لیا۔استنبول میں عربی نسل کالے بالوں والے اور یورپی نسل سنہری بالوں والے دونوں ہی نسلوں کے لوگ رہتے تھے۔ہاں ترکیوں کا رنگ ہم سے زیادہ گورا ہوتا ہے جو کالے بالوں والے ہوتے ہیں۔دوسرے سنہری بالوں والے تو یورپی نسل کے سفید گورے ہوتے ہیں۔میرے چہرے پر ابھی ہلکی ہلکی داڑھی آ رہی تھی اور رنگ بھی گورا تھا۔میں ان کالے بالوں والے ترکی افراد سے تھوڑا ملتا جلتا تھا۔اس لئے مجھے استنبول میں چلنے پھرنے میں کوئی مشکل نہیں تھی۔ڈیڑھ کروڑ کے اس آبادی والے شہر میں ایک پاکستانی لڑکے کو کوئی بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔مجھے یہاں کی زبان نہیں آتی تھی۔صرف بولنے سے ہی پتہ چل سکتا تھا کہ میں یہاں کا رہنے والا نہیں ہوں۔مجھے انگلش آتی تھی اور میں کافی روانی سے انگلش بول سکتا تھا۔اتنی روانی سے انگلش

بولنے کی صورت میں میں کوئی سیاح ہی لگتا تھا، ڈنکی لگانے والا غریب پاکستانی نہیں۔

میں چلتے چلتے استنبول کے بس اڈے پر پہنچ گیا۔ میں یہاں سے ''سیلیوری'' جانا چاہتا تھا۔ استنبول سے یونان کا بارڈر 200 کلومیٹر دوور تھا اور میں یہاں سے سیدھا بارڈر جانے والی بس نہیں لے سکتا تھا۔ سرحدی شہر ''ایڈرن'' یا ''کیسن'' جانے والی بسوں کی چیکنگ ہوسکتی تھی۔ یونان جانے والے لڑکے کیسن کی طرف سے بارڈر کراس کرتے تھے۔ یہاں سے الیگزنڈرا پلی نزدیک تھا۔ جہاں سے لڑکوں کو ٹیکسیوں کے ذریعے ''سلونیکی'' لایا جاتا اور سلونیکی سے آگے پھر ''ایتھنز'' شہر کی طرف چلے جاتے تھے۔

میں نیچے سے بارڈر کراس کرنے کی بجائے اوپر ایڈرن کی طرف سے جانا چاہتا تھا۔ میں ایڈرن سے بارڈر کراس کرتا اور وہاں سے الیگزینڈرا پلی جانے کی بجائے کوموتینی چلا جاتا اور پھر ایکسانتھی سے سلونیکی کے لئے بس پکڑنے کی کوشش کرتا۔ کوموتینی اور ایکسانتھی دونوں ترک مسلم اکثریتی یونانی شہر تھے۔ یہ دونوں شہر مین روڈ سے ہٹ کر تھے اور اسی لئے یہاں پر کوئی سختی نہیں تھی۔ میں آسانی سے ایکسانتھی سے سلونیکی کی بس پکڑ سکتا تھا۔

استنبول کے بس اڈے سے میں نے سلیوری کی ٹکٹ لے لی۔ سلیوری استنبول سے 60 کلومیٹر دور استنبول ہی کا شہر تھا۔ پندرہ لاکھ کی آبادی والا یہ شہر مارمارہ سمندر کے کنارے پر ہے۔ سلیوری سے میں نے کولرو شہر کی ٹکٹ لی۔ یہ شہر سلیوری سے ایڈرن جانے والے مین روڈ سے ہٹ کر ایک لنک روڈ پر واقع تھا۔ یہاں سے لوکل بس لولی برگز جاتی تھیں۔ لولی برگز سے یونان صرف 70 کلومیٹر دور تھا۔ ایک لاکھ سے زیادہ کی آبادی والے اس شہر میں بڑی بڑی فیکٹریاں ہیں۔ اس کے علاوہ کھیتی باڑی بھی بہت ہے۔ شہر سے باہر آپ کو ہر طرف سورج مکھی اور مکئی کے کھیت نظر آئیں گے۔ یورلو سے میں لولی برگز پہنچ گیا۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ میں پیدل ستر کلومیٹر کا سفر نہیں طے کر سکتا تھا اس لئے میں بس اڈے سے باہر نکل کر بڑی دیر تک سوچوں میں غرق رہا۔

آخر میں نے ایک اور رسک لینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے رات شہر سے باہر کسی کھیت میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ مکئی کے بڑے بڑے کھیت تھے اس لئے مجھے چھپنے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ چھوٹا سا شہر تھا میں آدھے گھنٹے میں ہی شہر سے باہر نکل گیا اور کافی دور جا کر ایک کھیت میں داخل ہو گیا۔ مکئی ابھی کچی تھی، مکئی میں دانہ بن گیا تھا لیکن ابھی دودھ تھا۔

میں نے سات آٹھ مکئی کے کچے بھٹے کھائے اور خدا کا شکر ادا کیا۔ کچی ہونے کی وجہ سے مکئی کھانے کے قابل تھی۔ اگر تھوڑی اور سخت ہو جاتی تو پھر ابال کر ہی کھائی جا سکتی تھی۔ کھیت کے اندر بہت حبس تھی اور میری رات بہت آرام سے گزر گئی۔

صبح پانچ بجے کے قریب میں کھیت سے باہر نکل آیا۔ میں نے اپنے کپڑوں کو اچھی طرح صاف کیا اور سوسا جانے والے روڈ پر کھڑا ہو گیا۔ مجھے اس راستے پر آنے والی بس کو روک کر اس میں بیٹھنا تھا۔ چھ بجے کے قریب ایک بس گزری تو میں نے اس کو ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ بس رکی تو میں اس میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور کو سوسا جانے کے لئے پیسے دیئے اور آرام سے بس کی سیٹ سے پشت لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ سوسا لولی برگز سے پچاس کلومیٹر دور تھا۔ بس نے ایک گھنٹے میں مجھے سوسا اتار دیا اور ایڈرن کی طرف روانہ ہو گئی۔ بس رستے میں چھوٹے چھوٹے گاؤں میں رکتی آئی تھی اس لئے اسے پچاس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے میں ایک گھنٹہ لگا تھا۔

یہ چھوٹا سا بہت پیارا گاؤں تھا اور بارڈر سے صرف بیس کلومیٹر دور تھا۔ گاؤں سے باہر تاحدِ نگاہ مکئی کے بڑے بڑے کھیت نظر آ رہے تھے۔ میں سات بجے ہی ادھر پہنچ گیا تھا۔ دن کو سفر کرنا بہت خطرناک تھا کیونکہ یہ بارڈر ایریا تھا اور سادہ کپڑوں میں بھی پولیس والے ادھر گھومتے تھے، اس لئے ابھی مجھے احتیاط کرنے کی ضرورت تھی۔ میں بالکل کنارے پر پہنچ گیا تھا اور پاکستان ڈی پورٹ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس لئے تیزی سے چلتا ہوا گاؤں سے باہر آیا اور گاؤں سے تین چار کلومیٹر دور ایک کھیت میں گھس گیا۔

مجھے سارا دن یہیں رہنا تھا۔ رات کو میں یہاں سے نکلتا اور بارڈر کی طرف چلا جاتا۔ میں رات کو دو سے تین بجے کے درمیان بارڈر کراس کرنا چاہتا تھا۔ بارڈر ایک بہت بڑی نہر تھی۔ جو تقریباً پچاس فٹ کے قریب چوڑی تھی اور گہری بھی تھی۔ یہ نہر بلغاریہ سے نکلتی تھی اور ترکی اور یونان کے بارڈر پر چلتی ہوئی سمندر میں جا گرتی تھی۔ میں سارا دن ادھر مکئی کے کھیت میں ہی رہا۔

شام کو چھ بجے کے قریب میں باہر نکل آیا۔ ابھی اندھیرا ہونا باقی تھا لیکن مجھے چونکہ دو بجے تک بارڈر پر پہنچنا تھا اس لئے میں جلدی سے باہر نکل آیا اور تیزی سے کھیتوں کے درمیان سے ہوتا ہوا بارڈر کی طرف جانے لگا۔ ایک

گھنٹے میں ہی رات کا اندھیرا چھا گیا تو میرے لئے آسانی ہوگئی۔اب میں آرام سے جا سکتا تھا اس لئے میں تیزی سے چلنے لگا۔آسمان پر چاند نکل آیا تھا۔جب ہم نے ایران سے سفر شروع کیا تھا اس وقت چاند کی آخری تاریخیں چل رہی تھیں لیکن اب پورا چاند آسمان پر چمک رہا تھا اور اس کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔یہ ٹھیک روشنی تھی مجھے سامنے سب واضح نظر آتا تھا لیکن دور سے کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

رات کو دو بجے کے قریب میں بارڈر سے صرف ایک کلومیٹر دور رہ گیا تھا۔یہ سارا جنگل تھا اور دلدلی علاقہ تھا اور اس علاقہ میں گاڑی نہیں آسکتی تھی اس لئے یہاں سختی بھی نہیں تھی۔مجھے نہر میں پانی چلنے کی آواز یہاں تک آرہی تھی اور میرا خون تیزی سے گردش کر رہا تھا۔میں بغیر ایجنٹ کے یہاں تک پہنچ گیا تھا اور ایک گھنٹے میں نہر کراس کر کے یونان پہنچ جاتا۔میرے لئے امریکہ کا سفر آسان ہونا شروع ہوگیا۔یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہو رہا تھا کہ مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا۔شاید ایمان کی دعا کام کر رہی تھی۔میں اس کے خدا کی تلاش میں نکلا تھا اور وہی خدا شاید میری مدد کر رہا تھا۔

''ایمان!'' میں نے آہستہ سے پکارا تو وہ اچانک میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔میں نے ایمان کے چہرے کی طرف دیکھا۔زندگی سے بھرپور آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

''راضی!یونان جا رہے ہو؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ہاں ایمان!دیکھ لو تمہارا راضی آخر یونان آ ہی گیا ہے۔تمہاری محبت میں بہت طاقت ہے۔یہی طاقت ایک دن مجھے امریکہ پہنچائے گی اور پھر میری محبت تجھے ایک بار پھر میری زندگی میں واپس لے آئے گی۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''راضی!میں شادی شدہ ہوں،مجھ سے محبت کرنا والا میرا شوہر ہے۔میں کیسے اس کو چھوڑ سکتی ہوں؟'' اس نے میرے گالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

''نہیں ایمان!تم صرف میری ہو۔دنیا کی کوئی طاقت،کوئی قانون تمہیں مجھ سے جدا نہیں کر سکتا۔جس خدا کے بنائے ہوئے قانون کو تم شادی کہتی ہو وہی خدا ایک دن میری محبت سے مجبور ہو کر تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے

دے گا۔ ایمان! محبت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور میرا ابھی کوئی مذہب نہیں ہے۔ تم ہی میرا مذہب ہو اور تم ہی میری محبت ہو۔'' میں جوش میں بولتا چلا گیا۔ اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر مجھے چپ کروا دیا۔

''راضی! خواب بہت دیکھنے لگے ہو۔ ان کے ٹوٹنے سے بہت درد ہوتا ہے۔'' اچانک دو تین آدمی مجھ پر جھپٹ پڑے اور مجھے زمین پر گرا دیا۔

ایمان میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی اور وہ آدمی مجھے زمین پر گرائے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال رہے تھے۔ میں نہر سے ایک کلومیٹر پیچھے ہی پکڑا جا چکا تھا۔ انہوں نے مجھے ہتھکڑی لگائی اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں زمین پر بندھا پڑا سوچ رہا تھا۔ خدا نے اپنے وجود کا احساس دلا دیا تھا۔

میری منزل ایک بار پھر مجھ سے دور ہو گئی تھی۔ چھ سات مہینے کا یہ سفر جو میں نے کراچی سے شروع کیا تھا اب زیرو ہو گیا۔ یہ لوگ ایک دو دن میں مجھے واپس ڈی پورٹ کر دیتے اور میں پھر سے پیسے اکٹھے کرنا شروع کر دیتا ایران جانے کے لئے، ترکی جانے کے لئے اور پھر یونان جانے کے لئے۔

وہ تینوں پولیس والے تھے جو مجھے ہتھکڑی لگا کر اب وائرلیس سے پیچھے اطلاع کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک لڑکے کو بارڈر کراس کرتے ہوئے پکڑ لیا تھا اس لئے اب مسکرا رہے تھے۔ اپنے بوٹوں کی ٹوہ سے بار بار مجھے ہلا رہے تھے۔ وہ بہت خوش تھے جیسے انہوں نے کوئی بہت بڑا دہشت گرد پکڑ لیا ہو۔

بندوں کے دلوں کا حال صرف خدا ہی جانتا ہے ورنہ اگر ان پولیس والوں کو پتہ چل جاتا کہ جس لڑکے کو انہوں نے پکڑا ہے وہ ایک غریب پاکستانی لڑکا ہے جو ایک اچھے مستقبل کے لئے غربت کی دلدل سے نکل کر اپنی زندگی کو داؤ پر لگانے کے بعد یہاں تک پہنچا ہے اور اس وقت زمین پر پڑا کس درد و اذیت سے گزر رہا ہے۔ اگر اس کا ایک فیصد بھی ان کو پتہ چل جاتا تو وہ کبھی بھی نہ مسکراتے لیکن خدا نے انسان کی فطرت میں ہی ظالمانہ پن رکھا ہے۔ یہ جب ظلم کرنے پر آتا ہے تو بڑے بڑے جانوروں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔

اس وقت موبائل کا اتنا رواج عام نہیں ہوا تھا ورنہ وہ میرے اوپر کھڑے ہو کر تصویریں بھی بنواتے۔ ایک گھنٹے میں ہی پولیس کی ایک پارٹی آ گئی۔ انہوں نے مجھے ساتھ لیا اور پندرہ منٹ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک

کچے روڈ پر آ گئے۔ وہاں پولیس کی گاڑی کھڑی تھی اس میں مجھے بٹھا کر ایلسلی گاؤں کی طرف چل دیئے۔ یہاں ایک عارضی پولیس کیمپ بنا ہوا تھا۔ اس طرف سے جو بھی لڑکے بارڈر کراس کرتے ہوئے پکڑے جاتے انہیں اسی کیمپ میں لایا جاتا اور دوسرے دن ایڈرن کی طرف بھیج دیا جاتا تھا جہاں سے استنبول اور پھر پاکستان بھیج دیا جاتا۔ جہاں پر بڑی بے تابی سے ہمارا صدر جنرل پرویز مشرف ہمارا انتظار کر رہا ہوتا۔ شاید اسے ہم لوگوں کی زیادہ ہی ضرورت تھی اسی لئے تو جہاز کی ٹکٹ بھی گورنمنٹ آف پاکستان ادا کرتی تھی۔

مجھے رات کو ہی ایلسلی پہنچایا گیا۔ یہ ایک وسیع جگہ تھی جس کی دیواروں پر خاردار تاریں لگائی ہوتی تھیں۔ اندر کی طرف چار کمرے تھے۔ ان میں سے دو کمروں کو آفس کے طور پر جبکہ باقی دو کمروں کو سیل کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

یہاں پر مجھے احمد بھی مل گیا۔ وہ بھی آج رات ایلسلی سے ڈنکی لگاتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ یہ پچاس لڑکوں کا قافلہ تھا جو رات کو ادھر سے نہر کراس کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ پولیس والوں نے احاطے میں لے جا کر میری ہتھکڑی کھول دی۔

''نام کیا ہے اور کس ملک سے آئے ہو؟'' ایک چالیس پینتالیس سالہ پولیس والے نے مجھ سے پوچھا۔ وہ ٹیبل کی دوسری طرف بیٹھا ہوا تھا اور میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''نام کیا ہے تمہارا اور کس ملک سے آئے ہو؟'' اس نے ایک بار پھر مجھ سے سوال کیا۔

''جارج ڈبلیو بش ـــ۔ امریکہ سے آیا ہوں۔ کیا ڈی پورٹ کر سکتے ہو مجھے امریکہ؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ہنسنے لگا۔

''واؤ! مسٹر بش صاحب! ہمارے ملک میں تشریف لائے ہیں۔ سر! غلطی ہو گئی ـــ۔ اوئے! کرسی دو صدر صاحب کو! کتنی دیر سے کھڑے ہیں۔'' چالیس سالہ ترک پولیس والے نے سامنے کھڑے ہوئے کانسٹیبل کو کہا تو اس نے ایک کرسی کو میری طرف کھسکایا تو میں اس پر بیٹھ گیا۔

''سر جی! یہ تو ہمارے لئے نصیب کی بات ہے جو آپ جیسے بڑے لوگ ہمارے ملک میں تشریف لائے ہیں۔'' وہ ابھی تک میری امریکہ والی بات کو انجوائے کر رہا تھا۔

''میں ایران سے آیا ہوں، کیا یہ ممکن ہے کہ آپ لوگ مجھے سلماس کی طرف سے ایران ڈی پورٹ کر دیں؟'' میں نے اسکو بتایا تو وہ مسکرانے لگا۔

میں اسے سلماس کے اس گاؤں کا پتہ لکھوانے لگا جہاں میں نے کھیتی باڑی کا کام کیا تھا۔ وہ گاؤں کا نام سن کر اچانک چونک گیا۔

''حسین! اس گاؤں کا ایک اور بھی لڑکا آج رات پکڑا گیا ہے نا؟ ایرانی۔۔۔کیا نام ہے اس کا؟'' اس پولیس والے نے کانسٹیبل حسین سے پوچھا تو وہ سوچنے لگا۔

''جی! جی سر! احمد نام ہے شاید اس کا۔'' احمد کا نام سنتے ہی میں پریشان ہو گیا۔ وہ بھی ادھر پکڑا گیا تھا اور اس معصوم لڑکے نے اپنا اصل نام پتہ بتا دیا تھا۔ دکھ کی ایک تیز لہر میرے وجود میں سرائیت کر گئی۔ ہم دونوں ہی پکڑے گئے تھے۔

''جاؤ! اس کو لے کر آؤ۔ کیا یہ اسے پہچانتا ہے؟'' کانسٹیبل حسین باہر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد وہ احمد کو لے کر آ گیا۔

میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ احمد مجھے دیکھتے ہی مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ رو رہا تھا، لپٹ رہا تھا اور مجھے مار رہا تھا۔'' پولیس والے احمد کا انداز دیکھ کر حیران رہ گئے۔

''راضی بھائی! وعدہ کرو آج کے بعد مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤ گے؟ تمہارے بغیر میں اس ملک میں نہیں رہ سکتا۔ ہماری قسمت میں یورپ لکھا ہی نہیں ہے بھائی! ہم ایسے ہی ساری زندگی بھاگتے دوڑتے رہیں گے۔'' وہ مجھ سے لپٹا رو رہا تھا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے پیار سے خود سے علیحدہ کیا۔

''احمد بھائی! روتے نہیں ہیں بلکہ زندگی کا مقابلہ مَردوں کی طرح کرتے ہیں۔ زندگی میں بہت سے امتحان

آتے رہتے ہیں اور ہمیں ان امتحانوں کا مقابلہ ڈٹ کر کرنا چاہیے۔ ہارنا نہیں بس۔۔۔ ہار کا مطلب صرف موت ہوتا ہے۔ جب زندگی ختم ہو جاتی ہے تو ہر قسم کی جدوجہد بھی ختم ہو جاتی ہے۔ ہماری عمر ابھی صرف بیس بیس سال ہوئی ہے اور اتنی جلدی ہار مان کر گھر میں نہیں بیٹھ سکتے۔ غربت اور مفلسی کی جس زندگی کو ہم اپنے پیچھے چھوڑ کر آئے ہیں ایک بار پھر اسی دلدل میں واپس جا رہے ہیں لیکن حوصلے ابھی بھی بلند ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی رکاوٹیں آتی رہتی ہیں اور ان رکاوٹوں سے بچ کر نکلنا ہی زندگی ہے۔'' میں نے پولیس والوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو پولیس والے مسکرانے لگے۔

''جی! تو جارج بش صاحب! اب نیا نام بھی بتا دو تا کہ ہم آپ کے آرام کا بندوبست کر سکیں۔'' اس نے طنز کرتے ہوئے کہا تو میں نے اپنا نام راضی حسین بتایا اور انہوں نے یہی نام لکھ لیا۔ ویسے بھی یہ کاغذی کاروائی تھی اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ ہر حالت میں ڈی پورٹ کر دیتے تھے۔

انہوں نے مجھے بھی احمد کے ساتھ ہی کمرے میں بند کر دیا۔ یہاں ایک ہی کمرے میں پچاس کے قریب لڑکے تھے۔ میں احمد کو لے کر کمرے کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ پچاس کے قریب لڑکے ہوسا سے پیدل بارڈر کی طرف جا رہے تھے جب پولیس نے پکڑ لیا۔ ٹوٹل ساٹھ کے قریب لڑکے تھے جن میں سے پچاس لڑکے پکڑے گئے تھے اور باقی بھاگ جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

جب پولیس کا چھاپہ پڑتا ہے تو یہ لڑکوں کو ڈرانے کے لئے ایک دو فائر کر دیتے ہیں۔ لڑکے فائر کی آواز سے ڈر کر بیٹھ جاتے ہیں، بھاگتے نہیں۔ پولیس والے دس پندرہ کے قریب ہوتے ہیں۔ وہ لڑکوں کو اکٹھا بٹھا کر اوپر کھڑے ہو جاتے ہیں اور پولیس کی بڑی گاڑیاں آنے تک لڑکوں کے سر پر ہی کھڑے رہتے ہیں۔ پولیس کے چھاپے کی صورت میں کچھ لڑکے ہمت کر کے بھاگ نکلتے ہیں۔

پولیس والے زیادہ تر ہوائی فائرنگ ہی کرتے تھے۔ یونان کے بارڈر پر بہت کم ہی سیدھا فائر مارنے کا واقعہ ہوتا تھا اور لڑکے اسی موقع کا فائدہ اٹھا کر بھاگ نکلتے تھے۔ پولیس والوں کے جتنے لڑکے ہاتھ آتے تھے وہ اتنے ہی لڑکوں کو پکڑ لیتی تھی۔ باقی لڑکے جنگل میں بھاگتے رہتے تھے اور یا تو ایجنٹوں کے ہاتھ لگ جاتے یا پھر پولیس کی گشتی

پارٹیوں کے۔ اگر ایجنٹوں کے ہاتھ لگ جاتے تو بچ جاتے تھے اور ایجنٹ ان کو واپس سیف ہاؤس لے جاتے تھے اور کچھ دن بعد پھر بارڈر کراس کروانے کی کوشش کرتے تھے۔ اگر پولیس کی گشتی پارٹیوں کے ہاتھ چڑھ جاتے تو پھر پولیس والے انہیں لے کر ادھر ہی آ جاتے تھے۔

میں احمد کو لے کر ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے یہاں بیٹھے ابھی دس منٹ ہی ہوئے تھے جب دروازہ کھلا اور ایک پولیس والا بریڈ، ٹماٹر چیز اور ایک ساشے پیکٹ جام کا مجھے پکڑا گیا۔ میں نے بریڈ کے دو ٹکڑے کئے اور ایک ٹکڑا احمد کی طرف بڑھا دیا۔

''نہیں بھائی! آپ کھاؤ، ہم سب نے کھانا کھا لیا ہے۔'' احمد نے مجھے منع کرتے ہوئے کہا۔

'''نہیں یار! کھاؤ، میں نے رستے سے کھانا کھا لیا تھا۔ ابھی دونوں بھائی مل کر آدھا آدھا کھاتے ہیں۔ شاید یہ ہمارا آخری کھانا ہو کیونکہ صبح ان لوگوں نے ہمیں ایڈرن بھیج دینا ہے اور پھر تم ایران چلے جاؤ گے اور مجھے پاکستان ڈی پورٹ کر دیا جائے گا۔''

''کیوں بھائی! آپ نے بھی تو میرے گاؤں کا ہی پتہ لکھوایا ہے؟ آپ میرے بھائی ہو، آپ کو بھی ایران ہی ڈی پورٹ کیا جائے گا۔'' احمد بریڈ کو ایک سائیڈ پر رکھتے ہوئے بولا۔ وہ ایک سیکنڈ میں ہی پریشان ہو گیا تھا۔

''نہیں یار! منہ سے بھائی کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے فارسی نہیں آتی ہے۔ استنبول میں مجھے فارسی ٹرانسلیٹر کے سامنے کھڑا کیا جائے گا اور وہ فوراً ہی پہچان لے گا کہ میں فارسی نہیں ہوں بلکہ کسی اور ملک کا باشندہ ہوں۔ وہ مجھے پاکستان ڈی پورٹ کر دیں گے۔ میری قسمت میں واپس پاکستان جانا ہی لکھا ہے۔ میں پھر واپس آؤں گا اور ایک بار پھر یونان جانے کی کوشش کروں گا۔ جب تک زندگی ہے کوشش تو کرنی ہے۔'' میں نے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ میرا دل اندر سے کٹ رہا تھا کیونکہ چھ سات مہینے کی محنت ضائع ہو گئی تھی۔ دوبارہ پاکستان سے چلنا بہت مشکل تھا اور نہ ہی میرے پاس اتنے پیسے تھے۔

میں سات مہینے میں یہاں تک پہنچا تھا۔ دوبارہ یہاں تک آنے میں مزید ایک ڈیڑھ سال لگ جاتا۔ میں گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ ایک بار بہاولپور چھوڑ دیا تو دوبارہ بہاولپور نہیں جا سکتا تھا اور نہ ہی کراچی جانا چاہتا تھا۔ نوید کی

فیملی اور نرما کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ان کا جوان بیٹا ان راہوں پر چلتے ہوئے مارا گیا تھا اور اگر میں ان کے پاس چلا جاتا تو وہ مجھے کبھی بھی دوبارہ نہ جانے دیتے۔لیکن میں نے تو واپس آنا ہی تھا۔میری زندگی اپنی راہوں کے تانے بانے بنتی ہوئی ختم ہو جاتی تھی۔

''میں امریکہ کا رہنے والا ہوں۔'' مجھے پولیس والے کے سامنے کہا ہوا فقرہ یاد آ گیا۔

امریکہ۔۔۔آخر امریکہ میں بھی تو لوگ بستے ہیں۔وہاں بھی تو روزانہ ہزاروں بچے پیدا ہوتے ہوں گے۔انہیں بغیر کوئی محنت کئے اس ملک کی شہریت مل جاتی تھی جس کے لئے لوگوں کی ہڈیاں تک گھل جاتی ہیں لیکن پھر بھی بے مراد رہتے ہیں۔یورپ میں رہنے والے لوگوں کو پتہ ہی نہیں کہ وہ کتنے خوش قسمت ہیں۔یہ ان ملکوں کی شہریت رکھتے ہیں جن تک پہنچنے کے لئے ہزاروں لوگوں نے اپنی جانیں دے دی تھیں۔

ایران،ترکی اور یونان کے بارڈر پر ہزاروں لڑکوں کی ہڈیاں ملیں گی جو اس راستے کے مسافر بنتے بنتے موت کے مسافر بن گئے۔جن کی لاشیں پہاڑوں پر پڑی گلتی سڑتی رہیں اور جنہیں جنگلی جانوروں نے کھا لیا۔ترکی سے یونان جانے والی پتہ نہیں کتنی کشتیاں سمندر کی نظر ہو گئیں اور اس میں بیٹھے ہوئے بیس بیس سال کے خوبصورت نوجوان سمندر کی خوراک بن گئے لیکن انہیں یونان کی سرزمین نصیب نہ ہوئی۔

''واہ رے خدا!کبھی کبھی تیری خدائی کمال ہی کر دیتی ہے۔کسی کی قسمت میں بغیر مانگے ہی امریکہ اور یورپ جیسے ملکوں کی فضاؤں میں جینا اور مرنا لکھ دیتا ہے اور کچھ لوگ وہاں جانے کی آس میں ہی ساری زندگی راستوں پر گزار دیتے ہیں۔محبت کرنے کی ایسی بھی سزا ہوتی ہے۔

یہ سوچتے سوچتے میرے دل نے اچانک جیسے دھڑکنا بند کر دیا ہو اور میں ایک طرف کو لڑھکتا چلا گیا۔احمد نے مجھے یوں گرتا ہوا دیکھ کر چیخنا شروع کر دیا۔وہ زور زور سے مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔میرا دل صرف ایک لمحے کے لئے ہی رکا تھا اور احمد کے جھنجھوڑنے سے پھر حرکت میں آ گیا۔لیکن میرا دل اٹھنے کو نہیں کر رہا تھا۔مجھے احمد پر غصہ آ رہا تھا۔اچھا خاصہ اس دنیا کی ساری تکلیفوں کو خیر باد کہہ کر جا رہا تھا لیکن احمد نے پھر واپس بلا لیا۔اس کے تین چار مسلسل جھٹکوں نے مجھے دوبارہ سانس لینے پر مجبور کر دیا اور میں واپس آ گیا۔مجھے کھانسی لگ گئی اور میں کھانستا چلا گیا۔احمد نے مجھے

واپس آتے دیکھ کر چیخنا بند کر دیا۔

''بھائی! آپ پریشان مت ہوں، خدا کچھ بہتر ہی کرے گا۔اتنی جلدی تو حوصلہ مت ہارو! ہم پھر کوشش کریں گے۔آخر کب تک یہ ایسے ہی ہمیں روکتے رہیں گے؟ ایک دن ہم دونوں جرمنی کی گلیوں میں آزادانہ گھوم رہے ہوں گے۔'' اس نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔میں خالی خالی نظروں سے احمد کی طرف دیکھنے لگا۔

''احمد! پاکستان میں ایک شخص ہے جس سے میں بہت محبت کرتا ہوں۔ایک لڑکی تھی جو تیس ہزار میں بک کر ہمارے گاؤں میں آئی تھی۔دس سال کی عمر میں اس کی پچاس سالہ بوڑھے سے شادی ہوئی تھی۔دس سال کی کوئی عمر ہوتی ہے شادی کی؟ لیکن پھر بھی اسے ایک بوڑھے کی جھولی میں ڈال دیا گیا۔اس کی محبت کی عمر بھی نہیں تھی لیکن پھر بھی اسے محبت کرنا پڑی۔احمد بھائی! پاکستان میں ہم چار بھائی اور ایک بہن ہے۔ہم بھی کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں۔میری ماں آج بھی گھر کے دروازے پر کھڑی میرا انتظار کر رہی ہے لیکن میں محبت کے چکروں میں پڑ گیا۔ ایمان نام تھا اس کا،جس سے میں محبت کرتا ہوں۔وہی ایمان جو تیس ہزار میں بک کر ہمارے گاؤں آئی تھی۔دس سال کی عمر میں پچاس سال کے بوڑھے کے ہاتھوں ساری رات اپنی عزت کی دھجیاں اڑتے ہوئے دیکھنا۔'' میرے آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

''بھائی! اس چھوٹی سی لڑکی نے اپنی زندگی میں وہ وہ ظلم برداشت کیا ہے جس کا آپ اور میں سوچ بھی نہیں سکتے۔وہ قیامت کی راتیں تھیں جو اس معصوم سی لڑکی نے برداشت کیں۔ان راتوں کے مقابلے میں یہ سرد راتیں کچھ بھی نہیں ہیں۔میں نے صرف ایک رات وہ قیامت دیکھی تھی اور اس کی جلن آج بھی میرے سینے میں اٹھتی ہے۔ یہاں تک کہ مجھے رات کو سردی نہیں لگتی۔میں اسی لڑکی کے خوابوں کو پورا کرنے امریکہ جانا چاہتا ہوں۔'' میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

''احمد بھائی! آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔اسی محبوب کی ایک جھلک کے لئے میں اپنی ساری زندگی لٹا سکتا ہوں۔میں امریکہ جانا چاہتا ہوں تا کہ اسے ساتھ لے کر جا سکوں۔اسے دکھا سکوں کہ یہ زندگی پاکستان سے باہر کتنی خوبصورت ہے۔اس نے زندگی میں بہت درد برداشت کئے ہیں اور میں اب ان

دردوں کی دوا بننا چاہتا ہوں، اس کے لئے جینا چاہتا ہوں۔ یہاں سے صرف ایک کلومیٹر دور نہر ہے اور اس کے دوسرے کنارے پر یونان ہے۔اور میں آج زندگی کے اتنے نزدیک آ کر ہار گیا ہوں۔صرف ایک کلومیٹر کا یہ فاصلہ طے کرنے کے لئے مجھے مزید ایک سال اور لگ جائے گا لیکن پھر بھی میں آؤں گا۔ایک نئے حوصلے نئے جذبے کے ساتھ۔۔۔اور اس نہر کو کراس کر کے یونان جاؤں گا۔'' میری آنکھوں سے لگا تار آنسو نکل رہے تھے اور میں رو رہا تھا۔

ایمان کی یادیں ایک بار پھر تازہ ہو گئیں تھیں اور میرا دل اندر سے کٹنا شروع ہو گیا تھا۔دس سالہ ایمان کی شادی پچاس سالہ بوڑھے اسلم سے ہوئی تھی جو اسے تیس ہزار میں خرید کر لایا تھا۔میں اسی ایمان سے محبت کرتا تھا۔محبت کی آگ سے سلگتی ہوئی یہ کتاب ''دوسرا خدا'' کے نام سے انٹرنیٹ پر موجود ہے۔قارئین کی آسانی کے لئے ''دوسرا خدا'' انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں موجود ہے۔آپ دوسرا خدا پڑھیں گے تو آپ کو اس کتاب کی زیادہ سمجھ آئے گی اور پسند آنے کی صورت میں مجھے فیس بک یا وٹس اپ پر میسیج کر کے اپنی قیمتی رائے سے ضرور آگاہ کریں اور اپنے دوستوں کو بھی اسے پڑھنے کی تاکید کریں۔محبت کی داستان ہے اور اسے محبت سے شیئر کریں۔اگر کوئی پیراگراف پسند نہ آئے تو مجھے ضرور بتا دیں تا کہ میں آئندہ احتیاط کروں اور آپ سب کے معیار کے مطابق لکھنے کی کوشش کروں۔

''راضی بھائی! میں بھی آپ کے ساتھ پاکستان جانا چاہتا ہوں، مجھے آپ کا گاؤں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔'' اب صبح ہو گئی تھی۔میں ساری رات احمد کو اپنی داستان سناتا رہا۔ایمان کے ساتھ گزرے ایک ایک پل کی داستان میں نے اسے سنا دی تھی۔احمد اب میرا گاؤں دیکھنا چاہتا تھا۔

''راضی بھائی! ایک بار آپ کے گاؤں چلتے ہیں اور پھر دوبارہ یونان کی طرف ڈنکی لگائیں گے۔'' اس نے میرا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں احمد! میں گاؤں واپس نہیں جانا چاہتا۔میں ایک بار جب گاؤں سے آ گیا تو اب صرف آگے کو ہی سفر کروں گا۔یا تو راستے میں کہیں مر جاؤں گا یا پھر امریکہ پہنچ جاؤں گا لیکن واپس نہیں جاؤں گا۔میرے گھر میں تین

بھائی اور ہیں۔اک میرے چلے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔آخر لوگ مر بھی تو جاتے ہیں نا؟اور میں بھی ان کے لئے مر گیا ہوں۔ مجھے اپنے باپ سے نفرت ہے اور یہی نفرت مجھے گھر جانے سے روک رہی ہے۔میرے اس باپ نے ایمان کے ساتھ بہت ظلم کیا تھا۔میں محبت کرنے والا انسان ہوں اور مجھے نفرت کرنا ہی نہیں آتا۔ مجھے سب سے محبت ہے لیکن میری ایمان اگر میرے باپ سے نفرت کرتی ہے تو میں بھی کرتا ہوں۔شاید ہم دونوں کبھی بھی اسے معاف نہ کرسکیں۔یقین کرو احمد! میرا باپ ایمان سے محبت کرنے لگتا تھا۔میرا باپ بھی اس سے محبت کرتا تھا لیکن ان کی ایک چھوٹی سی غلطی نے میری اور ایمان دونوں کی زندگی تباہ کر دی۔تم اگر پاکستان جانا چاہتے ہو تو چلے جانا، راجھستان کے اس چھوٹے سے ریگستانی گاؤں میں تمہیں ہر طرف میری اور ایمان کی محبتوں کی کہانیاں ملیں گی لیکن میں اور ایمان ان گلیوں میں نہیں ہوں گے بلکہ صرف میری ماں ان گلیوں میں گھومتی ہوئی نظر آئے گی۔اسے میری خیریت کی خبر دو گے تو اسے کچھ سکون آ جائے گا۔جاؤ! اور ہمارے راجھستان کو کھما گھنی کہو۔ریت کے ان بڑے بڑے ٹیلوں کو کھما گھنی کہو جو صدیوں سے بارش کے ایک ایک قطرے کو ترستے رہتے ہیں۔راجھستان میں اترنے والی اس چاندنی کو کھما گھنی کہنا جو چاندنی راتوں میں پورے راجھستان کو منور کرتی ہے۔'' میں راجھستان کے صحرائی حسن میں کھو گیا تھا اور دن کا اجالا چاروں طرف پھیلنا شروع ہو گیا۔

اتنے میں تین پولیس والے ہمارے سیل کا دروازہ کھول کر اندر آئے اور انہوں نے ہمیں کھانا دینا شروع کر دیا۔یہ ایک پلاسٹک بیگ تھا جس میں مالٹے کے جوس کا ایک چھوٹا سا ڈبہ، بریڈ، انڈا اور چیز کا ایک سلائس تھا۔کافی VIP قسم کا ناشتہ تھا جو ہم قیدیوں کو اس کیمپ میں دیا گیا۔سب لڑکوں کو پکڑے جانے کا دکھ تھا اس لئے کسی کو بھی اس ناشتے سے مزا نہیں آ رہا تھا لیکن پھر بھی کھانا تو تھا ہی۔ پیٹ کی آگ بھی تو بجھانی ہوتی ہے۔ہم خاموشی سے ناشتہ کرنے لگے۔

اس تھانے میں پاکستانی اور افغانی کے علاوہ کچھ عربی لڑکے بھی تھے۔وہ بھی بارڈر کراس کر کے یونان جانا چاہتے تھے۔2006ء سے لے کر 2010ء تک یونان کے حالات ٹھیک تھے۔یہاں پر لوگوں کو کام بھی مل جاتا تھا اور پیسے بھی اچھے مل جاتے تھے۔ان دنوں جو لڑکا بھی یونان پہنچ جاتا تھا اور کام پر لگ جاتا تھا تو اس کی اور پاکستان میں موجود اس کی پوری فیملی کی زندگی بدل جاتی تھی۔یونان میں بہت پیسہ تھا کیونکہ یہ ملک بہت امیر تھا اور بلاشبہ

یونانیوں کے دل بھی بہت بڑے تھے۔ یونان کے لوگ اس وقت بازار میں چلنے والے پاکستانی یا دوسرے ایشین لڑکوں کو روک کر کھانا اور کپڑے دیتے تھے۔

یہ عیسائی لوگ اپنی محبت اور خدا ترسی میں ہم مسلمانوں سے کہیں آگے تھے اور یہی وجہ لڑکوں کو یونان کی طرف کھینچ لاتی تھی۔ اس تھانے میں کئی نسلوں کے لڑکے تھے جو بارڈر کراس کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ ہم نے ناشتہ کر لیا تو پلاسٹک بیگ کو ایک بڑے شاپر میں ڈال دیا۔ ایک آدمی آیا اور وہ یہ شاپر باہر لے گیا۔ دن کے دس بجے کے قریب پولیس والے ایک بار پھر ہماری گنتی کرنے لگے۔ اس بار وہ لڑکوں کو ان کے ملکوں کے حساب سے گن رہے تھے اور ساتھ ساتھ ایک رجسٹر میں ان کا نام بھی لکھ رہے تھے۔ یہ سلسلہ دوپہر کو دو بجے تک جاری رہا اور آخر کار ہم لڑکوں کی گنتی مکمل ہو گئی اور ہمیں دوپہر کا کھانا دینے لگے۔

ترکی میں ہر جگہ تین وقت کا کھانا دیا جاتا ہے۔ آپ ترکی کے کسی بھی شہر کے کسی بھی تھانے میں ہوں، تھانے والے آپ کو تین وقت کا کھانا دیں گے اور اس کھانے کے پیسے یورپی یونین یا ریڈ کراس سے لیتے ہیں۔ ترکی والے ہر لڑکے کو پکڑنے اور ڈی پورٹ کرنے کے پیسے لیتے تھے اس لئے ترکی بہت سختی کرتا تھا۔ اگر آپ ایران میں کہیں پکڑے جاتے ہیں تو ایران والے بھی آپ کو تین وقت کا کھانا دیتے ہیں۔ یہ ملک صرف انسانی ہمدردی کے تحت ہمیں کھانا دیتا ہے اور کسی قسم کی امداد نہیں لیتا۔ ویسے بھی ایران پر معاشی پابندیاں تھیں اور یہ ملک کسی بھی قسم کا بیرونی دباؤ قبول نہیں کرتا تھا۔ اپنی مرضی کا خود مختار ملک تھا اور اپنے فیصلے خود کرتا تھا۔ کچھ لوگوں کو شاید یہ اچھا لگے لیکن یہ چیز مجھے اچھی نہیں لگتی ہے۔ ہمیں باقی ملکوں کے ساتھ مل کر چلنا چاہیے۔ ملک کی خود مختاری بہت بڑی چیز ہوتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ آپ اپنے ملک میں جو مرضی کریں۔

کچھ بین الاقوامی قوانین ہوتے ہیں جن کا ماننا ہر ملک پر لازمی ہوتا ہے۔ اس دنیا میں رہنا ہے اور اس دنیا کو خوبصورت بنانا ہے تو اس کے لئے سب ملکوں کو ایک دوسرے سے مل جل کر رہنا چاہیے اور ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرنا چاہیے۔ یہ دنیا کوئی جنگل نہیں ہے جہاں ہر ملک اپنی مرضی کرتا پھرے۔ اگر ہر ملک اپنی مرضی کرنا شروع کر دے تو اس دنیا میں انسانوں کے لئے جینا مشکل ہو جائے گا۔

کھانا کھانے کے بعد دو بڑی گاڑیاں آ گئی۔ یہ فوجی گاڑیاں تھیں۔ جس کی فرنٹ سیٹ پر ڈرائیور اور ہیلپر بیٹھے ہوئے تھے اور پیچھے سے ٹرالر ٹائپ تھی۔ یہ گاڑیاں پیچھے سے اوپن تھیں۔ ان پر کوئی ترپال یا کپڑا وغیرہ نہیں تھا۔ شاید انہوں نے کپڑا نکال دیا تھا۔ پولیس والے اندر آئے اور لڑکوں کو ایک ایک کر کے ان گاڑیوں میں بٹھانے لگے۔

یہاں سے پولیس والے ہمیں ایڈرن کے بڑے کیمپس میں بھیج رہے تھے۔ جہاں سے پھر آگے استنبول میں سکرینگ کے لئے لے جایا جاتا۔ استنبول میں ہم سب لڑکوں کے ملکوں کا ایک ایک ٹرانسلیٹر بھی موجود ہوتا ہے جو ہم سے ہمارا آبائی شہر اور پتہ وغیرہ پوچھ کر تصدیق کرتا ہے کہ ہم واقعی صحیح ملک کا بتا رہے ہیں۔ پھر مطمئن ہونے کے بعد وہ ہمارا اندراج کر دیتا ہے اور ہمیں ڈی پورٹ کرنے کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔

پاکستانی لڑکوں کی لسٹ تیار تھی اور وہ لسٹ امیگریشن اینڈ بارڈر سیفٹی فورسز کے ہیڈ آفس جاتی تھی۔ وہاں سے جتنی جہاز کی ٹکٹیں میسر ہوتی وہ اتنے لڑکوں کو جہاز کے ذریعے کراچی یا لاہور ڈی پورٹ کر دیتے اور باقی لڑکوں کو بذریعہ بس ایران کے بارڈر تک لایا جاتا اور یہاں سے ایرانی حکام کے حوالے کر دیا جاتا جو ہمیں پاکستان بس کے ذریعے ہی پاکستان ڈی پورٹ کر دیتے۔

میں نے ایران ہی لکھوایا تھا۔ اس کیمپ میں صرف میں اور احمد ہی ایرانی تھے۔ ہمیں استنبول میں فارسی ٹرانسلیٹر ملنا تھا۔ مجھے فارسی نہیں آتی تھی لیکن احمد نے یقین دلایا کہ وہ کوشش ضرور کرے گا۔ ہم دونوں نے ایک ہی ٹرانسلیٹر کے پاس جانا تھا اور احمد اس ٹرانسلیٹر کو مطمئن کرنے کی کوشش کرنا چاہتا تھا۔

''راضی بھائی! میں اس ٹرانسلیٹر کے پاؤں پکڑ لوں گا۔ چاہیے جیسا بھی ہو گا، ہو گا تو انسان ہی نا؟ میرے ملک کا ہو گا اور میں آپ کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ آپ کے لئے آخری حد تک بھی جانے کو تیار ہوں۔ ادھر استنبول میں مر جاؤں گا لیکن آپ کے بغیر ایران نہیں جاؤں گا۔ دنیا کا کوئی قانون ایک بھائی کو بھائی سے الگ نہیں کر سکتا۔ میں دیکھوں گا کہ کونسا ٹرانسلیٹر آپ کو مجھ سے الگ کر کے ایران بھیجے گا۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

میری اور احمد کی باری آ گئی اور ہم دونوں اس فوجی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئے۔ ایک پولیس والے نے لسٹ

پکڑی ہوئی تھی۔ وہ لسٹ میں دیکھ کر نام پکارتا اور اس لڑکے کو گاڑی میں بٹھا دیتا۔ ہم ایک ایک کر کے تیس کے قریب لڑکے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں اور احمد ایک طرف گاڑی کے پھٹے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے تھے۔

''احمد! میں نے سات مہینے قربان کئے ہیں اس مقام تک آنے میں۔ ان سات مہینوں میں ہر طرح کے حالات کا سامنا کیا ہے۔ کھانے کے ایک ایک لقمے کے لئے ترسا ہوں، کبھی سردی سے مرا ہوں اور کبھی گرمی نے جان لی ہے۔ اب اس مقام پر پہنچا ہوں تو اتنی جلدی ہار نہیں مانوں گا۔'' میں نے احمد کا ہاتھ پکڑ لیا۔

گاڑی ہمیں لے کر آہستہ آہستہ کیمپ سے باہر نکلنے لگی۔ باہر آ کر گاڑی رک گئی۔ دو پولیس والے گاڑی کی پچھلی سائیڈ پر بیٹھ گئے۔ اس کے علاوہ ایک اور پولیس کی چھوٹی گاڑی سیکورٹی کے لئے ہمارے ساتھ چل پڑی۔ تینوں گاڑیاں ایلسلی کے کیمپ سے باہر نکلیں اور آہستہ آہستہ چھوٹے روڈ سے بڑے روڈ کی طرف جانے لگیں۔ دونوں لڑکوں والی فوجی گاڑیاں آگے تھیں اور پیچھے پیچھے پولیس کی سیکورٹی کی گاڑی آ رہی تھی۔ پولیس والے ہمیں ایلسلی سے تیس کلومیٹر دور ایڈرن شہر لے جا رہے تھے۔ وہ ہمیں ایڈرن کے بڑے کیمپ میں چھوڑ کر آ جاتے۔

گاڑیاں اب مین روڈ پر آ گئیں تھیں اور تیز رفتاری سے چل رہی تھیں۔ پولیس والے اب پرسکون ہو گئے تھے۔ میں نے ایک نظر باہر کی طرف دوڑائی، ہر طرف مکئی کے کھیت لہلہا رہے تھے اور بالکل روڈ کے برابر آ گئے تھے۔

''راضی! چانس نہیں لو گے کیا؟'' اچانک میرے ذہن کے کسی گوشے میں سرگوشی ہوئی اور میں حیرانگی سے دائیں بائیں دیکھنے لگے۔

سب لڑکے خاموشی سے بیٹھے ہوئے تھے اور گاڑی پوری رفتار سے روڈ پر دوڑی چلی جا رہی تھی۔ پولیس والے بڑے اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے۔ چلتی گاڑی سے چھلانگ لگانا بہت مشکل تھا۔ ہاتھ پاؤں یا گردن کی ہڈی بھی ٹوٹ سکتی تھی۔ یہ کھلی کھلی خودکشی تھی لیکن گاڑی کی پچھلی طرف ترپال نہ ہونے کی وجہ سے چھلانگ لگ سکتی تھی۔ میں گاڑی کی دائیں طرف بیٹھا ہوا تھا اور یہ سائیڈ روڈ کے کنارے کی طرف تھی۔

''احمد! تیار رہونا؟'' میں نے احمد کا ہاتھ پکڑ کر دبایا اور سرگوشی سے اس کو اپنا ارادہ بتایا تو وہ چونک پڑا۔

''راضی بھائی! کیا کرنے والے ہو؟'' اس نے حیرانگی سے پوچھا۔

''میں چھلانگ لگانے لگا ہوں۔آخری چانس ہے یا تو کامیاب ہو جاؤں گا یا پھر ٹانگ تڑوالوں گا۔لیکن چانس ضرور لوں گا۔'' میں نے پولیس والوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔وہ دونوں اپنی باتوں میں مصروف تھے۔

''بھائی! میں بھی آپ کے ساتھ ہی چھلانگ لگاؤں گا۔'' احمد نے جلدی سے کہا۔وہ پر جوش ہو گیا۔

''ایک بار سوچ لو! اتنی سپیڈ سے گاڑی چل رہی ہے اگر کچھ ہو گیا تو تم ابھی نوجوان ہو، ساری زندگی پڑی ہوئی ہے۔ چانس مت لو، دوبارہ بھی آسکتے ہو یہاں تک۔'' میں نے احمد کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں بھائی! چانس لوں گا تو آپ کے ساتھ ہی لوں گا۔میرا ہاتھ پکڑ کر چھلانگ لگانا، مجھے یقین ہے آپ کے ساتھ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔'' احمد نے پر عزم لہجے میں کہا تو میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

گاڑی پوری رفتار سے ایڈرن شہر کی طرف جا رہی تھی۔ یہ سفر صرف آدھے گھنٹے کا تھا اور مجھے اس آدھے گھنٹے میں ہی کچھ کرنا تھا۔ پیچھے پولیس کی سیکورٹی کی گاڑی آ رہی تھی اور وہ فائر بھی مار سکتے تھے۔ پولیس کی تحویل سے فرار ہونے والے کو وہ فائر مار دیتے تھے۔اس کے علاوہ اتنی رفتار سے اگر نیچے گرتے تو کوئی ہڈی وغیرہ بھی ٹوٹ سکتی تھی اور ساری زندگی کی معذوری بن جاتی۔ پھر بھی میں چانس لینا چاہتا تھا، میں چھلانگ لگانا چاہتا تھا۔ابھی بارڈر کے اتنے نزدیک آ کر میں ایسے ہار نہیں ماننا چاہتا تھا۔میں آگے کی طرف دیکھنے لگا۔

مجھے چھلانگ لگانے کے لئے کسی اچھی جگہ کی تلاش تھی جہاں سے میں روپوش بھی ہو سکوں۔جلد ہی مجھے جگہ مل گئی۔ یہ گھنی جھاڑیوں کا سلسلہ تھا جو روڈ کے آخری کنارے تک آیا ہوا تھا۔جھاڑیوں سے آگے مکئی کے کھیت تھے جو آگے جنگل تک چلے گئے تھے۔اگر ہم صحیح سلامت گر جاتے تو امید تھی کہ مکئی کے کھیتوں میں روپوش ہو جاتے۔اور اگر ایک بار جنگل تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے تو پھر آسانی سے جنگل میں غائب ہو سکتے تھے۔

جھاڑیاں نزدیک آ رہی تھیں اور میں نے احمد کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے اشارہ کر دیا۔وہ سمجھ گیا اور چھلانگ لگانے کے لئے تیار ہو گیا۔گاڑی جھاڑیوں کے نزدیک پہنچی تو اچانک میں اٹھ کر

کھڑا ہو گیا۔ ہم دونوں نے سڑک کے کنارے کی طرف منہ کیا اور چلتی گاڑی سے باہر چھلانگ لگا دی۔ یہ سارا کام ایک لمحے میں ہو گیا تھا۔ پولیس والوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا اور ہم دونوں اڑتے ہوئے جھاڑیوں میں جا گرے اور لڑھکتے ہوئے دوسری طرف چلے گئے۔ گاڑی کی رفتار کا جھٹکا لگا تھا اور اسی جھٹکے سے احمد کا ہاتھ میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور وقتی شاک کی وجہ سے زمین گھومتی رہی لیکن اگلے ہی پل میں ٹھیک ہو گیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گاڑیوں کے بریکوں کی چر چراہٹ کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ روڈ پر ساری گاڑیاں رک گئی تھیں۔

میں نے جلدی سے احمد کو سنبھالا اور اسے لے کر مکئی کے کھیتوں کی طرف بھاگنے لگا۔ جب تک پولیس والے گاڑی سے نیچے اترے اور انہیں صورت حال کا پتہ چلا تب تک میں احمد کو لے کر مکئی کے کھیتوں میں داخل ہو گیا تھا۔ مجھے اپنے پیچھے گولیوں کی آوازیں اور شور سنائی دے رہا تھا۔ پولیس والے فائرنگ بھی کر رہے تھے اور باقی لڑکوں کو کنٹرول بھی کر رہے تھے۔ کچھ پولیس والے ہمارے پیچھے کھیتوں میں داخل ہوئے لیکن تب تک میں دوسرے کھیت میں داخل ہو گیا تھا۔ یہ زندگی اور موت کا کھیل تھا اور میں پکڑا نہیں جانا چاہتا تھا۔

میں سرپٹ بھاگ رہا تھا اور جلد سے جلد اس جگہ سے دور ہو جانا چاہتا تھا۔ احمد برابر میرے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ ہمیں ہر حالت میں جنگل تک پہنچنا تھا اور ہم ایک کھیت سے دوسرے کھیت میں بھاگتے رہے۔ جنگل نزدیک آنا شروع ہو گیا۔ پولیس کی فائرنگ کی آوازیں بڑی دیر تک آتی رہیں اور اس کے بعد آہستہ آہستہ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر میں ہی جنگل آ گیا اور ہم دونوں دوڑتے ہوئے جنگل میں داخل ہو گئے۔ ہم پولیس والوں کی پہنچ سے دور ہو گئے تھے۔

یہ جنگل بہت گھنا تھا اور نہر کے پانی کی وجہ سے دلدلی بھی ہو گیا تھا۔ یہ نہر قدرتی طور پر وجود میں آئی تھی۔ اسے آپ چھوٹا سا دریا بھی کہہ سکتے ہیں جو کہیں تو بہت تنگ سا تھا اور کہیں بہت کھلا۔ پانی کہیں سے باہر نکل آتا اور جنگل میں چھوٹے چھوٹے تالاب اور دلدل بنا دیتا تھا۔ یہ جگہ بارڈر سے دوسری طرف تھی اس لئے یہاں پولیس کا زیادہ خطرہ نہیں تھا۔ ہم دونوں جنگل میں مزید اندر تک گئے اور ایک محفوظ جگہ دیکھ کر چھپ گئے۔ اب رات تک ہم نے یہیں رہنا تھا۔ پولیس والے کچھ دیر ڈھونڈتے اور اس کے بعد واپس چلے جاتے۔ یہ نارمل بات تھی، وہ ہماری جگہ پر دو اور لڑکوں کو بھیج دیتے۔ لسٹ کے ناموں کی کوئی ویلیو نہیں ہوتی کیونکہ لڑکے غلط نام بتاتے رہتے ہیں اور جو بعد میں

صحیح ہوتے رہتے ہیں۔ یہ بارڈر ایریا تھا اور یہاں سب کچھ ہوتا تھا۔ ہر روز لڑکے بارڈر کراس کرتے تھے، پکڑے جاتے تھے اور بھاگ جاتے تھے۔

ترکی اور یونان کے درمیان ایک سو بیاسی کلومیٹر بارڈر ہے۔ یہ خشکی کا بارڈر ہے، اس کے علاوہ آدھے سے زیادہ یونان کا بارڈر سمندر پر ہے۔ یونان کو چاروں طرف سے غیر قانونی بارڈر کراس کرنے والوں سے نپٹنا پڑتا ہے۔ تارکین وطن یونان کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف البانیہ لگتا ہے۔ یہاں سے بھی البانوی بارڈر کراس کر کے یونان میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ دو اطراف ہیں جدھر سے یونان میں داخل ہوا جاتا ہے۔ اس کے بعد مقدونیا کا بارڈر لگتا ہے۔ یہاں سے لوگ دیگر یورپی ممالک کی طرف جاتے ہیں، جیسے احمد نے جانا تھا۔ یہ یونان میں داخل ہوتا اور اس کے بعد مقدونیا اور سربیا سے ہوتا ہوا ہنگری چلا جاتا۔

ہنگری یورپی یونین کا ملک ہے اور یہاں سے شنگین زون شروع ہوتا۔ شیگن ممالک میں ایک دوسرے کے ملک میں جانے کے لئے کوئی ویزہ یا پاسپورٹ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ اگر ایک بار ہنگری میں داخل ہو گئے تو پھر بآسانی کسی بھی بس، ٹرین یا گاڑی کے ذریعے جرمنی جا سکتے ہو۔ یہاں پر بارڈر کھلے ہوئے ہیں اور کوئی سرحدی چیک پوسٹ نہیں ہوتی۔ یونان لڑکوں کو مقدونیا کی طرف جانے سے روکتا ہے۔ یونان اور مقدونیا کا بارڈر سیل ہے اور یہاں پر بھی بہت سیکورٹی ہے۔ اس کے علاوہ یونان کا مغربی علاقہ جس میں پارا، کاشغر اور کورفو یا کیرکیرہ کا جذیرہ ہے۔ یہ سمندر اٹلی کو لگتا ہے۔ کیرکیرہ سے صرف ایک سو بیس کلومیٹر دور اٹلی ہے۔ سپیڈ بوٹ یہ فاصلہ دو گھنٹے میں طے کر لیتی ہے۔

اٹلی جانے والے لڑکے کشتیوں کے ذریعے اس ایک سو بیس کلومیٹر کے سمندر کو پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پورا یونان بارڈر کراس کرنے والوں کو پکڑنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اتنا بڑا بارڈر کنٹرول نہیں کیا جا سکتا۔ ایک طرف سے بارڈر سیل ہوتا ہے تو لڑکے دوسری طرف سے کراس کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ترکی بھی زیادہ تر دوسرے بارڈروں پر مصروف رہتا ہے جو ایران، عراق اور شام کو لگتا ہے، اس لئے یہاں بہت زیادہ سختی ہونے کے باوجود بھی سختی نہیں ہوتی تھی۔

میں احمد کو لے کر جنگل میں چھپا ہوا تھا اور ہمیں رات تک یہیں چھپے رہنا تھا۔ رات کو ہم بارڈر کی طرف نکلتے اور نہر کراس کرنے کی کوشش کرتے۔ اگر ایک بار نہر کراس کر کے یونان پہنچ جاتے تو پھر پاکستان واپسی کا راستہ ختم ہو جاتا۔

''راضی بھائی! آپ بہت بہادر ہو، آپ کے ساتھ رہتے ہوئے ابھی مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں جرمنی چلا جاؤں گا۔'' اس نے میرے کان میں سرگوشی کی تو میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا شارہ کیا۔ ابھی بارڈر سے صرف چند کلومیٹر پیچھے تھے اور میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ احمد نے میرا اشارہ سمجھ لیا اور خاموشی سے جھاڑیوں کے اندر لیٹ گیا۔ میں بھی احمد کے ساتھ ہی لیٹ گیا۔

یہ بہت گھنی جھاڑیاں تھیں اور باہر سے دیکھ لئے جانے کا امکان زیرو کے برابر تھا۔ رات ہونے تک ہم یہیں خاموشی سے لیٹے رہے۔ اس طرف کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ شاید پولیس والوں نے ہمارا پیچھا کرنا مناسب ہی نہیں سمجھا تھا۔ یہاں دن کی روشنی چھ بجے کے قریب نکلنا شروع ہوتی تھی اور میرا ارادہ دو بجے یہاں سے نکلنے کا تھا۔ تین بجے تک ہم بارڈر پر پہنچ جاتے اور تیرتے ہوئے نہر کراس کر جاتے۔ نہر کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر ہم چار پانچ کلومیٹر آگے جا کر کھیتوں یا جنگل میں کہیں چھپ جاتے۔ دن کو ادھر ہی چھپے رہتے اور رات ہونے پر آگے کموتنی کی طرف جانے کی کوشش کرتے اور پھر وہاں سے ایکسانتھی، یہ تقریباً ایک ہفتے کا پیدل سفر تھا اور اس کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو جاتا۔

رات آہستہ آہستہ گہری ہونا شروع ہو گئی اور دو بجے کے قریب میں احمد کو لے کر جھاڑیوں سے باہر آ گیا۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ بارڈر کی طرف بڑھنے لگے۔ تقریباً ایک گھنٹے تک مسلسل چلنے کے بعد ہم نہر کے بالکل قریب آ گئے۔ مجھے نہر کے پانی چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں احمد کو لے کر ایک جھاڑی میں گھس گیا اور خاموشی سے کان لگا کر آوازیں سننے لگا۔ مجھے نہر کے پانی کے علاوہ کوئی آواز نہیں آ رہی تھی شاید اس طرف پولیس نہیں تھی۔ میں نے احتیاط سے باہر نکلا اور کچھ دیر بعد احمد کو بھی باہر آنے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں احتیاط سے نہر کے کنارے کی طرف بڑھنے لگے۔

صرف پانچ منٹ میں ہی ہم کنارے پر پہنچ گئے تھے۔ہم نے درختوں کی قطار کو کراس کیا اور کنارے پر کھڑے ہو گئے۔ چاند کی سفید روشنی میں نہر کا پانی چمک رہا تھا۔ یہاں سے نہر تقریباً پچاس فٹ چوڑی تھی اور دوسرے کنارے پر جنگل پھیلا ہوا تھا۔میں نے نہر کے دوسرے کنارے پر نظر ڈالی وہ یونان کا ایریا تھا۔اس جنت کا فاصلہ صرف پچاس فٹ تھا۔میں نے احمد کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر نہر میں اترنے لگا۔

دفعتاً ایک سایہ سا دکھائی دیا اور وہ سایہ ہم پر جھپٹ پڑا۔وہ پولیس والا تھا اور اس کے پیچھے باقی پولیس والے بھی تھے۔میں نے ایک زوردار لات اس پولیس والے کو ماری اور احمد سمیت نہر میں چھلانگ لگا دی۔ایک پولیس والے کے ہاتھ میں احمد کی شرٹ آ گئی اور احمد نہر میں چھلانگ نہ لگا سکا۔وہ پکڑا گیا تھا جبکہ میں نہر کے درمیان تک پہنچ گیا تھا۔میں نے دائیں بائیں احمد کو تلاش کیا۔میں نے اس کو اپنے ساتھ لے کر چھلانگ لگائی تھی لیکن جھٹکے کی وجہ سے میرا ہاتھ چھوٹ گیا تھا۔جب میں نے احمد کو اپنے پاس نہ پایا تو میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا احمد کنارے پر پولیس والوں کے پاس زمین پر پڑا ہوا تھا۔میں تیرتا ہوا نہر کے دوسرے کنارے پر آ گیا۔پولیس والوں نے میرے پیچھے چھلانگ نہیں لگائی تھی۔

چاندرات کی چاندنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور مجھے نہر کا دوسرا کنارہ صاف نظر آ رہا تھا۔انہوں نے احمد کو ہتھکڑی لگا کر کھڑا کر لیا اور اب مجھے واپس آنے کا اشارہ کر رہے تھے لیکن میں ترکی کراس کر کے یونان پہنچ چکا تھا۔ترکی پولیس والے نہر کے اس کنارے پر نہیں آ سکتے تھے کیونکہ ان کا ملک اس کنارے پر ختم ہو جاتا تھا۔میں نے احمد کی طرف دیکھا وہ رو رہا تھا، چلّا رہا تھا اور ان پولیس والوں کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن بے بس تھا۔جرمنی جانے کا خواب ٹوٹ چکا تھا۔یونان کے اس بارڈر نے آج دو بھائیوں کو جدا کر دیا تھا۔مجھ سے احمد کی بے بسی دیکھی نہ گئی اور میں دوبارہ نہر میں اتر گیا۔میں واپس ترکی جانا چاہتا تھا۔زندگی میں پہلی بار آج ایمان کی محبت کے مقابلے میں اس ایرانی لڑکے کی محبت مقابلے پر آ گئی تھی۔

''راضی بھائی!میں آپ کے لئے جان دے دوں گا لیکن اپنے ساتھ ایران لے کر جاؤں گا۔ہم دونوں بھائی پھر دوبارہ یونان کی طرف ڈنکی لگائیں۔یہ ملک اور اس کے ٹرانسلیٹر ہم دو بھائیوں کو الگ نہیں کر سکتے۔'' مجھے احمد کی بات یاد آ گئی۔میں دوبارہ نہر میں اتر گیا تھا اور آہستہ آہستہ تیرتا ہوا واپس احمد کے پاس آنے لگا۔احمد نے مجھے واپس

آتے دیکھا تو وہ چیخنے لگا۔

''نہیں بھائی! واپس مت آنا۔ چلے جاؤ! تم یونان پہنچ گئے، اب واپس مت آؤ۔'' میں آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ پولیس کنارے پر میرا انتظار کرنے لگی اور احمد زور زور سے چلّا رہا تھا۔

''پلیز بھائی! واپس چلے جاؤ۔ تمہیں میری قسم! ادھر مت آؤ، یہ دوزخ ہے۔ میں ساری زندگی اپنے آپ کو معاف نہیں کروں گا اگر آج تم میری وجہ سے واپس آ گئے۔ تمہیں میری قسم! واپس چلے جاؤ۔ تمہیں ایمان کی قسم! واپس چلے جاؤ اور ایمان کا خواب پورا کرو۔ زندگی اسی طرف ہے، یونان کی طرف لوٹ جاؤ بھائی!'' احمد حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔

میں نہر کے درمیان میں آ کر رک گیا۔ پانی بہت تیز تھا لیکن میں اپنے پیروں پر مضبوطی سے کھڑا تھا۔ احمد کا گلا چیختے چیختے خشک ہو گیا تھا اور وہ بے بسی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا پورا وجود واپس جانے کی التجا کر رہا تھا اور میں نہر کے درمیان کھڑا سوچ رہا تھا۔ زندگی آج دونوں طرف تھی، نہر کے اس کنارے پر بھی اور نہر کے دوسرے کنارے پر بھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر یونان کے کنارے کی طرف دیکھا۔

''راضی! جنت میں حوریں بہت ہوتی ہیں۔'' مجھے یونان کی طرف ایمان کھڑی نظر آ گئی۔

''راضی! جنت میں حوریں بہت ہوتی ہیں، مجھے بھی بھول جاؤ گے۔'' یہ بات اس نے کراچی میں کہی تھی اور آج مجھے نہر کے بیچ میں کھڑی یاد آ رہی تھی۔

''راضی! ابھی تو یونان کی مٹی کو ہاتھ ہی لگایا ہے اور محبت کا ایک شریک آ گیا۔ تم یونان جاؤ گے، اٹلی اور جرمنی پہنچو گے اور پھر امریکہ جاؤ گے۔ ہر ملک میں ایک کہانی بناؤ گے تو ایمان کی کہانی ماند پڑ جائے گی۔ یہی تو محبت کا امتحان ہوتا ہے۔'' میں نے آہستہ سے سر ہلایا اور یونانی کنارے کی طرف واپس جانے لگا۔ پولیس والوں نے مجھے واپس جاتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے پانی کے اندر فائرنگ کرنی شروع کر دی۔

گولیاں میرے دائیں بائیں لگ رہی تھیں لیکن میں آہستہ آہستہ دوسرے کنارے کی طرف بڑھتا چلا جا رہا

تھا۔ وہ لوگ ڈائریکٹ فائر نہیں مار رہے تھے، آخر وہ بھی آخر انسان تھے۔ وہ صرف ڈرا رہے تھے تا کہ میں واپس آ جاؤں۔ میں کنارے کے نزدیک پہنچا اور کنارے پر موجود گھاس کو پکڑ کر باہر نکل گیا۔ میں نے پلٹ کر دوسرے کنارے کی طرف دیکھا۔

''شکریہ بھائی! آپ کے ساتھ رہ کر مزہ آیا۔ جرمنی کو میرا اسلام کہنا اور ایک بار اپنے بھائی کے لئے دیوارِ برلن کے اوپر کھڑے ہو کر مجھے ضرور پکارنا۔'' میں خاموشی سے احمد کی طرف دیکھ رہا تھا۔

پولیس والوں نے فائرنگ بند کر دی تھی۔ احمد کے آنسو ختم ہو گئے تھے اور وہ رو رہا تھا۔ پچاس فٹ کی یہ نہر آج دونوں کو الگ کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

''احمد بھائی! میں نے زندگی میں ایمان کے سوا کچھ نہیں چاہا ہے۔ زندگی ایمان کے بغیر کوئی معنی ہی نہیں رکھتی لیکن آج تیری محبت مجھے تیری طرف لے جانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ترکی کا یہ پورا سفر جو میں نے تیرے ساتھ گزارا ہے وہ ہمیشہ مجھے یاد رہے گا۔ میں یونان اور جرمنی میں تمہارا انتظار کروں گا۔'' میری آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

''احمد! میرے بھائی! ایک دن ہم دونوں بھائی برلن کی دیوار پر کھڑے ہوں گے۔ خدا حافظ بھائی!'' میں نے اپنی آنکھوں میں موجزن سمندر کو کنٹرول کیا اور دوسری طرف مڑ گیا۔

''آئی لو یو بھائی! یہ احمد تمہارا بھائی ہے، پورا ایران تمہارا ہے۔'' مجھے پیچھے سے احمد کی آواز سنائی دی لیکن میں چلتا رہا۔

میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ ایمان کی محبت مجھے آگے بڑھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ یونان بارڈر سے دور ہو رہا تھا۔ احمد کی محبت نے مجھے بہت کچھ سکھایا تھا۔ اس لڑکے نے مجھے زندگی میں ہمیشہ آگے بڑھنا سکھایا تھا۔ مجھے احمد سے محبت تھی اور اس لڑکے کی محبت نے مجھے پورے ایران سے محبت کرنا سکھا دیا تھا۔ میں آج بھی ایران کو اپنا دوسرا ملک مانتا ہوں۔ یہ میرے چھوٹے بھائی احمد کا ملک ہے اور میرا بھی دوسرا ملک ہے۔

میں یونان کے اندر کی طرف مسلسل بارڈر سے دور ہونے لگا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور میں بار بار اپنے ہاتھوں سے آنسو پونچھ رہا تھا۔ احمد کی یادیں، اس کے ساتھ گزرے ہوئے پل یاد آرہے تھے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں مجھے اندر سے کاٹ رہی تھیں۔ میں یونان پہنچ گیا تھا لیکن اس یونان کی قیمت میں نے احمد سے علیحدگی کی صورت میں ادا کی تھی۔ میں یہاں سے ہوتا ہوا کوموتینی اور ایکسانتھی پہنچ جاتا اور وہاں سے ایتھنز مجھے یونان میں رہنے کا مستقل سٹے مل جاتا۔ میں یورپی یونین میں داخل ہو گیا تھا۔ ایمان کی محبت جیت گئی تھی اور احمد کی یادیں میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔

Continue...